اجلی پرچھائیاں

اقبال متین

KAISER

(جملہ حقوق بحق منیر اقبال متین محفوظ)

پہلی بار ـــــــــــ ۱۰۰۰

اگست ۱۹۶۰ء

قیمت :- چار روپے پچاس نئے پیسے

ناشر:- مکتبۂ "صبا" حیدرآباد (آندھراپردیش)

اپنے بارہ سالہ بچے فرید

کے نام

جس کی اچانک موت نے

میرے دست و بازو کی ساری

قوت سلب کر لی

کتابت .... محمد مظہر

تزئینِ عنوانات .... قیصر سرمست

حُسن کار .... سعادت

طباعت ..... نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

گرد پوش .... وینکٹیشور پریس

رائیں .... انتخاب پریس

فوٹو .... ریگل

بلاک .... ڈان

محمد مظہر

محمد مظہر کی پُر خلوص شخصیت، اُس کی شرافتِ نفس اس کی متحمل ہی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ فنِ کتابت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ کاتبوں کے ساتھ جو روایات منسوب ہیں ان سے وہ اس طرح شرم محسوس کرتا ہے جیسے یہ روایات فنِ کتابت ہی سے منسوب ہو گئی ہوں، اور اسی بات کے ردِّ عمل کے طور پر وہ بڑے فخر سے اپنے نام کے ساتھ مظہر کاتب لکھتا ہے تاکہ آپ اس کی اپنی شخصیت کے تعلق ہی سے نہیں بلکہ اس کے ہم پیشہ ہر فرد سے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

محمد مظہر نے "اُجلی پرچھائیاں" کے بہانے مجھے اپنی کتنی ہی محبتیں دیں! اتنے چاؤ سے اس نے میری کتاب لکھی جیسے وہ خود اس کی اپنی تخلیق ہو۔ یہ بھی ہوا کہ ایک بار لکھتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ——— سوچتا ہوں کہ اس کے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کی اجرت ادا کر سکوں بھی تو اس قرض کو کیسے چکا سکوں گا جو بے اندازہ خلوص کی صورت میں اس نے مجھے دیا ہے۔

مظہر نے ۱۹۵۷ء میں "آندھرا پردیش خوش نویس یونین" کی بنا ڈالی۔ وہ اس انجمن کا روحِ رواں ہے۔ پچھلے سال وہی سکریٹری تھا، اور اس سال اس کے ساتھیوں نے جن میں اس کے ہم پیشہ بزرگ بھی شامل ہیں اسی نوجوان کو اپنا پریسیڈنٹ چنا ہے۔

قیصر سرمست

بچپن ہی سے اسے آرٹ سے دلچسپی رہی لیکن ۱۳ سال کی عمر تک اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جو اس کے اس دبے ہوئے شوق و جذبے کو جگا سکے۔ جب یہ تیرا سال کا ہوا اس وقت ایک فلمی بینر بنتا ہوا دیکھ کر اچانک اسے اپنے دبے ہوئے شوق کا احساس ہوا۔ اس کے بعد سے یہ پینٹنگ کر رہا ہے باضابطہ اس نے آرٹ کی تعلیم نہیں پائی۔ بس اپنے شوق کو پورا کرتا رہا آرٹ کے دو امتحان بھی پاس کیے۔ حال ہی میں کل ہند صنعتی نمائش میں اس کو ایک STILL LIFE پر سکنڈ پرائز کا مستحق قرار دیا گیا۔ اس کا پسندیدہ مضمون STILL LIFE ہے۔ وہ پاکستانی فنکاروں میں زین العابدین سے کافی متاثر ہے اور ہندوستانی فنکاروں میں حسین اس کا پسندیدہ آرٹسٹ ہے۔ خود کو آرٹسٹ کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ اس کا ابتدائی فن "عنوانات" کے روپ میں آپ کے سامنے ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی حیثیت منوالے گا۔ فی الوقت اپنے گھر ہی کو اپنی پینٹنگ سے آراستہ کر کے خوش ہوتا ہے۔ میں اس وقت کے انتظار میں ہوں جب کہ ہر گھر اس کا اپنا گھر ہوگا اور اس طرح اس کی پینٹنگس ہر گھر کی زینت بنیں گی۔

۵



اقبال متین

چہرہ نما

میں ذاتی طور پر کسی تخلیقی فن پارے پر خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، ناول ہو یا ڈراما کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں مصنف خود لکھے تو لکھے بلکہ بعض صورتوں میں تو مصنف کا دیباچہ "ضروری" ہو جاتا ہے اور ایسی بھی دو چار مثالیں موجود ہیں کہ بجائے خود دیباچہ اتنا وقیع ہو گیا ہے کہ اصل تصنیف سے ہٹ کر ادب میں اس کی بھی ایک علاحدہ حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے۔

گو کسی اور سے دیباچہ یا مقدمہ لکھوانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں پڑھنے والوں کی رائے کو ہموار کیا جائے، گویا مقدمہ نگار مصنف اور قاری کے درمیان ایک شخص رابطہ کا فرض انجام دیتا ہے اور عام طور پر دیباچہ یا مقدمہ کسی ادیب کی پہلی پیش کش پر محض اس وجہ سے بھی لازمی سمجھا جاتا ہے کہ ادبی حلقوں میں اس ادیب کا بھرپور تعارف ہو جائے اور اس کی پہلی پیش کش کی پذیرائی میں آسانی پیدا ہو لیکن مقدمہ نگار جو

فرض اپنے سر لیتا ہے وہ بھی کچھ کم اہم اور نازک نہیں۔ اسے بہت ذمہ داری کے ساتھ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں اظہار خیال کرنا چاہیے اور حتی المقدور ادبی دیانت داری کے رشتے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے لیکن ادھر یہ رسم چل پڑی ہے کہ اس سیدھے سادے مقصد کے حصول کے لیے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو بڑے نام رکھتے ہیں لہذا ہوتا یہ ہے کہ وہ یا تو مصنف کی حوصلہ افزائی کی خاطر یا پھر "شرافت" اور مروت میں ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق دور دور تک نہ تصنیف سے ہوتا ہے اور نہ مصنف سے چنانچہ اکثر کتابیں پڑھنے کے بعد مقدمہ نگار کی حیثیت گواہ کی اور مصنف کی حیثیت مدعی کی نظر آتی ہے۔ لیکن اس مقدمے کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس سے نہ مصنف کا بھلا ہوتا ہے اور نہ مقدمہ نگار ہی کا اعتبار باقی رہتا ہے۔ دونوں کی "رسوائی" ہوتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جس ادب پارے میں جان نہ ہوگی اس میں کسی بڑے سے بڑے ادیب یا نقاد کا قلم معجز رقم بھی روح نہ پھونک سکے گا۔ اور جس ادب پارے میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت ہوگی وہ کسی عیسیٰ نفس کی تلاش نہیں کرے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں "اجلی پرچھائیاں" پر جو دیباچہ لکھ رہا ہوں تو کس حیثیت میں اور کیا سمجھ کر۔ حیثیت میری یہ ہے کہ میں اقبال متین کا دوست ہوں اور اس کے زیر نظر افسانوی مجموعے کا ناشر بھی، اور سمجھتا یہ ہوں کہ میری دیباچہ نگاری سے اسے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا البتہ اقبال متین نے کیا سمجھ کر یہ گھاٹے کا سودا کیا یہ میں نہیں جانتا۔ شاید یہ بھی دوستی ہی کی کوئی ادا ہو۔

اقبال متین کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا۔ یہ کوئی ۴۴، ۴۵ء کی بات ہوگی لیکن وہ شاعر جس کے مستقبل سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی جاتی تھیں آہستہ آہستہ کجلانے لگا اور چار پانچ سال کے بعد پھر جو اقبال متین سامنے آیا تو وہ شاعری کا لبادہ اتار کر افسانہ نگار بن چکا تھا۔ شکر ہے کہ افسانہ نگار اقبال متین نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور "چوڑیاں" جیسی (پہلی ہی) کہانی لکھنے کے بعد ادھر بیسیوں خوبصورت کہانیاں تخلیق کر کے اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری اختیار نہ کرتا تو یقیناً اردو افسانہ ایک اچھے فنکار سے محروم رہ جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو شاعری اور افسانہ نگاری کی اصناف ہی ایسی ہیں کہ ان میں ہمارے اہل قلم نے زیادہ جولانیاں دکھائی ہیں اور آج بھی اردو شعر و افسانہ کا ایک قابل لحاظ حصّہ اتنا بلند ہے کہ ہم اسے فخر کے ساتھ ہندوستان کی کسی بھی زبان کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے ہی میں کیا دنیا کی بہت سی زبانوں کے شعری و افسانوی ادب کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں اور میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار بھارت اور پاکستان میں ابھرے ہیں اور جنھوں نے اردو افسانہ نگاری کی ناک کو اونچا کیا ہے ان میں ایک اقبال متین بھی ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ حیدرآباد کی مٹّی کی منکسر المزاجی اور آج بھی اردو ادب میں پھیلی ہوئی صوبہ واریت، گروہ بندی اور احباب نوازی نے اقبال متین کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا ہو، اور وہ بھی ان "غیرادبی مظاہروں" کی پروا کیے بغیر لکھے جا رہا ہو۔

اقبال متین فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ سے ترقی پسند ہے لیکن وہ ادب میں کسی ازم کا قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہیے پھر سب کچھ۔ اور جو اچھا ادب ہوگا وہ کسی رنگ کا ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ اس میں دردمندی بھی ہوگی اور انسان دوستی بھی اور اس میں غمِ ذات سے لے کر غمِ کائنات تک ہر غم کے لیے گنجائش ہوگی۔ اگر ادب کی متذکرہ بالا تعریف کی تائید میں اقبال متین کی کوئی کہانی پیش کی جائے تو آپ کو اس میں اچھے ادب کی بہت سی خوبیاں مل جائیں گی۔

یوں اقبال متین کہانی کی کسی بندھی ٹکی تکنک کا پابند نہیں لیکن وہ کہانی کو ایک مشاق مشاطہ کی طرح بنا سنوار کر اور نوک پلک سے آراستہ کر کے اہلِ نظر کے سامنے لاتا ہے۔ وہ کہانی کے ضروری اجزا کے ساتھ دوسرے فنّی نکات پر بھی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور خاص طور پر کردار نگاری اور جزئیات نگاری میں تو اسے یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ وہ اپنی کہانی کے لیے کبھی کوئی ایسا کردار نہیں چنے گا جس سے وہ نہ مل چکا ہو بلکہ جب تک خود کردار کی طرف سے یہ اصرار نہ ہو کہ جب تم مجھے مجھ سے زیادہ واقف ہو تو پھر مجھ پر کیوں نہیں لکھتے۔ اس پر اقبال متین کہے گا کہ تمھاری خواہش ہو تو میں تم پر آج ہی کہانی لکھوں گا مگر ایک شرط پر کہ میرا کیمرہ جس میں اکسرے کی مشین بھی لگی ہے اگر تمھارے ظاہری خدوخال کے ساتھ تمھاری روح کے ڈھکے چھپے گوشوں کو بھی اجاگر کر دے تو مجھے برا بھلا نہ کہنا اور جب کردار کی طرف سے اقبال متین کو اجازت مل جائے گی تو پھر وہ بڑی بیدردی اور بڑی ہمدردی سے اس کردار کو کاغذ پر منتقل کر دے گا۔

چنانچہ آپ جھگن چاچا سے گاؤں میں ملیے یا برہان سے اسٹیشن والی سڑک پر، رام دیال سے آروند و گھوش کی تعلیمات پر تبادلۂ خیال کیجئے یا شیکھر کے ساتھ ہرن کے شکار پر جائیے، بیگم سے راست اس کے جسم کا مول تول کیجئے یا ہارڈنگ کے ساتھ کوالٹی میں آخری بار وسکی پیجئے آپ کو کوئی کردار اجنبی نہیں لگے گا سب آپ کے شناسا، دوست، عزیز رشتہ دار اور پیارے نکلیں گے اور ہو سکتا ہے کہ کسی کردار کے روپ میں آپ کو خود اقبال متین نظر آجائے اور آپ جھجک کر پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر کہانی میں کردار نگاری کی کوئی اہمیت ہے اور اپنے زندہ کرداروں کے بل بوتے پر کوئی افسانہ نگار زندہ رہ سکتا ہے تو اس مجموعے کی حد تک ہی جھگن چاچا برہان، ماسٹر صاحب اور رام دیال اقبال متین کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

بعض شاعروں کی طرح بعض افسانہ نگار بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس موضوعات کی کمی ہوتی ہے، اور ان کے فن کا انحصار محض طرز ادا اور حسن بیان پر ہوتا ہے۔ وہ متضاد اور مختلف موضوعات پر یکساں قدرت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے اور بعض افسانہ نگار ایسے ہوتے ہیں کہ تنوع اور بوقلمونی کے شوق میں ایسے موضوعات پر بھی کمندیں ڈالتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں اگر ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے دو چار افسانے پڑھ لیں تو پھر ہم اس کا کوئی بھی افسانہ پڑھیں یہ محسوس ہو گا کہ یہ افسانہ تو پڑھا ہوا ہے اور دوسری صورت میں ہم کسی ایسے افسانہ نگار کے سب افسانے پڑھ بھی لیں تو دو چار افسانے ہی کام کے نکلیں گے لیکن اقبال متین نہ پہلی شق کے افسانہ نگار

ہیں ہے نہ دوسری شق کے اس کے ہاں موضوع کی یکسانیت بھی نہیں ملتی اور ہر طرح کے موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کا شوقِ فضول بھی نہیں پایا جاتا۔ وہ ایسے ہی موضوعات کا انتخاب کرتا ہے جن سے وہ بوجوہ احسن عہدہ برا ہو سکتا ہے، یہ احتیاط یہ سنبھلا سنبھلا ہوا انداز دراصل اقبال متین کا مزاج ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اس کی آبرو بچائے ہوئے ہے۔

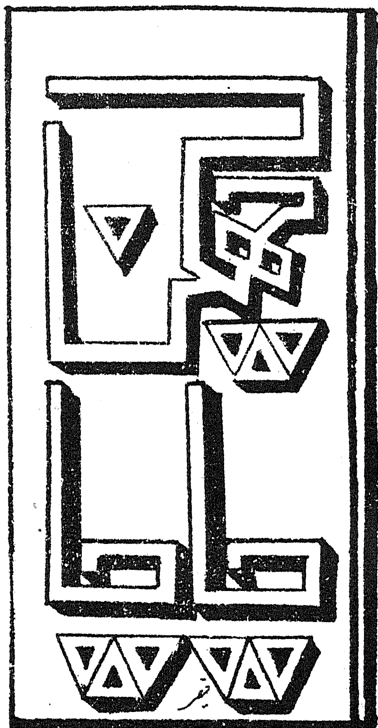
شاعری، افسانہ اور دوسری اصناف ادب کے لیے بھی یہ مسئلہ ہمیشہ متنازعہ فیہ رہا ہے کہ زبان کیسی ہونی چاہیے۔ عام طور پر سادہ اور سہل زبان کی تائید شدومد سے کی جاتی ہے لیکن زبان سے خیال اور نفسِ مضمون کے تعلق سے قطع نظر حقیقت تو یہ ہے کہ کسی شاعر، افسانہ نگار یا ادیب کی شخصیت کا اظہار اس کی زبان اور طرز تحریر ہی سے ہوتا ہے لہذا کسی فنکار یا ادیب سے یہ مطالبہ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی ہی زبان لکھے۔ اقبال متین کی تحریر میں بھی اس کی شخصیت صاف جھلکتی نظر آتی ہے جو عبارت ہے آراستگی، سلیقہ مندی اور ایک پر تکلف رکھ رکھاؤ سے، ساتھ ہی اقبال متین اپنے افسانوں میں حیدرآباد کے محاورے اور مقامی زبان کے الفاظ بھی بڑے چاؤ سے استعمال کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اہلِ زبان اس پر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ اس خصوص میں اس کا استدلال یہ ہے کہ جب اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنوا پنے محاورے اور روزمرہ پر اصرار کر سکتے ہیں تو ہم کو کیوں اپنی زبان استعمال کرنے کا حق نہیں دیا جاتا؟ اور کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس استدلال میں کوئی وزن نہیں ہے؟

پوری انسانی تاریخ حق و باطل، نیکی و بدی اور تعمیر و تخریب کی آویزش کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں انسان کہیں یزداں کی صورت میں خیر محض بنا ہوا ہے تو کہیں اہرمن کے روپ میں مجسم شر، اور کبھی کبھی تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دراصل وہ ہے کیا؟ لیکن ایک ابن آدم ابن مریم کو صلیب پر چڑھاتا ہے تو ایک ابن آدم رحمت للعالمین بن کر آتا ہے اور میرے نزدیک اقبال متین کے فن کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ انسان کی تصویر کے تاریک ترین رخ کو سامنے لانے کے باوجود انسان کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ اقبال متین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ مکتبۂ "صبا" کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے اور میرا ایقان ہے کہ روز بروز متین کا فن اور نکھرے گا اور سنورے گا۔

سلیمان اریب
اے سی گارڈز۔ سیف آباد۔ حیدرآباد دکن

۲۹ / جولائی ۱۹۶۰ء



چاچا چھگن کے تو پو بارہ تھے، کوئی گھر ہو، کوئی کنبہ ہو گاؤں بھر میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں چھگن چاچا کا بول بالا نہ تھا طبیعت بھی کچھ ایسی ہی پائی تھی انھوں نے۔ ورنہ بات بے بات میں کوئی کسی کا دم کیوں بھرے۔ اب اسی کو ہی لے لیجیے نا۔ امام دادا اور کریم بخش میں نو بارھواں چاند تھا۔ کریم بخش جس راہ سے گذریں گے امام دادا اس طرف تھوکیں گے بھی نہیں کریم بخش کا اکلوتا، نوجوان بانکا، دوبارہ زندگی ہوئی ہے اس کی لیکن کیا مجال جو امام دادا ایسے میں بھی پسیجے ہوں ــــ نا بھئی ایسی بھی کیا رنجش مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا۔ آدمی آدمی کا دشمن اور چاچا چھگن لگ گئے میل ملاپ کی فکر میں ــــ یہ اور بات ہے کہ امام دادا اور کریم بخش کے دلوں کا میل نہ گیا لیکن چھگن چاچا نے تو وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ امام دادا نے دبی زبان میں چھگن چاچا کو بھی کریم بخش سے میل جول رکھنے پر روک ٹوک کی تھی۔ مگر واہ رے چھگن چاچا یوں دامن بچا گئے کہ ہاتھ میلا نہ ہوا اور رنگ چوکھے کا چوکھا۔ امام دادا کو آخر کہتے ہی بنی کہ بھائی تم اپنے جی کے راجہ ہو، آپ اپنے مختار ہو میں شرمندہ ہوں جو یوں بے وجہ تمھاری طبیعت میں دخل دینا چاہا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ چاچا چھگن نے دونوں سے میل ملاپ جاری رکھا کیوں نہ رکھتے آخر۔ کوئی کسی سے ٹوٹے وہ تو سب کے تھے، سارے گاؤں کے۔

یہ جھگن چاچا کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ گاؤں میں جہاں کسی میں ٹھنی اور وہ لگے اپنی دُھن میں۔ نہ کھانے پینے کے رہیں گے، نہ سونے کے، فریقین میں جب تک گٹھ بندھن نہ ہو جائے وہ نچلے نہیں بیٹھنے کے۔ کلو مادھو کی تو چھوڑیئے، ان دونوں میں تو ہنتی بگڑتی ہی رہتی ہے۔ آج لڑیں گے تو کل مل لیں گے۔ کل مل لیے ہوں تو آج ضرور لڑیں گے۔ صرف ان کا ہی جھگڑا ایسا تھا کہ جھگن چاچا بھی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ چاچا نے خود چھیڑا ہے ان دونوں کو۔ اب پرسوں ہی کی بات ہے مادھو کو چوپال کی طرف آتا دیکھ کر چاچا یوں بیٹھے رہے جیسے منوں بوجھ دھرا ہو ان کے سینے پر ـــــ اور ہم سب سمجھ گئے کہ چاچا گل کھلائیں گے اب۔ مادھو نے چاچا کو اس رنگ میں دیکھا تو حسب توقع خیر خیریت پوچھی۔ چاچا کہاں چوکنے کے بولے۔ مادھو بیٹا وہ میرے اصیل ہیں نا دونوں۔ لال بھبوکا اور گٹر گوں جانے کیا بات ہے دو دن سے بہت میل ملاپ ہے ان میں۔ مادھو بولا تو کیا بُرائی ہے چاچا۔ چاچا کہنے لگے۔ دو لڑاکو یوں سر جوڑ لیں تو سمجھو خون میں گرمی نہیں رہی ان کے۔ آختہ ہو گئے بس، اور سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ مادھو تاڑ گیا، یوں کھسیانا ہوا کہ اب رو پڑے گا۔ اس دن سے گاؤں والوں میں کلوا اور مادھو کا نام لال بھبوکا اور گٹر گوں پڑ گیا۔

چاچا کی یہی باتیں گاؤں بھر میں مشہور تھیں۔ جہاں کچھ آنا کانی ہوئی کہ چلے سب چاچا کے گھر۔ گاؤں کے کسی باسی نے چاچا کے تیور پر بل پڑتے نہیں دیکھا۔ چاچا میں خوبیاں یوں تو بہت سی تھیں۔ بات کرنے کا انداز ایسا دلکش جیسے ہوٹل کا ریڈیو بول رہا ہے آواز میں گرمی بھی نرمی بھی۔ جو بولیں گے دل میں اتر کر رہے گی۔ عجیب شخصیت تھی ان کی بچّہ، جوان، بوڑھا، عورت، مرد سبھی خوش ان سے، چاچا کیا تھے چلتا پھرتا جادو تھے بوڑھا سادھو کہتا تھا جھگن چاچا اس کے ہم عمر ہیں لیکن دیکھنے میں تو وہ اتنے سال خورد

نہیں معلوم دیتے تھے۔ یوں انھوں نے بیٹھک پر اس آندھی کا ذکر تو کئی بار کیا تھا جو سنتے ہیں کوئی پچیس سال پہلے آئی تھی۔ وہ کہتے تھے تمھارا چاچا آنکھوں دیکھی باتیں کرتا ہے۔ کانوں سُنی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چاچا اتنے ہی بڑے ہوں بھی لیکن جی نہیں مانتا تھا اور مانے بھی تو کیسے۔ چوڑی چھاتی، گٹھیلا بدن چال ڈھال میں ایسا طنطنہ جیسے فوجی افسر چل رہا ہو۔ بالوں پر ہمیشہ خضاب مگر مونچھیں نہ داڑھی۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے تھے پر کیا مجال جو کوئی اس بہروپ کی تہہ تک پہنچ سکے۔ دل کی جوانی کا یہ عالم کہ بدن کے کس بل سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی۔ آس پاس کے گاؤں میں کہیں میلہ لگتا اور چاچا گاؤں کے گبروؤں کی ٹولی بنا کر چل پڑتے۔ کبڈی کی شرطیں ہوتیں اور چاچا کھلاڑیوں کے چاؤ میں مگن ہو جاتے۔ جہاں چاچا نے ان باتوں میں دلچسپی لی کہ ہم میں گھن پن شروع ہو گئی۔۔۔ چاچا بنا رہے ہیں ٹیم۔ اچھا جی۔ پھر تو مزے ہیں مزے۔ چاۓ بسکٹ، پان بیڑی سبھی کچھ رہے گا۔ اور واقعی سبھی کچھ رہتا۔

چاچا ہاتھ کے بہت کھلے تھے۔ کہتے پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ سرکار سے پچانوے روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی۔ آنند تھے اور یوں بھی ان کا تھا کون جس کی حق تلفی ہوتی۔ دھرم پتنی تھیں سو انھیں سورگباش ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ چاچا کی جوانی ہی میں وہ داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ رہ گئی مالتی بہن سو ان کا بیاہ چاچا نے ایک اچھے کھاتے پیتے دیسکھ گھرانے میں کیا تھا۔ مالتی بہن کو وہ جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور ننھی کی تصویریں تو جب دیکھو ان کے جیب میں پڑی رہتیں۔ باوجود اتنے چاؤ کے وہ مالتی بہن کے گھر جانے سے گریز ہی کرتے۔ ان کی منطق ہی جدا تھی۔ کہتے بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اور بیٹا اپنا دھن۔ اپنا دھن تو ہے نہیں۔ پرائے دھن کی کیا میت۔ اس پر زینون، کلثوم، پدما سب کی سب

بگڑ اٹھتیں۔ تو کیا چاچا۔ مالتی کے لیے آپ کے من میں کچھ نہیں ــــ ؟ ہے کیوں نہیں لیکن تم سب بھی تو ہو۔ ایک من میں کس کس کا پریم لیے پھروں گا، اور چاچا یوں رجھا لیتے سب کو، گاؤں کی چھوریاں اس بات کو ٹول دیتے ہوئے بھی ڈرتیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی نہ جانے چاچا کیوں کتراتے تھے اس قصے سے جہاں یہ بات چلی کہ لگے چاچا زمین گھورنے زمین گھورنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی ہوں ہاں کہیں گے۔ ہوں ہاں بھی نہ ہو سکے تو وینکٹ کے بیل، پیپل کا بھوت، ڈپٹی صاحب غرض کہ کچھ نہ کچھ بات نکال دیں گے، یہ بھی نہ چلے تو یوں زمین گھوریں گے جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہے ہوں۔ نظریں زمین پر گڑی ہوئیں۔ پنگھٹ پر، چوپال پر چاچا سب میں موجود ہوتے ہوئے بھی سب سے غائب۔ دور بہت دور کہیں گپھاؤں میں کھو جائیں گے، خلاؤں میں بھٹکیں گے ــــ اور ری پدما ٹیں پھس ہو گئے وہ تو ــــ سفر کر رہے ہیں پنجاب میل میں پدما کچوکا دے گی۔ پدما، زیتون کھُس پھُس۔ غرض پنگھٹ پر چاروں سمتوں سے نظریں اٹھیں گی۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی۔ رام جانے ــــ اللہ توبہ ــــ اور چاچا غائب۔ دور بہت دور۔

اس بات سے ہٹ کر چاچا کو کبھی کسی نے کھویا کھویا نہیں دیکھا۔ بات بات پر ہنستے بیچ بیچ سے پیک کی پچکاری ماری اور لگے دانت کریدنے۔ سیر سپاٹوں کے دلدادہ۔ کہتے کیسی جوانیاں ہیں جو یوں نچلے بیٹھے رہتے ہو۔ جوانی تو ٹوپی کا پھندنا ہونا چاہیئے۔ مضطرب، بے کل، پارہ۔ سنتا ہوں ندی چڑھی ہوئی ہے۔ سمے ایسا کہ مجھ بوڑھے کا بدن کس مس کرتا ہے۔ آنکھ اٹھاتا ہوں تو متوالا ہوا جاتا ہوں ــــ نا بھئی مجھ سے تو نہیں رہا جاتا۔ ہم کوئی ماں کے پیٹ میں تھوڑا ہی ہیں جو یوں ٹپرے بھگتیں۔ دنیا نہ ہوئی کال کوٹھری ہو گئی۔ نا بھئی ان جوانیوں سے تو یہ بڑھاپا ہی بھلا۔ اور ہم سب سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے۔ بیچ پان کی پیک

زمین پر آرہتی اور زردہ کا ایک بھپکا ہمیں مسحور کر دیتا۔ توشے تیار ہوتے۔ چاچا نکڑ کے مٹھائی والے کو چوپال پر سے پکارتے ـــــ "گولی پہلوان ذرا سنا تو۔" "حکم کرنا چاچا" وہ جواب دیتا۔ "جلیبیاں اور لڈو کل سویرے سویرے چاہئیں۔ تازہ گھی کے۔ سیر سے سورما، اور دو سیر کر دن سویرے سویرے گولی پہلوان کو لڈو اور جلیبیوں کی قیمت سے کچھ اوپر ہی مل جاتا ـــــ وہ ان کا سورما جو ٹھہرا ـــــ چاچا اس کو اپنا سورما کہا کرتے ـــــ بات یہ تھی کہ سورما نے واقعی ہمارے گاؤں کی لاج رکھ لی تھی ـــــ سیتا پور والوں کے آسامی نے چاچا کے پاس چٹھی بھیج دی تھی کہ کشتی میں اگر ہمارے گاؤں کو ہرا دیں تو مان لیں گے وہ اوجنی کے گبروؤں کو ـــــ سیتا پور ہمارے اوجنی کے کوئی چار میل اُتر میں تھا۔ ہر سہ ماہی کو سیتا پور اور اوجنی والوں میں دھڑلے کی کبڈی ہوتی۔ اس سال ہم نے انھیں مسلسل تین بار جیتا تھا۔ چٹھی دیکھی تو فوراً لکھ بھیجا ـــــ سوموار کو ہم آرہے ہیں، پر اس شرط سے کہ جو ہارے گا وہ جلسہ بھی دے گا ـــــ آسامی چلا گیا ـــــ پر چاچا لڑے گا کون ـــــ ہم حیرت سے بول اٹھے ـــــ لڑے گا کوئی بھی میرا لال یا گبر گوں ـــــ سارا چوپال کھل کھلا اٹھا۔ پھر چاچا سنبھل کر بولے ہاں کر دی ہے تو پیچھے نہیں ہٹنے کے ہم۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا ـــــ اور ہاں وہ کیا کم ہے ہمارا گولی پہلوان۔ موچھوں پر تاؤ دیتا پھرتا ہے۔ موچھیں منڈوا دوں گا بچہ کی۔ انھوں نے اس انداز سے تن کر کہا جیسے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے ہوں۔ "پھر تو جلسے کی تیاری کیجیے چاچا۔ ہو چکی کشتی" بیٹھک کے کونے سے کسی نے کہا۔ ہم پیچھے پلٹے تو بندہ علی کہہ رہا تھا۔ تین سال ہوتے ہیں اس کو لنگوٹ کھول کر اور حساب سے تین ہی بچے بھی ہیں اس کے۔ سچ۔ چاچا نے مسکراتے ہوئے زمین پر پچکاری چلائی ـــــ پان کو

دھنے جبڑے ہیں برابر کرتے ہوئے بولے عورت کے آگے لنگوٹ کھولا تھا اس نے کچھ مرد کے آگے تو نہیں کھولا تھا، اور سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سوموار کو دھڑے پیٹے، پنگیاں باجتے جب ہم سیتاپور پہنچے ہیں تو سارا گاؤں دنگل پر جمع تھا، عورتیں بھی چھتوں پر گھاس کی گری پر چڑھی ہوئی ہماری منتظر تھیں۔ گنپت کو دیکھا تو ہمارے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ دل ایسے دھڑکنے لگے جیسے گاؤں میں بجتے ہوئے دھپڑے ہمارے سینوں کے اندر پیٹ رہے ہوں۔ کشتی شروع ہوئی تو گولی پہلوان چوکڑی بھول گیا تھا۔ گرتے گرتے یوں سنبھلتا جیسے سال بھر کا بچہ چلنا سیکھ رہا ہو۔ ایک بار تو بس حد ہی کر دی اس نے۔ کشتی کرتے کرتے اتنی حسرت سے ہماری طرف دیکھا ہے جیسے کہہ رہا ہو، میں نے کیا قصور کیا تھا ــــ گیا چاچا، میرے منہ سے چیخ ہی تو نکل گئی کمبخت نے حواس بھی تو کھو دیئے ہیں۔ لڑتا کہاں ہے اور دیکھتا کدھر ہے چاچا کا یہ عالم کہ گولی کے ساتھ ساتھ خود بھی اُچھل کود رہے ہیں۔ جیسے کھڑے داؤں پیچ سکھا رہے ہوں ــ مار دیا۔ مار دیا ــ مار دی۔ آمیرے سورما۔ اور گنپت سانڈ کی طرح چت پڑا تھا۔ ــ پھر کیا تھا سورما کبھی کسی کے کندھے پر تھا تو کبھی کسی کی گود میں، کبھی گردن میں لٹکا ٹانگیں جھاڑ رہا تھا۔ چاچا نے اپنی طرف سے چاندی کا کڑا سورما کے ڈنڈ پر چڑھایا تو اس نے حیران چھپ کر آہستہ سے چاچا کے کان میں کہا۔ چاچا آج سے میں نے مرد کے آگے بھی لنگوٹ کھول لیا ہے۔ سب ہنس پڑے۔

چاوڑی میں کھارے میٹھے اور چاء پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہمارے سورما کو پھول پہنائے گئے، باجوں اور روشنی سے جب گھر واپس ہوئے ہیں تو بہت ساروں نے فصیل کے باہر ہی استقبال کیا۔ آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ گولی پہلوان پھول پہنے آرہا ہے۔ ضرور

جیت لی ہو گی اس نے کشتی لوگ جلوس میں شامل ہونے لگے۔ بھئی واہ مار دیا ہمارے سورمانے ۔ سورما کا کوئی یار یوں چیخا ۔ جندہ باد میرے پٹھے عورت بھی جیت ۔ مرد بھی جیتے ۔ اور چاچا نے جواب میں کہا بھگوان کی کرپا ہے ورنہ دونوں پٹ گئے ہوتے ذرا کی ذرا میں۔

چاچا کی یہی زندہ دلیاں تو گاؤں کی زندگی تھی۔ مہینوں میں برسوں میں کبھی کبھار جب وہ مالتی بہن کے پاس چلے جاتے یا بیمار پڑ جاتے تو سارا گاؤں سونا سونا ہو جاتا۔ ہم سب کچھ ایسا محسوس کرنے لگتے جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ اور کھیتوں کی لہلہاہٹ ختم ہو گئی ہو اور جیسے ڈھور ڈنگر نے دانہ چارہ چھوڑ دیا ہو۔ حالانکہ سارے کاروبار اسی ڈھنگ سے جاری رہتے لیکن شاید دلوں کی ویرانی گاؤں کی ویرانی بن کر سارے گاؤں پر مسلط ہو جاتی ۔ ماحول ہی کچھ بجھا بجھا سا ہو جاتا جیسے کوئی اہم ترین چیز ہماری زندگیوں میں سے کم ہو گئی ہو۔ چاچا کیا تھے گاؤں والوں کا دل تھے۔ ہمدرد اتنے کہ ہر کسی کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ کبھی انھوں نے کسی کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا بلکہ سچ پوچھئے تو وہ ایسے وقت کی تلاش میں رہتے کہ انھیں کسی کی خدمت کرنے کا موقع ملے۔ آپ یقین کیجئے جب وہ ہمیں حکایاتِ شیریں میں چھپ چھپ کر گھروں میں تھیلیاں پھینکنے والے وزیر کا قصہ پڑھاتے تو میں اس وزیر کو چاچا کے روپ میں دیکھنے لگتا۔ میرا مقصد اس سے یہ نہیں کہ چاچا بھی یوں ہی کرتے لیکن جانے کیوں یہ سبق یاد کرتے وقت میں چاچا کو باوجود ان تھک کوشش کے خیال سے ہٹا نہ سکتا چاچا نے سارے گاؤں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے اودھپنی میں ایک ہی بہت بڑا خاندان یا کنبہ رہ بس گیا ہے ۔

بوڑھی بھنگن کا نواسہ بیمار ہوا تھا تو چاچا نے سو سو جتن کیے تھے اس کے لیے اس زمانے میں سردیاں کڑاکے کی پڑ رہی تھیں۔ آگ تاپتے ہوئے چاچا نے شعلوں کو

گھورتے ہوئے کہا تھا جہاں آگ انسان کے سرد جسم کو حرارت بخشتی ہے وہیں ایک ایسی بھی آگ ہے جو متحرک جسم کی حرارت کو سرد اور بے جان کر دیتی ہے ہم نے چاچا کی ان بے وقت فلسفیانہ باتوں کو سمجھ نہ پاکر پوچھا تھا — کون سی آگ ؟ — پیٹ کی — اور ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — سچ کہتے ہیں چاچا — تو پھر کیا سوچا ہے تم لوگوں نے جھنگن کے نواسے کے لیے — اور دوسرے دن اتنا چندہ جمع ہو گیا تھا کہ قصبہ کا ڈاکٹر بلایا گیا۔ ایک کمبل خریدی گئی اور اناج سے بھری پوری دو بوریوں کی جھنگن مالکن ہو گئی —

میری ماں کہتی تھی جھگن چاچا آدمی کے روپ میں دیوتا ہیں وہ اس بات کے جواز میں ہمیشہ ایک قصہ لے بیٹھتی۔ کہتی کہ جب میں چھوٹا سا تھا اور میرے باپ کو ابھی کہیں نوکری نہیں ملی تھی ان دنوں کئی کئی دن کے فاقے ہوتے تھے ہم پر۔ فاقوں کی وجہ سے ماں کی چھاتیاں سوکھ جاتی تھیں تو دودھ کی بوند بوند کے لیے میں بھی بلکتا تھا زمینیں تو ہماری تھی نہیں جو کھیتی باڑی کرتے۔ میرے ماں باپ جولاہے کا کام کرتے تھے ان دنوں۔ یہ دھندا کچھ چلتا چلاتا نہیں تھا۔ پہلے تو ایک ایک رومال ایک ایک لنگی بنانے میں کئی کئی دن بیت جاتے اور جو مال تیار ہوتا اس کی کھپت ان داموں نہیں ہوتی جو لاگت اور ان کی کڑی محنتوں کا معاوضہ ہو سکے۔ نفع کا ایسے میں سوال ہی کیا۔ میری ماں اور باپ اس مفلسی کی زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ آدمی بھوکا ہو تو شاید اس کے سارے انسانی جذبے دم توڑ دیتے ہیں میری ماں کہتی کہ میرا باپ ان دنوں اپنی زندگی سے تنگ آچکا تھا۔ ہمیشہ چڑچڑا رہتا۔ بے وجہ مجھے گھر کتا، ماں کو گالی دیتا، اور میرے بڑے بھائی کو علانیہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستا، اس پر ماں کچھ کہتی تو الٹا بھڑ کر

دو دو دن گھر سے کہیں چل دیتا اور سدھ بدھ تک نہ لیتا ہماری۔ وہ کہتی کہ جھگن بھیا کو شاید یہ واقعات معلوم ہوئے۔ ایک بار میرا باپ پینے کے تقاضے سے تنگ آکر گھر سے غائب تھا اور وہ بیٹھی رو رو کر مجھے تھپک تھپک کر سلا رہی تھی اس وقت جھگن چاچا اپنے مخصوص انداز میں پان کی گلوری جبڑے میں دبائے مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے ماں کو روتا دیکھ کر وہ باتیں کی ہیں کہ پیٹ خالی ہونے پر بھی ہنسی نکل پڑی۔ پھر کہنے لگے قاسمہ بہن میں اچھی طرح جانتا ہوں اس بخشو کو۔ میرا بچپن کا ساتھی ہے نا باؤلا اور دیکھ بہن تو اپنے من میں کچھ اتنا پریم رکھتی ہے اس کے لیے کہ وہ تجھے تڑپا تڑپا کر شانت ہوتا ہے۔ گیا ہے تو آپ ہی چلا بھی آئے گا، یوں اس کے لیے روتی بیٹھے گی تو تیری آنکھیں آنسو بن کر بہہ جائیں گی اک دن۔ جیسے انھیں ماں کے رونے کا سبب معلوم ہی نہ تھا۔ جاتے ہوئے کہنے لگے کچھ اپنے بھائی بھاوج کا بھی تو خیال کر گا ہے ما ہے۔ اکیلی پڑی رہے گی لیکن ذرا کی ذرا ہماری بھی پوچھ گچھ کی ہے کبھی۔ مالتی کی ماں ہے کہ یاد کیے جاتی ہے بیچاری ـــــ ان دنوں چاچی زندہ تھیں۔

تیرے چاچا چلے گئے تو میں نے تجھے کھاٹ پر سلانے کے لیے اٹھایا تیرے تکیے کے نیچے پیلا پیلا نوٹ دھرا تھا۔ اور ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ سنتی ہوں اگلے زمانے میں بادشاہ اور وزیر اپنی پرجا سے ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ پر اب کہاں ایسے بادشاہ بھی۔ تب تو مجھے یقین سا ہونے لگتا کہ "حکایات شیریں" کے وزیر نے چاچا کے روپ میں دوسرا جنم لیا ہوگا۔ میں ان خیالوں میں کھو جاتا اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں پونچھ لیتی۔

چاچا کے ایسے ہی اور بھی دو ایک قصے مشہور تھے جنھیں دے سکتے انھیں کھلنڈر

بھی دے دیا کرتے لیکن خود ان کو کسی نے کبھی اپنی حاجت بیان کرتے نہیں سنا۔ کیسی ہی افتاد پڑے ہنستے ہنساتے سہہ لیں گے کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ چاچا فکر مند ہیں یا کوئی بات انھیں اندر ہی اندر کھولا رہی ہے۔ ایسے میں بھی صرف ایک ہی چیز تھی جس سے کبھی کبھی ان کی حالت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہی باتیں کرتے کرتے یا ہنستے ہنستے زمین پر کچھ تلاش کرنے کی عادت۔ کبھی چاچا قہقہہ لگاتے لگاتے ایک دم ایسے خاموش ہو جاتے جیسے کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ ہمیشہ کی بشاشت ان کے چہرے سے کچھ اس طرح غائب ہو جاتی جیسے یہ پل بھر کی سنجیدگی اور متانت ہی ان کے چہرے کی خصوصیت ہو۔ سنجیدگی اور تمکنت کا یہ خول ان کے وجود کو اس طرح ڈھاک لیتا کہ ان کی شخصیت پر کچھ شبہ ہونے لگتا، اصلی چاچا کونسا ہے ـــ؟ یہ جو اس وقت سامنے ہے یا وہ جو ابھی ابھی زندہ تھا، اور اگر اس چہرے کے توسط سے کوئی ان کے قریب ہو رہا ہوتا کوئی ان کے اندر جھانک رہا ہوتا کہ وہ ایک دم کھل کھلا اٹھتے ـــــــ جیسے پل بھر پہلے مارے ہوئے قہقہے کا تسلسل ابھی ٹوٹا ہی نہ ہو۔ جیسے یہ قہقہے ان کے وجود کا جزو ہوں اور شاید سب یہی سوچنے لگتے کہ اصلی چاچا کونسا ہے ـــ وہ جو ابھی مردہ تھا یا یہ جو اب زندہ ہے ـــ کھلنڈرا ہنس مکھ جوان ـــ بنج۔ زردہ کی خوشبو کا ایک بھبکا سب کو مسحور کر دیتا اور کوئی بھی چاچا کے اندر تک نہ پہنچ سکتا۔

وہ یوں جب کبھی خاموش خاموش نظر آتے تو نہ جانے کیوں میرا خیال مالتی بہن کی طرف رجوع ہوتا۔ میرا دل بولتا کہ چاچا کی ان بجھی اور سلگتی ہوئی آنکھوں سے مالتی بہن کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوگا۔ میں جتنا ہی اس بات کو سوچتا اتنا ہی میرے دل کو یقین ہوتا جاتا۔ میں نے بارہا اپنی ماں سے مالتی بہن کے لیے الٹ پھیر کر پوچھا تھا لیکن وہ

ہمیشہ ہی مجھے اس کا یقین دلاتی رہی کہ وہ بڑے ٹاٹھ سے ہیں۔ ساون گاؤں کے دیسمکھ کی بہو۔ بڑی بڑی زمینیں، جائداد، نوکر چاکر سبھی کچھ ـــــ اللہ رکھے ایک نہیں دو بچے، بھیا کہتے ہیں پاؤں بھی بھاری ہو گئے ہیں اس کے۔

میں خود بھی سوچتا کہ اس سے زیادہ آخر اور کیا آرام چاہیئے کسی کو۔ رہ گیا میاں بیوی کا پریم سو اس کے تو چرچے تھے۔ وہ تھیں بہت محبت والی۔ چاچی کو تو بھی کچھ پتہ تھا مالتی بہن تو باپ پر گئی تھیں جس کے باپ نے سارے گاؤں کو موہ لیا ہو، اس کی بیٹی اپنے پتی کو نہ اپنا لے۔ جی نہیں مانتا تھا۔

میں پھر کھوجتا "ماں پریم تو ہے نا جوڑے میں۔" کیوں نہیں سنتی ہوں پاؤں دھو کر پیتا ہے اس کے۔ کھل میری ہنسی نکل جاتی، یہ پاؤں کا دھوؤن پینے کی بھی خوب رہی، لیکن جی چاہتا کوئی میرے بھی پاؤں دھوئے۔ یا میں ہی کسی کا۔ اور یوں ہی جو بات چاچا اور مالتی بہن کے بارے میں چلتی وہ اکثر مجھ پر آکر ختم ہوتی مجھے اس پاؤں دھونے والی بات سے اتنا لطف آتا کہ ماں میری منگنی کی باتیں لے بیٹھتی، اور میں جانتا تھا کہ میری ماں اس موضوع پر جب کبھی آتی ہے تو روتی ضرور ہے اور اسی سبب میں اس سے پہلے کہ اس کو اپنی مفلسی اور نکبت کا احساس ہو وہاں سے کھسک جاتا۔

ہاں چاچا کے بارے میں ایک اور بات مجھے کھٹکتی تھی۔ حوالدار مرحوم کی بہن نوراں دادی کی نواسی کا بیاہ تھا۔ ہمارے ہی ضلع میں کہیں بات چیت ہوئی تھی۔ بیاہ سے دو ایک دن قبل چاچا بھی اتنے مصروف رہے کہ چوپال کا رخ نہیں کیا۔ بیاہ کا دن آیا تو ہم سب ہی شریک تھے۔ چاچا اس طرح خوش خوش کام دھندے میں لگے تھے جیسے یہ تقریب ان ہی کے پاس ہو رہی ہو۔ ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ، چہل اور دولہا والوں سے

نوک جھونک۔ وہ ہر بات میں شریک تھے لیکن جب بارات جانے لگی تو نوراں دادی اور گھر والی عورتوں کے رونے چلّانے سے چاچا بھی اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی سب چہل آن کی آن میں غائب ہو گئی۔ جانے عورتیں شادی بیاہ کے مواقع پر بھی رونے سے کیوں نہیں چوکتیں۔ پال پوس کے پروان چڑھانے کے بعد اپنے جگر گوشہ کو کسی اجنبی کے حوالے کرتے ہوئے دکھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ سنتے ہیں بڑے شہروں میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو خود ہی پسند کر لیتے ہیں شاید ایسے میں شہر کی بڑی بوڑھیاں یوں چلّا چلّا کر روتی بھی نہ ہوں گی۔ سچ پوچھیے تو رونے دھونے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ رونا دھونا ہی ٹھہرا تو یوں کر کے دینا ہی کیا ضروری ہے۔ ان بوڑھیوں کا تو اللہ بیلی۔ اِدھر روتی بھی ہیں اُدھر دگانے بھی ادا کرتی ہیں کہ سینے کا بوجھ سرکا۔ نوراں دادی کی ہاؤ ہُوسُنی تو میری ہنسی نکل گئی۔ بارات روانہ ہوئی تو چاچا باہر نکلے۔ میں نے جو آنکھ اٹھائی تو چاچا منہ موڑ کر آنسو خشک کر رہے ہیں —— مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہ تھا۔ وہ چاچا جن کی آنکھیں بڑی سے بڑی مصیبت میں نم نہ ہوئی تھیں آج یوں بچّوں کی طرح آنسو بہا رہا ہے۔ مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایسی معمولی باتوں پر کبھی رو ہی نہیں سکتا اور یہ صرف دکھاوا ہے شاید نوراں دادی کے لیے۔ لیکن چاچا اتنا عام آدمی بھی تو نہیں ہے جو شخص کسی کی خاطر دکھاوے کے لیے ہنس نہیں سکتا وہ رو کیسے سکتا ہے؟ —— اور نہ جانے کیوں مالتی بہن میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

اس وقت میرے ذہن میں چاچا کے خلاف مورچہ قائم ہونے لگا۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے چاچا کی شخصیت میں میرے لیے وہ دلچسپی ختم ہو رہی ہے جو کبھی تھی۔ ماں کہتی تھی کہ چاچا کے اس پر بہت سے احسانات ہیں لیکن مجھے جب مالتی بہن کا خیال آتا تو چاچا کے سارے احسانات کو بھول کر میرا ذہن ان کے خلاف سوچنے کو تیار ہو جاتا، ایسے میں خصوصیت

سے مجھے وہ بات یاد آکر تڑپا گئی جو چند ہی ماہ پیشتر اس ضمن میں پیش آئی تھی۔ مالتی بہن نے بوڑھے کاکا کے ساتھ ننھی کو شہر سے بھیجا تھا کہ وہ اپنے نانا کو کسی طرح پکڑ لائے۔ لیکن چاچا نے پھسلا منا کر ننھی کو اکیلے لوٹا دیا تھا۔ خود نہ جانا تھا نہ گئے۔ جب تک ننھی یہاں رہی چاچا اس پر وارے نیارے ہوتے رہے اور جانے لگی تو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے اور جا چکی تو زمین پر کچھ تلاش کرنے لگے۔ اس دن سے کوئی دو تین روز تک میں نے غور کیا تھا کہ چاچا پھر کچھ کھوئے کھوئے سے رہے، پھر چند دن تک مجھے ان کی مسکراہٹیں ان کی دلی کیفیات کو جھٹلاتی ہوئی معلوم ہوئیں جیسے ان کی خارجیت ان کی داخلیت کا کفن ہو۔ ایسے میں میں نے یہ مناسب بھی نہ سمجھا کہ ننھی کے اکیلے لوٹا دینے کا سبب پوچھوں ورنہ یوں تو میرا جی چاہتا تھا کہ اس معاملے میں چاچا سے کھرے کھرے سوالات کر ہی لوں، کیوں کہ مجھے مالتی بہن بہت پیاری تھیں اس لیے بھی کہ میں نے چاچی کا دودھ پیا تھا۔ پھر بھی جب ننھی جا رہی تھی میں نے دبی زبان میں چاچا سے التجا کی تھی ۔۔ لیکن وہ زمین پر نظریں گاڑے جانے کہاں پہنچ گئے تھے ۔۔ جب ان کی نظریں اٹھیں تو میں نے دیکھا پلکیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور موجود تھی ۔۔ تو چلی گئی ننھی ؟ ۔۔ کیوں نہ جائے گی ۔۔ آخر وہ چونکے۔ تب میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کا انھیں احساس بھی نہ تھا۔

اس واقعہ کے تین چار مہینے کے بعد وہ یکایک مالتی بہن کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔ البتہ مالتی کی سہیلیاں اس کے پاس اپنے پیام اور سندیش بھیج رہی تھیں۔ میری خوشی بے پناہ تھی۔ ماں مگر خوش نہ دکھائی پڑتی تھی۔ چاچا صبح کو نکلنے والے تھے۔ انھوں نے میری ماں سے توشہ کی تیاری کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ جب انھیں کسی لمبے سفر پر جانا ہوتا تو وہ میری ماں سے

ہی توشے کے لیے کھانا بنوا نتے۔ میری ماں کو ایسی چیزیں بنانے میں مہارت تھی جو رکھ رکھ کر کھائی جا سکیں۔ اس شام وہ بہت دیر تک ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ چلتے وقت کہنے لگے آٹھ میل تو پیدل چلنا ہوگا قسوہن تب کہیں جا کر گاڑی ملے گی۔ وہ بھی دن ڈھلے۔ ڈبہ ڈبولی ہو تو اسلم پہنچا دے گا بھیا۔ ہاں ہاں پہنچائے گا کیوں نہیں سلو میرا، اور وہ کواڑ کھول کر باہر نکل گئے۔

دوسرے دن صبح کو جب میں توشہ لے کر چاچا کے دروازے پر پہنچا ہوں تو تالا پڑا تھا۔ پہلے تو میں ٹھٹکا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شاید چاچا بھی توشہ ہی کی غرض سے ہمارے گھر گئے ہوں۔ لوٹ گیا۔ بظاہر تو اس کا بھی امکان نہ تھا اس لیے کہ اگر وہ ہمارے ہاں جاتے تو ان سے راستہ میں میری مڈبھیڑ ہونا ضروری تھا۔

میں گھر لوٹنے لگا تو راستے میں برج لال بنیے کے مکان پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ اس کے گھر میں ڈکیتی پڑی تھی۔ پندرہ سو روپے کی نقدی غائب تھی۔ اس کی پتنی چھاتی کوٹ رہی تھی۔ گاؤں والے آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے سبھی کو ہمدردی تھی۔ کوئی کچھ پوچھتا، کوئی کچھ سوال کرتا۔ برج لال نے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ رات گئے صرف چھبیل داس جی آئے تھے انھیں ہجار روپیہ قرض کی ضرورت تھی۔ بہت منتیں کیں لیکن میں ٹال رہا تھا۔ اور وہ رونے لگا۔

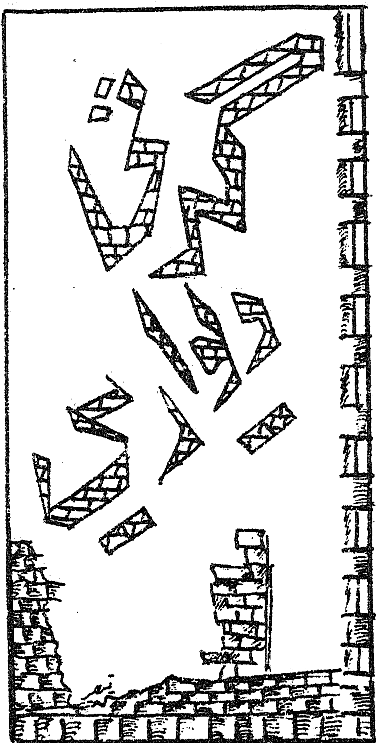
چھبیل داس جی آئے تھے۔ رات گئے۔ انھیں ہزار روپے کی ضرورت تھی ـــــ اور چاچا گھر پر بھی نہیں ہیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے گاؤں پر بہت بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ بہت بڑی مصیبت۔ اور ماں میرے کانوں میں چلا رہی تھی بھیا آدمی نہیں دیوتا ہیں ـــ مجمع میں کوئی چیخ رہا تھا۔ چاچا گھر پر نہیں ہیں۔ چاچا غائب ہیں۔

چاچا — غائب ہیں۔ اور انھیں آوازوں میں جیسے میری ماں مجمع میں پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ پکار رہی ہو —— بھیا آدمی نہیں دیوتا ہیں۔

میں گھر لوٹا تو میری حالت اس جواری کی تھی جس نے اپنا سب کچھ ہار دیا ہو۔ ماں کواڑ کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ میں کھاٹ پر گر پڑا تو ماں نے دھیمی آواز میں کہا — تیرا چاچا بدنصیب ہے ستّو۔ جو چیز اسے جان سے پیاری ہے اسی کے دکھ میں گھل رہا ہے۔ مالتی ہسپتال میں ہے۔ اس کے پیٹ میں رسولی ہے۔ اس کے پتی نے شراب اور جوّے میں ساری جائداد کھو دی ہے۔ تجھے کیا خبر بیٹا۔ اس موے نے تیرے چاچا کو خوب پیٹا بھی تھا —— ہاتھ ٹوٹیں ظالم کے۔ بھیا آدمی نہیں —— اور ماں سسکیاں لینے لگی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے چاچی مجھ سے دودھ کا بدلہ مانگ رہی ہے میں نے نظریں جھکا لیں تو جیسے کسی گہری اور عمیق کھائی سے چاچا پکار رہے ہوں مالتی۔ مالتی۔ اور میرے منہ سے نہ جانے کیوں نکلا۔ ماں چاچا بہت بڑے ہیں۔ وہ دیوتا نہیں، آدمی ہیں۔





بی اماں اٹھ بیٹھ کر تی پیش دالان میں پہنچ گئیں۔ گھر کا گھر ابھی سو رہا تھا۔ صرف دلہن کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور بیچارے نادو میاں لحاف میں منہ چھپائے دلہن کو پچکار رہے تھے۔ فجر کی اذاں کے ساتھ ہی دلہن کی طراری کی بھنک بی اماں کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ دل پہ پتھر رکھ کر انھوں نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور اللہ میاں کی بارگاہ میں دلہن کی تنک مزاجی کے خلاف دبے دبے احتجاج کیا تھا اور نادو میاں کے لیے دعائیں کی تھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر انھوں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو دلہن ابھی تک نادو میاں پر گولیوں اور بموں کی بوچھار کر رہی تھیں۔ سو بی اماں پیش دالان تک چلی آئیں کہ دلہن کو ان کی قربت کا احساس ہو اور نادو میاں بخشے جائیں۔
جب سے دلہن نے گھونگٹ سے سر نکالا تھا انقلاب تازہ ترپیدا کر رہی تھیں اور بیچارے نادو میاں نے اس طرح ہتھیار ڈال دیے تھے کہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن بی اماں نے آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھا کیوں کہ انھوں نے اپنے بہت چہیتے بیٹے کے لیے اپنی پسند کی بہو ڈھونڈی تھی۔ بات کر کے پرکھا تھا۔ چلا پھرا کر دیکھا تھا۔

ناک نقشہ، رنگ روپ تو سامنے تھا ہی۔ بس چینی کی گڑیا تھی نازک نازک چھوٹی موٹی۔ ہاں البتہ پاؤں قد وقامت کا لحاظ کرتے بہت چھوٹے تھے اتنے چھوٹے کہ نادو میاں اپنی دلہن کا جوتا خریدتے ہوئے شرماتے تھے۔ لیکن ان پیروں کے غیر معمولی چھوٹے ہونے کا نہ تو نادو میاں کو دکھ تھا اور نہ بی اماں کو، اور ویسے تو بیچارے نادو میاں کو کسی بات کا دکھ نہ تھا اور اگر دکھ تھا بھی تو وہ زبان پر کس طرح لاتے اس لیے کہ دلہن بی اماں کی پسند کردہ تھیں اور نادو میاں کی سعادت مندی خاندان بھر میں بے مثال تھی۔ بی اماں دیکھی تھیں کہ دلہن کی زبان بہت لمبی ہے اور دلہن کو پرکھتے وقت انھوں نے صرف چلا پھرا کر دیکھا تھا دو چار دن رہ بس کر نہیں دیکھا اور ان کے لیے وہی بات عذاب جان بن گئی جس کو انھوں نے نہیں دیکھا۔ وہ نادو میاں سے کچھ محجوب محجوب سی رہتیں۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ نادو میاں ابھی اس دنیا میں نئے نئے داخل ہوتے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھوں اور چوڑیوں کے چھناکوں میں ابھی ان کے لیے اتنا رس ہے کہ وہ دلہن کی دشنام طرازی میں صرف نزاکت آواز دیکھتے رہ جاتے ہیں ـــ لیکن بی اماں جہاں دیدہ تھیں انھیں یقین ہو چلا تھا کہ منقش اور چمکیلے کاغذوں سے سجی ہوئی زندگی کی یہ گاڑی بس چند روز اور چلے گی اور پھر اندر چھپی ہوئی لکڑی باہر نکل آئے گی جس پر بہت سی خراشیں ہیں بہت سے دھبے ہیں ـــ اور پھر پہیے بیٹھ جائیں گے یا جام ہو جائیں گے جس کی ذمہ داری دلہن کے چھوٹے پیروں پر نہ ہوگی بلکہ ان تمام باتوں کی ذمہ دار خود بی اماں ہوں گی ـــ

اور بی اماں کا دل بجھ جاتا اور وہ محسوس کرتیں کہ سارا خاندان ان پر انگلیاں اٹھا رہا ہے بی اماں کے تینوں بیٹوں میں ایک نادو میاں ہی تو تھے جن پر خاندان کی شرافت ناز کرتی تھی۔ تعلیم میں بھی یہ تینوں میں آگے تھے۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی نہ ان تینوں نے ضرورت محسوس کی اور نہ بی اماں کے لاڈ پیار نے انھیں اس کی اجازت دی ـــ اور

واقعی انھیں ضرورت بھی کیا تھی، اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ نادو میاں کے والد انتقال کر گئے تو صرف یہی ہوا کہ دروازے پر جھولنے والا ہاتھی نہ رہا۔ تھان پر بندھے ہوئے آٹھ گھوڑوں میں سے چھ گھوڑے فروخت کر دیے گئے۔ بگھیاں فروخت کر دی گئیں اور یہ سب کچھ بی اماں نے اپنی دانشمندی سے کیا کہ گھر کے اخراجات کم سے کم ہو جائیں۔ اس لیے کہ اب کمانے والا ہی نہ رہا تھا جس کی جوتیوں کے طفیل یہ سارا کرّوفر تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے نادو میاں کی شادی اس دھوم دھام سے کی کہ مرحوم شوہر کی شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا یہ اور بات ہے کہ نواب بیگم کی شادی کا مقابلہ نہ ہو سکا اور نہ بی اماں اتنا خرچ کرنے کو اب تیار تھیں۔ اس وقت مرحوم زندہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے بل بوتے پر کیا اور ایسا کیا کہ شہر کی گنی چنی شادیوں میں نواب بیگم کی شادی کا شمار ہوتا ہے اور لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں لیکن اب بی اماں سمجھ گئی تھیں کہ مرحوم کی عزت و آبرو کو قائم رکھنا ان کے اپنے ہاتھ ہے۔ دولت کا کیا ہے لٹاؤ تو پل بھر میں لٹ جائے، پیدا کرنے بیٹھو تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے مرحوم کی بات اور تھی ان کے باپ داداؤں نے جانیں قربان کی تھیں تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں تمول ورثے میں ملا تھا اور اب ان کی عزت بی اماں کے ہاتھ تھی۔ چاہیں تو سنبھال لیں چاہیں تو سر بازار نیلام کریں۔ اور اسی لیے بی اماں اپنے لاڈلوں کی شادی بیاہ کے مسائل میں بہت زیادہ محتاط تھیں۔ اس لیے کہ تمول کو قائم رکھنے کا اب ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔ بڑے گھر کے لڑکوں کو بڑے گھروں کی بیٹیاں ہی بیاہی جائیں تو سونا سونے کو کھینچے گا اور خاندان کی آن بان باقی رہے گی سو اسی لیے نادو میاں کے لیے انھوں نے متمول گھرانے کی اکلوتی بیٹی تلاش کی اور دلہن کو خوشی خوشی گھر لے آئیں۔ دلہن بھی اپنے ساتھ وہ سب کچھ لائی تھیں جو بی اماں کے خاندان کے شایانِ شان تھا اور جو کچھ دلہن لے آئی تھیں اس کو بی اماں نے

پہلے ہی ٹھوک بجا کر دیکھا تھا لیکن کچھ چیزیں دلہن نے گھونگٹ میں چھپا کر رکھ لی تھیں اور دلہن والوں نے بی اماں کی نظر بچا کر یہ چیزیں بھی دلہن کے ساتھ کر دیں کیوں کہ یہ دلہن کو ورثے میں ملی تھیں اور بچپن سے اس کے ساتھ ساتھ رہی تھیں لیکن جب دلہن نے گھونگٹ الٹا تو بی اماں بوکھلا گئیں اور بیچارے نادو میاں سہم گئے۔ اور بی اماں سمجھ گئیں کہ سونے چاندی سے لدی ہوئی اس گڑیا کے اندر بارود بھری ہوئی ہے جو آہستہ آہستہ دھماکے پیدا کر رہی ہے اور نادو میاں نیند میں چونک پڑتے ہیں۔

دلہن کی تنک مزاجی اور تلون سے پہلے پہلے تو بی اماں دکھی رہیں پھر آہستہ آہستہ خائف ہوتی گئیں لیکن وہ بھی آخر ساس تھیں کب تک اچھے خاصے گھر کو دوزخ بنتا ہوا دیکھتی رہتیں۔ وہ تو نادو میاں جیسے برخوردار اور نیک چلن بیٹے کی صورت تھی جو انہوں نے اپنے جی کو مار کر رکھ لیا تھا لیکن ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ زیادہ ستایا جائے تو آدمی خدا کو گالی دینے سے بھی نہیں چوکتا پھر یہ تو ٹھہریں بہو۔ بڑے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھیں تو بی اماں خاندانی لحاظ سے ان سے دو ہاتھ بڑھ چڑھ کر ہی تھیں۔ کمخواب کو ٹاٹ کا پیوند تو لگایا نہیں تھا جو دلہن والوں سے ان کی کچھ دبتی۔

ایک دن دلہن بہت برس رہی تھیں۔ بات صرف یہ تھی کہ دلہن کو شکرام میں سوار ہو کر تفریح کرنے کی سوجھی۔ نادو میاں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ فوری بہرے دار کو دوڑایا لیکن وہ کمبخت پتہ نہیں کہاں جا مرا۔ دلہن بناؤ سنگار کر چکنے کے بعد بھلا کب تک انتظار کرتیں کچھ طبیعت مکدر ہوگئی اور انہوں نے نادو میاں کو نشانہ بنایا۔ وہ چاہتی تھیں کہ دیر ہو رہی ہے تو نادو میاں خود شکرام لانے کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور بیچارے نادو میاں تھے کہ اس خیال سے ہی پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔ شرم دامن گیر تھی اور وہ بالکل حق بجانب تھے جس کے گھر پر ہاتھی جھولتا تھا جس کے آنکھ اٹھاتے پر بیسیوں ملازم دوڑ پڑتے تھے وہ

بھلا شکرام کے اڈے پر شکرام لانے کے لیے جائے۔ لیکن دلہن کی ضد کے آگے انھوں نے کبھی مسلح ہونے کا تصور تک ذہن میں آنے نہ دیا۔ وہ خود کو اس طرح تسلی دے لیتے تھے کہ دلہن بڑے ہی ناز و نعم میں پروان چڑھی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ دلہن کے والد جب گھر سے باہر جاتے تو بلا مبالغہ سات بار اپنی بیٹی کے چہرے پر سے اپنا سر اتارتے۔ اب جب کہ دلہن اتنے چاہنے والے باپ کی آغوش سے آئی ہیں تو نادو میاں کو ناز برداریاں کرنا ہی پڑیں گی۔ چنانچہ وہ آہستہ سے بی اماں کی نظر بچا کر باہر نکل گئے اس لیے کہ اگر یہ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچ جائے تو وہ بہت برہم ہوں گی کہ لو بھئی بڑے صاحبزادے نے کوٹھول پر آبرو گنوائی تو چھوٹے صاحبزادے گلی کوچوں کے ہو رہے۔ نادو میاں بھی محبت میں گھر کے صدر دروازے تک تو جا پہنچے لیکن اس سے آگے ان کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ سوچ کر انھوں نے سائیس کو دوڑایا اور خود وہیں انتظار کرتے دروازے کے پٹ پر پاؤں ٹکا کر تنگ مہری کے پاجامے کی چوڑیاں درست کرتے رہے۔ بی اماں کے منہ چڑھے خواجہ سرا کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح یہ بات جا پہنچی تھی کہ خود نادو میاں دلہن کی ضد پر شکراموں کے اڈے تک بھاگے گئے ہیں۔ کانوں میں بھنک پڑنے کی دیر تھی کہ خواجہ سرا نے حق نمک ادا کیا۔ دلہن سے سوکنا پے کا بیر تو تھا ہی کیوں کہ میاں خواجہ سرا چھٹپن ہی سے نادو میاں پر مرتے تھے۔ کھیلتے کھیلتے بس یوں ہی نادو میاں کو چمٹ چمٹ جاتے تھے۔ تنہائی میں سرکار اور دلدار کہہ کر پان کی گلوریاں پیش کرتے تھے۔ دیدے اور کمر مٹکا مٹکا کر نادو میاں کے قدموں میں بچھ بچھ جاتے تھے لیکن نادو میاں تھے کہ پتھر کی چٹان بنے ہوئے تھے۔ نہ کھل کر ہنستے نہ ہنس کر کھلتے۔ البتہ جب وہ اپنے بھائی جان کو خواجہ سرا کی کمر میں زور زور سے گدگدیاں کرتا ہوا دیکھتے تو دوسرے ہی لمحے ان کی نظریں گلبدن لوا کے اداس چہرے پر بھی پڑتیں جو بھائی جان کے حجرے میں دروازے کی اوٹ سے خواجہ سرا کے نخروں کو

دیکھ دیکھ کر سروالے کی طرح بل کھائیں۔ لیکن جب سے دلہن گھر کی زینت بنی تھیں میاں خواجہ سرا کو اس بات کی توفیق ہی نہ ہوتی تھی کہ وہ نادو میاں کی خدمت میں پان کی گلوریاں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے۔ اس دن نادو میاں نے صرف اتنا محسوس کیا تھا کہ میاں خواجہ سرا ان سے بہت کچھ کھچے رہتے ہیں اور ادھر گلبدن بوا ہیں اور ان میں اکثر تو تو میں میں ہوتی۔ آج میاں خواجہ سرا کو دلہن سے ناتہ پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو اس نے بی اماں پر بھرپور وار کیا۔ دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بی اماں کے قدموں میں جھک گیا اور لگا آنسو بہانے۔ انھوں نے شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر احوال پوچھا تو سسکیاں لیتے ہوئے نہایت ادب سے ان کے گوش گذار کیا کہ نادو میاں کو دلہن نے شکرموں کے اڈے پر بھیجا ہے وہ بہتیرا معذرت خواہی کرتے رہے لیکن دلہن کی ٹرٹراہٹ پر وہ باپ دادا کی ہڈیاں اکھاڑ پھینکنے سے بھی نہ چوکے۔ بی اماں کی آنکھیں بھی بھر آئیں ایک گرم لوہے کی سلاخ ان کو اپنے حلق سے سینے تک جھلستی ہوئی سی محسوس ہونے لگی اور وہ آنسو پینے کی کوشش کرتی ہوئی سیدھی دلہن کی چوکھٹ تک آ پہنچیں دلہن پہلے ہی سے منہ پھلائے تھیں بی اماں نے جلی کٹی سنائی تو وہ لگیں پھوٹ پھوٹ کر بین کرنے نادو میاں نے اندر قدم رکھا تو نقشہ بدلا ہوا پایا۔ بی اماں برستی رہیں۔ اجداد کی آبرو کے مٹ جانے کا ماتم کرتی رہیں اور دلہن نے میکے کا رخ کیا۔ نادو میاں بیچارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکر ٹکر دیکھتے رہ گئے۔ جس شکرم میں دلہن کو سیر کرانے والے تھے اسی شکرم میں بیٹھ کر دلہن میکے سدھاریں۔ جس گھر میں اپنی توہین ہوئی تھی اُس گھر کی بگھی اور گھوڑوں کا احسان اٹھانے کو وہ کیسے تیار ہوتیں۔ نادو میاں دھڑکتے دل کو تھام بھی نہ سکے۔ ان کے سینے کے اندر بچپن میں کھیلا ہوا ربڑ کا گولہ جیسے ٹپ ٹپ اچھلتا رہا لیکن ان کے ہاتھوں میں جیسے اس گولے کو پکڑ لینے کی سکت ہی نہ رہی۔ وہ چپ چاپ دلہن کو شکرم میں سوار ہوتا ہوا دیکھتے رہے سینے میں اچھلتے ہوئے ربڑ کے گولے نے جیسے اندر کے ٹھہرے ہوئے پُرسکون پانی کو اوپر

اچھالا۔ شکرم آگے بڑھی تو۔ سینے کے اندر اچھلتا ہوا پانی آنکھوں کے راستے پلکوں تک آپہنچا، اور ذرا سا رک کر آہستہ سے گالوں پر ڈھلک آیا لیکن دلہن نے اس طرف نظر اٹھانے کی زحمت تک نہ کی۔ شکرم ابھی ڈیوڑھی کے احاطے سے نکلی بھی نہ تھی کہ دروازے پر ایک بگھی رکی اور نادو میاں آہستہ سے برابر کے اصطبل میں کھسک گئے۔

بہت آہستہ سے پاشاہ بیگم نیچے اتریں تو ان کو سہارا دیتے ہوئے یاسمن بوا نے کہا کہ بٹیا اللہ نے تمھیں فرشتہ بنا کر بھیجا ہے دلہن بدمزاج سہی لیکن نادو میاں کی چہیتی تو ہیں۔ میں دوش بڑی بیگم صاحبہ کو نہیں دیتی سارا کیا دھرا دلہن کا ہی۔ نصیحت فضیحت بعد کو ہو گی بٹیا اب تو صرف خاندان کی لاج رکھنی ہے۔ یہی نام ہو گا کہ ذرا سا برا مان کر بہو نے گھر سے میکے کا رخ کیا تو کسی نے روکنے سمجھانے کی تکلیف بھی نہیں کی الٹے گھر سے نکال دیا اور وہ بھی کرائے کی شکرم میں پاشاہ بیگم سمجھ گئیں۔ پہرہ دار سے کہا کہ لپک کر بڑا پھاٹک بند کر دے اور خود بگھی میں سوار ہو گئیں۔ پھاٹک پر پہنچ کر شکرم رک گئی تو دیکھتے دیکھتے پاشاہ بیگم کی بگھی نے اس کو جالیا۔ دلہن سمجھیں بگھی میں نادو میاں ہوں گے لیکن پاشاہ بیگم برآمد ہوئیں تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ کہنے لگیں کہ اس قدر بے عزتی کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو تمھارے بھائی صاحب تو میرا منہ کالا ہوتا ہوا دیکھتے رہیں اور تم اس قید خانے سے نکلنے کے راستے مسدود کرتی پھرو۔ جس گھر میں ایروں غیروں کی حکومت ہو اس میں مجھ نصیبوں جلی کی لاج رہ چکی بس۔ کس منہ سے واپس لے جانے آئی ہو۔ بہتر تو یہی ہے کہ اپنے بھائی صاحب کو زریں مشوروں سے نوازو کہ وہ اپنی اماں کی پسند کی کوئی شریف زادی کر لائیں۔ اسلام میں چار نکاح جائز جو ہیں۔ اور پھر نکاح بھی کون ضروری ہے کسی کوٹھے پر سے چٹ پٹ کرتی بازارن کو اٹھا لائیں اور رنبیدیں چونکنے نہ دیں۔ اس کے اللّے تللّے سہنے میں لطف جو ہے۔ اماں بھی خوش رہیں گی۔ بڑے بھائی صاحب نے تو مثال قائم کر ہی دی ہے یہ بھی ان کے نقش قدم پر چلیں پھر نام بہت روشن ہو گا۔ اماں جان گھی کے چراغ جلائیں گی۔

پاشاہ بیگم کے ہونٹ سوکھتے رہے اور وہ زبان پھیر پھیر کر رہ گئیں۔ بڑے باپ کی بیٹی تو وہ بھی تھیں لیکن دلہن کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ سوچتی رہ گئیں کہ کیا کہا جائے کیا نہ کہا جائے۔ یاسمن بوا ابھی اس وقت تک چپ چپ خود کو سنبھالتی آ پہنچیں۔ پاشاہ بیگم پر نظر پڑی تو یاسمن بوا کے قدم جیسے زمین میں گڑے کے گڑے رہ گئے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ سر سے قدم تک کانپ رہی تھیں۔ یاسمن بوا نے جھٹ کر پاشاہ بیگم کو سنبھالا۔ سہارا دے کر بگھی میں سوار کیا اور تیکھی نظروں سے دلہن کو دیکھا تو دلہن نے چھپاک سے شکرم کی چلمن جھٹک دی۔ پاشاہ بیگم بگھی میں سوار ہو کر الٹی سیدھی سانسیں درست کر سکیں تو چلمن سے سر نکال کر پہرہ دار کو پھاٹک کھول دینے کا حکم دیا اور شکرم کی طرف منہ پھیر کر کہنے لگیں کہ اب یہ پھاٹک صرف رنڈیوں اور کسبیوں کے لیے ہی کھلے گا اور تم اپنے میکے میں اپنا اچار ڈلواتی رہو۔ دلہن نے جواب دینے کے لیے چلمن سے سر باہر نکالا تو بگھی نہایت اطمینان سے تڑ تڑ کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔

دلہن گھر پہنچیں تو بیتتے ہوئے دنوں کی فوج جیسے دروازے ہی سے نکل کر سامنے مارچ پاسٹ کرنے لگی۔

بکرا ذرا نحیف تھا۔ نواب جنگ اپنے خانساماں پر برہم ہوئے۔ داروغہ مطبخ نے آٹھ آدمیوں کے لیے پخت کی اور بارہ فقیروں کو کھانا کھلا دیا۔ فقیروں نے آدھا پیٹ کھانا کھا کر ہی رانی بیٹی کی صحت کے لیے پیٹ بھر کر دعائیں دیں لیکن یہ بات نواب جنگ کے کانوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی۔ اسی رات رانی بٹیا کا بخار ایک سو پانچ ڈگری تک جا پہنچا سو سو طرح کے وسوسے اور واہمے نواب جنگ اور بیگم کے دل و دماغ پر گدھوں کی طرح منڈلانے لگے۔ اکیس روپیوں کی ریزگاری منگوائی گئی اور رانی بٹیا کے سیدھے ہاتھ سے چھوا کر نواب نے اپنے سامنے غریبوں میں تقسیم کروا دی۔ عشاء کی نماز کے بعد نواب نے سجدے سے سر اٹھایا تو

بیگم نے دیکھا جانماز بھیگی ہوئی تھی۔ آدھی آدھی رات تک نواب آیت الکرسی پڑھ کر بیٹی پر پھونکتے رہے صبح ہونے تک بخار کم ہوا۔ صدقہ دینے بکرا منگایا گیا تو داروغہ مطبخ نے اس میں بھی اپنے نو عدد بچوں کا حصہ شامل رکھا۔ صدقہ اتار کر بکرا یتیم خانے کے حوالے کر دیا گیا اور داروغہ صاحب برطرف کر دیئے گئے۔ آج دلہن کے سامنے بیتے ہوئے دنوں کی فوج نے مارچ پاسٹ کیا تو انھیں فوجیوں میں سے ایک نے ان کے والد نواب جنگ کی ان سے بے پناہ محبت کی ایک تصویر ان کے سامنے سے گذار دی لیکن دلہن نے اس تصویر میں یہ کہیں نہیں دیکھا کہ بکرے کے ساتھ داروغہ جی اور ان کے نو عدد بچے بھی رانی بٹیا پر سے تصدق کر دیئے گئے۔

فرزانہ آپا دلہے والی تھیں پر اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ وہ ہمیں خاطر ہی میں نہ لائیں ابا بھلا میری توہین برداشت کر سکتے ہیں کبھی۔ "پاؤں میز" کا رسم آیا تو چاندی کے کنگن اور پازیب پر سونے کا ملمع تھا اور پھر مہر النساء کے ہاتھ پاؤں ہی کتنے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ دلہا میاں سے وہ قد میں کچھ نکلتی ہوئی ہی تھیں۔ اور پھر ویسے بھی مہرو کے آگے سلیم صاحب بس نام ہی کے شہزادے تھے۔ کہاں مہر النساء لندن کی بنی ہوئی اور کہاں جاپان کے سلیم میاں۔ ستر روپے کلدار میں ابا میاں نے "ٹاسے امپوریم" کو آرڈر دے کر مہرو کو منگوایا تھا۔ پارسل کھلا تو کس احتیاط سے مہرو رانی لکڑی کے ڈبے میں آرام کر رہی تھیں۔ تئیس چبیس روپے کے جاپانی سلیم صاحب سے مہرو کو بیاہتے وقت ہم نے فرزانہ آپا کی خاطر یہ تک نہ سوچا کہ مہرو اور سلیم کا جوڑ نہیں سلیم میاں تو بس نام کے شہزادے تھے۔ اس کے باوجود بھی ہم نے جہیز میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

"پاؤں میز" کی رسم دیکھی تو میری آنکھ سے آنسو ہی تو نکل گئے۔

جاپان کے سلیم میاں سے لندن کی مہرو بیاہ دوں اور اس پر سہیلیوں کے سامنے ملمع کی پازیب اور کنگن پہنا کر اپنی آبرو گنوا بیٹھوں۔

ابا میاں اس قدر برہم ہوئے کہ بس رشتہ ٹوٹ ہی تو رہا تھا۔ فرزانہ آپا نے

فراست سے کام لیا اور گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کر دی۔ ابا میاں تو اس پر بھی راضی نہ تھے گھوڑے جوڑے کی رقم میں کمی کی بجائے زیادتی بھی ہو سکتی تھی لیکن مہرو کی شادی میری شان کے مطابق ہونا ہی تھی۔

فرزانہ آپا نے مجھے پچکارا۔ سو بار تو چوما ہو گا میری پیشانی کو۔ بات اس قدر پکی ہو کر ٹوٹ جاتی تو بے عزتی کے سوا حاصل کیا ہوتا۔ میں نے بھی سوچا فرزانہ آپا اور میں کچھ جدا نہیں۔ ان کی بے عزتی میری بے عزتی ہے اور میں نے ہاں کر دی۔

پھر شادیانے بجے، شہنائیاں بجیں۔

پلکوں پر رکے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ دلہن بہت دل گیر ہو گئیں۔ جس کی گڑیا کی اتنی عزت تھی آج خود اس کی اس طرح توہین ہوئی۔

بیتے ہوئے ایام کی مارچ پاسٹ کرتی ہوئی فوج جانے کونسی کونسی تصویریں دلہن کے سامنے سے گذارتی رہتی لیکن شکرم صدر دروازے سے لگ گئی تو دلہن چونکیں۔ آج وہ کچھ اس طرح اپنے میکے آئی تھیں کہ کوئی خوش آمدید کہنے والا بھی دروازے پر موجود نہ تھا۔

شکرم کا دروازہ کھلا تھا کہ مراد خاں پہرہ دار کے پہلو سے دل آرام بوا سٹ پٹا کر اٹھیں تو یہ بھی بھول گئیں کہ مراد خاں نے ان کے دونوں ہاتھوں کو انھیں کے دوپٹے سے کس کر باندھ دیا ہے۔ دلہن پر نظر پڑی تو بس چیخ ہی تو نکل گئی منہ سے اور وہ چھلانگ لگا کر مراد خاں کی چوڑی چکلی پیٹھ کے پیچھے جا دبکیں۔

دلہن نے بھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔ طوفان بھلا کس کا انتظار کرتا ہے۔ دلہن کے سینے میں کتنے ہی طوفان بپھر رہے تھے بس وہ آنسو پونچھتی ہوئی دیوان خانے تک جا پہنچیں دل آرام بوا نے بھی نوچ ناچ کر دوپٹہ ہاتھوں سے الگ کیا اور الٹا سیدھا سینے پر ڈالتی ہوئی اندر بھاگیں۔ مراد خاں نے صرف اتنا سنا کہ بادلے کہتی میں نہ کہتی تھی کہ دروازہ

اندر سے بند کر لے۔ لیکن باؤلے کتے کو اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ جاتے جاتے دل آرام بوا کا کان اینٹھ گئی ہیں۔

دل آرام بوا نے دلہن کو بیچ صحن میں جا لیا۔ آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دشمنوں کا مزاج پوچھتی رہ گئیں۔ لیکن دلہن جیسے پکا پھوڑا بنی ہوئی تھیں کسی نے ہلکا سا نشتر لگایا اور پھوٹ بہیں۔ دل آرام بوا نے مزاج کیا پوچھا دلہن سسک سسک کر رونے لگیں۔ بڑی بیگم صاحبہ یعنی دلہن کی ماں غالباً غسل خانے میں تھیں دلہن کی آواز سنیں تو بس گیلے بال جھٹکتی ہوئی صحن تک آ پہنچیں اور دلہن بری طرح گرتے گرتے سنبھلیں۔ ماں نے سینے سے لگا لیا تو پھر کچھ نہ پوچھئے بیچاری دلہن کس کس طرح روئی ہیں۔ لپٹ لپٹ کر۔ پھر پٹک پٹک کر۔ بڑی بیگم صاحبہ پوچھتی رہیں اور جواب میں دلہن یہی کہتی رہیں کہ ایسے گھر میں میری شادی کیوں کی جہاں ایرے غیرے دل کے آگے میری سبکی ہوتی ہے۔

نواب جنگ نے تفصیلات سنیں تو بہت برہم ہوئے۔ ناشتہ کیا نہ دوپہر کو کچھ کھایا پیا۔ بے چین اور مضطرب دیوان خانے میں ٹہلتے ٹہلتے صوفے پر بیٹھ جاتے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوتے اور ٹہلنے لگتے۔ بیٹی کی بے عزتی ان کی بے عزتی تھی۔ چاہتے تھے کہ فوری انتقام لے بیٹھیں اور سمدھن کو وہ وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ عقل ٹھکانے لگ جائے ان کی ــــ لیکن بیگم نے اپنے نرم ہاتھوں سے ان کی غلالین کے کوٹ میں چھپی ہوئی پیٹھ کو سہلا سہلا کر انھیں ٹھنڈا کیا۔ دلہن نے خود اپنے ہاتھوں سے نواب جنگ کو کھانا کھلایا۔ کھا پی کر سنبھلے تو لائبریری میں جا بیٹھے بڑی بڑی شیشے کی الماریوں میں موٹی موٹی انگریزی خوبصورت کتابیں جمی ہوئی تھیں۔ جلدوں کی سنہری اور روپہلی تحریریں اپنی کرنیں لائبریری میں آنے والوں پر پھینکتیں اور انھیں طرح طرح سے رجھاتیں لیکن نواب جنگ سے لے کر ان کے ملنے والوں تک کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ ان کا مونس و غمخوار تھا تو صرف رحمٰن فراش تھا جو روزانہ الماریوں کے

شیشوں کو صاف کرتا اور کبھی کبھی ڈسٹر سے انھیں بھی گدگدا دیتا تو وہ جیسے باوجود اپنی ساری ناقدریوں کے رحمٰن فراش کی ممنون ہوجاتیں۔ رحمٰن فراش سمجھتا کہ نواب جنگ انھیں کتابوں کی بدولت آج اس درجہ پر ہیں۔ لیکن کتابیں کسی طرح بھی رحمٰن فراش سے نہ کہہ سکتی تھیں کہ نواب جنگ نے انھیں کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اور اب انھیں سلور فش (SILVER FISHES) کا ایک خاندان بڑھ رہا ہے۔ چاٹ رہا ہے۔ اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہا ہے اور بہت جلد نواب جنگ کے دماغ کی طرح وہ بھی اندر سے بالکل خالی خولی ہو جائیں گی۔

میز پر پہنچ کر نواب جنگ نے کاغذ سامنے کھینچا تو سمٹا ہوا غصہ دبے پاؤں ان کے دماغ میں اس طرح داخل ہونے لگا جس طرح ان کے اطراف پھیلی ہوئی شیشوں کی مقفل الماریوں کی سجی ہوئی خوبصورت کتابوں میں سلور فش داخل ہو گئی تھیں۔ نواب جنگ نے قلم اٹھایا اور نادو میاں کو ان کے آباد اجداد کو۔ ان کے خاندان کو سب کو ایک سانس میں نواز دیا۔

خط پہنچا کر ہرکارہ رسید لے آیا تو نواب جنگ کو سکون ہوا۔

کمرے میں مسہری پر اوندھے پڑے پڑے نادو میاں سوچتے رہتے کہ دلہن کو منا پھسلا کر کس طرح واپس بلایا جائے۔ ان کی خاموشی اور بے چینی کو سارا گھر کا گھر محسوس تو کرتا لیکن کوئی بھی کھلے بندوں ہمدردی نہ کرتا۔ سمجھوتے کے لیے عملی اقدام کرنے کی تو بات دور رہی۔ وہ بھی کسی سے کچھ نہ کہتے۔ روز صبح ٹوپی سر پر رکھ کر بی اماں کو آداب بجالاتے۔ بی اماں سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیتیں کہ سارے زمانے کی خوشیاں نادو میاں کے حصے میں آجائیں۔ لیکن نادو میاں یہ بھی نہ کہہ سکے کہ ان کی رہی سہی ساری کی ساری خوشیاں دلہن اپنے ساتھ لے گئی ہیں اور بی اماں نے ہی دلہن کو اکسایا ہے کہ وہ نادو میاں کو لوٹ لے۔ نادو میاں کے گھر والوں کی طرف سے پہل کرنے کو کوئی تیار نہ تھا۔ ایسے اقدام سے ایک تو بی اماں کی شکست تسلیم کرنی پڑتی دوسرے دلہن کی مزاج داریوں کو برداشت کرتے رہنے کا سلسلہ جاری

رہتا۔ بی اماں کے وقار نے کسی کو اجازت نہ دی کہ نادو میاں پر رحم کھائیں اور ان کی ننھی منی گڑیا کو منالائیں جس کی طراری اور تلون کے باوجود وہ اس سے محبت کرنے لگے تھے۔ دلہن والے اپنی جگہ برہم تھے کہ جب تک نادو میاں اپنے کیے پر پشیماں نہ ہوں اور معافی نہ مانگ لیں اور آئندہ سے دلہن کی شان میں ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کرنے کا تیقن نہ دلائیں۔ دلہن کبھی ادھر کا رخ نہ کریں گی۔ نادو میاں کی خاموشیوں اور اداسیوں کو دیکھ کر بی اماں نماز کے بعد دعائیں مانگتیں کہ اللہ پاک تو دلہن کو عقل عطا کر وہ جلدی آئے اور معافی مانگ لے۔

بی اماں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کے سمدھی نواب جنگ نے نادو میاں کو خط کے ذریعہ اس قدر نوازا ہے کہ اللہ میاں بھی بیچ بچاؤ کے لیے درمیان میں پڑتے تو بھی حاصل کچھ نہ ہوتا یا خود بی اماں یہ خط دیکھ لیتیں تو نماز میں دعائیں نہ مانگتیں۔

چھ مہینے کی طویل مدت تک نادو میاں تڑپ تڑپ کر گذارتے رہے۔ دلہن ان کی زندگی میں برقی رو کی طرح داخل ہوئیں ان کے دل و دماغ کو جیسے لمحے بھر کے لیے جھنجوڑا اور پھر غائب ہو گئیں

اندھیری رات میں ایک چھوٹے سے باغ کے تاریک گوشے میں ایک جگنو چمکا۔ نادو میاں بیچارے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آسمان پر بجلی چمکی اور چمک کر دو چار لمحوں کے لیے اپنی پوری تابانی کے ساتھ جیسے جامد ہو گئی۔ نادو میاں نے دیکھا تو بیچارے کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اب پتہ نہیں یہ وہ روشنیاں کہاں ہیں نادو میاں صرف پلکیں جھپکاتے رہ گئے ہیں۔

دل کے تاریک نہاں خانے میں جیسے نور تمنا کی ایک کرن لجاتی آئی۔ لیکن بی اماں نے دل میں ناچتی ہوئی اس ننھی سی کرن کو پکڑ کر نادو میاں کی زندگی کو بے نور کر دیا۔

نادو میاں کچھ اسی طرح سوچا کرتے۔

دلہن زیادہ دنوں نادو میاں کے ساتھ رہتیں تو بہت ممکن تھا کہ دلہن کے تعلق سے نادو میاں کے سوچنے کا انداز کچھ مختلف ہوتا۔ ابھی تو دلہن کی طراری، زبان درازی اور

تنک مزاجی میں بھی نادو میاں کے لیے کشش تھی۔

شربت کا گلاس بی اماں نے نادو میاں کے ہونٹوں سے لگایا۔ وہ ایک ہی گھونٹ لے سکے تھے کہ بی اماں نے گلاس ہٹا لیا کیوں کہ بی اماں کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی سمدھن نے اس گلاس میں کچھ کڑواہٹیں اور تلخیاں بھی ملا دی ہیں جس سے نادو میاں کا منہ خراب ہو جانا یقینی ہے لیکن نادو میاں نے صرف ایک گھونٹ پیا تھا اور ہونٹوں پر زبان ہی پھیرتے رہ گئے اور پھر اس میں ان بیچاروں کا قصور ہی کیا تھا۔ بالکل چھوٹے سے معصوم بچے کی طرح وہ شہد چٹانے پر چٹخارے لیتے اور کونین پلا دینے پر ابکائیاں، کونین کی شیشی کو زمین پر پٹک کر شہد کی شیشی کو ہاتھ میں تھام لینے کی سعادت مندی نے انھیں اجازت ہی نہ دی۔

گرما کی چھٹیاں ہوئیں تو نواب رمضان علی خاں گھر چلے آئے جو کئی سال سے اٹاوے میں اسی جماعت میں پڑھ رہے تھے جس جماعت میں شریک ہوئے تھے۔ چھوٹے بھائی کی آمد پر نادو میاں نے محسوس کیا کہ اتنی بڑی ڈیوڑھی میں ان کا کوئی غمخوار بھی ہے۔

گھر میں ذرا چہل پہل بڑھ گئی۔ گلبدن بوا دن میں تین بار صابن سے منہ دھونے لگیں۔ خواجہ سرا نے زردوزی کے کام کا لال دوپٹہ پھر نکالا۔ انجمن بوا کی بیٹی نے سوئیاں پونے والی سے ایک چھوٹا سا آئینہ خریدا جس کو نیفے میں اڑس کر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتیں گلبدن بوا برابر صابن سے منہ دھوتی رہیں اور انجمن بوا کی بیٹی دن میں دس بار اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر زلفیں سنوارتی رہی۔ البتہ بیچارے خواجہ سرا نے زردوزی کے کام کا لال دوپٹہ اتار پھینکا اور ہاتھ اٹھا کر کبھی گلبدن بوا کو کوسا تو کبھی انجمن بوا کی دختر نیک اختر کو بد دعائیں دیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔

نادو میاں اب چہل قدمی کے لیے کبھی کبھار بھائی کے ساتھ باہر بھی نکلنے لگے کبھی کبھی ناٹک اور سینما بھی دیکھنے لگے۔ شام کا تھوڑا سا وقت وہ رمضان نواب کے ہمراہ

اِدھر اُدھر گذار لیتے لیکن دن اور رات انھیں دلہن کی کمی بری طرح محسوس ہوتی اور بیچارے اداس ہو جاتے۔

ایک دن صبح ہی سے رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ نادو میاں بہت دل گیر تھے دن بھر بادل چھائے رہنے کی وجہ سے سارے ماحول پر اداسیاں مسلّط تھیں۔ لیکن نادو میاں کے دل پر تو گھٹائیں کچھ اس طرح چھائی تھیں کہ نہ کھلتی تھیں نہ برستی تھیں۔

کبھی ترنگ میں ہوتے تو نادو میاں بستر پر اوندھے پڑے عجیب عجیب حرکتیں کرتے رہتے۔ کبھی گلے پر چھری پھیر کر پھینکے ہوئے مرغ کی طرح تڑپ کر دو تین منٹ میں ٹھنڈے ہو جاتے۔ کبھی تکیوں سے چمٹتے۔ کبھی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے جیسے رضائی کے اندر تھر تھر کانپتے رہتے۔ کبھی اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرتے اور بہت سنجیدہ رہتے چپ چپ اوندھے پڑے ٹانگ ہلاتے رہتے۔ جانے کیا کیا ہوتا۔ نادو میاں بس رونے لگتے یہ بھی نہ سوچتے کہ بڑے بھائی جان کو ٹھٹے سے چو آنی جان کو چپکے سے اٹھا لائے۔ اس واقعہ پر راز کے بڑے موٹے موٹے پردے ایک عرصہ تک پڑے رہے لیکن جب بی اماں کو معلوم ہوا تو انھوں نے بھی مصلحتاً اس کو راز ہی رہنے دیا اور کچھ اس طرح اپنا رویّہ رکھا جیسے انھیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ کیوں کہ بی اماں نے سوچا کہ اگر یہ راز راز ہی رہے تو صاحبزادے پر کم از کم ان کا رعب تو رہے گا ورنہ یہ رہی سہی آن بھی جاتی رہے گی۔ لیکن بہت جلد صاحبزادے کو معلوم ہو گیا کہ بی اماں کے کانوں تک ساری باتیں پہنچ گئی ہیں لیکن انھوں نے اپنے رعب داب کی بقا کے لیے راز کا ایک پردہ چھوڑ لیا ہے۔

اس طرح دوسرے تو کسی نہ کسی طرح اپنے من کی کر لیتے لیکن نادو میاں بس ٹانگ ہلاتے اوندھے پڑے رہتے۔

لیکن آج انھوں نے ارادہ کر ہی لیا کہ ممّو میاں سے مدد لیں گے۔ کیوں کہ

رمضو میاں یعنی نواب رمضان علی خاں ہی اس بھری دنیا میں یکا و تنہا انھیں ہمدرد نظر آئے۔ چنانچہ انھوں نے رمضو میاں کو ہموار کر لیا کہ وہ ان کے خسر صاحب اور اپنی دلہن بھاوج سے ملیں۔ نادو میاں کی دکھی زندگی کا خاکہ کھینچیں اور دلہن کو لوٹ آنے کے لیے آمادہ کر لیں۔ نادو میاں نے رمضو میاں سے اس قسم کی بات بہت دل کڑا کر کے کی تھی لیکن بات ختم ہونے تک ان کی پلکوں پر دو چار قطرے کسی نہ کسی طرح چمکتے ہی رہے۔

رمضو میاں اپنی دلہن بھاوج اور ان کے والد نواب جنگ سے مل آئے لیکن نادو میاں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ نواب جنگ کی یہ بھی بدستور قائم تھی کہ ان کی بے عزتی ہوئی ہے اور اس توہین کا ازالہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ رمضو میاں کی والدہ خود اپنی غلطی پر نادم ہوں اور دست صلح دراز کریں۔ نواب جنگ نے رمضو میاں کو سمجھایا کہ یہ باتیں بڑوں ہی کے طے کرنے کی ہیں بچوں کو ان مسائل کے طے کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے رمضو میاں لوٹ آئے، تو نادو میاں کے لیے تو انھیں کچھ نہ ملا۔ البتہ دلہن کی مسکراتی ہوئی نظروں کو انھوں نے دل و دماغ میں چھپا کر رکھ لیا۔ شادی میں وہ شریک نہ ہو سکے تھے نہ دلہن نے انھیں دیکھا تھا نہ انھوں نے دلہن کو۔ نواب جنگ البتہ رمضو میاں سے واقف تھے۔ آج نواب جنگ نے دلہن کا ان سے تعارف کرایا تو رمضو میاں کو بیچارے نادو میاں کی بھیگی ہوئی آنکھیں یاد آئیں۔ وہ دلہن کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے رہے کیوں کہ ان آنکھوں کے پیچھے چھپے ہوئے آتشیں لاوے سے انھیں کچھ بھی مطلب نہ تھا۔ یہ آنکھیں اگر شعلہ بار ہوں بھی تو رمضو میاں تھوڑے ہی جھلس جائیں گے۔ ان شعلوں سے انھیں واسطہ نہ تھا وہ تو نادو میاں کے حصے کی چیز تھی۔ رمضو میاں تو صرف اس چمک سے ناتہ جوڑنا چاہتے تھے۔

رمضو میاں گھر لوٹے تو نادو میاں منتظر تھے۔ نادو میاں نے دلہن کے بارے میں ساری باتیں دریافت کیں گفتگو کے وقت وہ کیا کرتی رہیں۔ کچھ دبلی ہوئی ہیں یا موٹی ہوئیں۔

کچھ ان سے کہنے کے لیے تو دلہن نے نہیں کہا، وہ خاموش تھیں یا بہت ہنس رہی تھیں ــــ رمضو میاں نفی میں سر ہلاتے رہے اور نادو میاں کی اداسیاں بڑھتی گئیں۔

اس کے بعد رمضو میاں دلہن بھاوج سے ملنے کے لیے برابر جاتے رہے اور بہت جلد انھوں نے اس طرح آنا جانا شروع کیا کہ ان کی آمد ورفت کی خبر نہ نادو میاں ہی کو ہوتی اور نہ ان کے خسر کو۔

ایک دن نادو میاں کو غیر متوقع طور پر دلہن کی چٹھی وصول ہوئی۔ دلہن نے سو سو طرح ان کو لبھایا تھا۔ اپنے کیے پر پشیمانی اور شرمندگی کا اظہار کیا تھا۔ قسمیں کھا کر انھیں یقین دلایا تھا کہ اب ان کے بغیر زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ آخر میں دلہن نے ان سے رات کو چھپ کر ملنے کی خواہش کی تھی تاکہ نواب جنگ اور بی اماں کے غصے کو کم کرنے کا کوئی طریقہ سوچ سکیں۔ چٹھی ملی تو نادو میاں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی چٹھی پڑھتے پڑھتے آنسو پونچھ لیتے۔ کبھی ہنسنے لگتے۔ کبھی چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھ کر چٹھی کو آنکھوں سے لگا لیتے۔ کبھی ہونٹوں سے۔

رات کو جب دیوار پھاند کر دلہن سے ملنے کے لیے پہنچے تو ان کا عجیب عالم تھا۔ دل اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ فرط مسرت سے کانپ رہے تھے دلہن سے ملے تو دلہن قدموں میں بچھ بچھ گئیں۔ نادو میاں نے دل ہی دل میں اللہ پاک کا شکر ادا کیا کہ ان کی طویل بے قراری اور محبت نے آخرش دلہن کا دل موہ لیا۔ وہ تو بس باؤلے ہو رہے تھے کبھی دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ گھورتے رہتے۔ کبھی کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور آواز حلق میں اٹک جاتی تو دلہن کے سینے پر سر رکھ کر زلفوں سے کھیلنے لگتے اور آنسو چھپا لیتے۔ غرض کہ نادو میاں کو اس وقت ہوش آیا جب موذن نے فجر کی اذاں دی۔ اس رات نادو میاں نے جہاں دلہن میں بہت سی تبدیلیاں دیکھیں

وہیں یہ بھی دیکھا کہ ان کی صحت خراب ہو گئی ہے اور وہ بات کرتے کرتے اُبکائیاں لینے لگتی ہیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ دلہن آہستہ سے نادو میاں کے پہلو سے اٹھ کر کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے باہر چلی گئیں اور جب واپس ہوئیں تو ان کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ جو نادو میاں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس کے بعد نادو میاں اپنی دلہن کے پاس چھپے چوری ایک آدھ بار اور جا سکے لیکن کچھ ہی دن بعد جب کہ رمضو میاں اٹاوے کو لوٹنے کی تیاریوں میں تھے نادو میاں کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ دلہن حاملہ ہیں کیوں کہ نادو میاں چھپ چھپ کر اپنی دلہن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ نادو میاں نے اس خبر کو خاموشی سے سنا اور جا کر اپنے کمرے میں اوندھے پڑے کیا کیا سوچتے رہے۔ بات بی اماں کے کانوں تک پہنچوائی گئی تو بس ننھا ان کی آنکھوں کے سامنے کھیلنے ہی تو لگا۔ بی اماں گھر میں اس قسم کی رونق کے لیے ترس گئی تھیں۔ بیٹیوں کو اللہ رکھے بچے تھے لیکن وہ بی اماں کے گھر کی زینت بننے سے تو رہے۔ رہ گئے بڑے نواب سوان کے بچے تو بازار ہی کی رونق تھے۔ بی اماں نے نادو میاں کی چوری چھپی ملاقات کی بات سنی تو ساتھ ہی یہ بھی سنا کہ کوئی ننھی سی جان بھی اب اس گھر کے والی وارث کی حیثیت سے آدھمکے گی۔ ورنہ وہ دلہن سے ہار نہ مانتیں اور نہ نادو میاں کے لیے گھر کا نقشہ دوسرا ہی ہوتا۔ لیکن اب بی اماں اپنے دل کو نہ سنبھال سکیں اور جھٹ نادو میاں کو بُلا بھیجا وہ مقطع بنے ٹوپی پہن کر آئے اور نظریں نیچی کیے کھڑے ہو گئے تو بی اماں نے بہت شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ آج ہی دلہن کو گھر لانے جا رہی ہیں اور انھوں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ نادو میاں نے اپنے پر قابو پایا۔

دلہن گھر میں آئیں تو اب ان کے اللّے تللّے تھے۔ نئی نئی چیزیں ان کے لیے خاص طور پر پکوائی جاتیں۔ بی اماں نے حکم دے رکھا تھا کہ دلہن کی ہر بات، ہر خواہش پوری کی جائے

ان کو غصّہ نہ کرنے دیا جائے۔ ماں کی معمولی معمولی حرکتوں کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔ خود دلہن بھی ذرا غصّہ کم ہی کرتیں لیکن ان ساری باتوں کے باوجود نادو میاں پہلے سے زیادہ اداس رہنے لگے۔ بھٹکی ہوئی روح کی طرح ڈیوڑھی کے بیرونی حصے میں جو بالکل خالی پڑا تھا نادو میاں گردن جھکائے گھومتے رہتے کبھی گھنٹوں کونے میں بیٹھے رہتے۔ کبھی دلہن کے پاس جا بیٹھتے تو اس امید میں کہ کسی نہ کسی طرح دلہن سے کہہ سکیں کہ تم نے میرے سینے پر جو بہت بڑا پتھر رکھ چھوڑا ہے اس کو اپنے ہی ہاتھوں سے ذرا سا سرکا دو لیکن ایسی بات وہ دلہن سے نہ کر سکے اور دلہن ہی میں کہاں اس قدر ہمت تھی کہ وہ اس بوجھ کو ہٹا سکتیں۔

نادو میاں اندر ہی اندر پھنک رہے تھے۔ زبان کھولنا ان کے بس کی بات نہ تھی، عزت کا سوال تھا۔ سارے خاندان کی عزت کا۔ اور پھر ان کی اپنی انفرادی حیثیت بھی تو تھی۔ بات کھل جاتی تو نادو میاں پر کیا گذرتی۔ دلہن تو خیر عزت مند ہوتیں تو جیتی جاگتی مر جاتیں لیکن نادو میاں بھی تو زندہ درگور ہو جاتے۔ بات کچھ اس طرح ہی تو پھیلتی کہ بھئی نادو کی دلہن نے ——— نادو میاں کانپ کانپ جاتے — سو اسی لیے انھوں نے اپنے لب سی لیے۔ اپنے کمزور دل پر ایک بہت بڑی چٹان رکھ لی۔

ننھا پیدا ہوا تو شادیانے بجائے گئے۔ کپڑے تقسیم کیے گئے۔ مبارکبادیوں کے جواب میں شکریہ ادا کرتے کرتے نادو میاں کی زبان سوکھ گئی۔

وہ باوجود یہ سوچتے رہنے کے کہ بچہ ابھی تین ماہ بعد تولد ہونا چاہیے تھا، مبارک باد پر اس طرح شکریہ ادا کرتے جیسے رٹا ہوا طوطا ہر منٹ دو منٹ بعد شکریے کی رٹ لگائے۔
نادو میاں ننھا مبارک ہو، شکریہ . . . .

نادو میاں ننھے کا کیا نام سوچا ہے۔ شکریہ۔ نادو میاں آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ شکریہ نادو میاں، آپ پاگل تو نہیں ہو گئے، شکریہ۔ غرض کہ نادو میاں کچھ اسی طرح شکریہ شکریہ

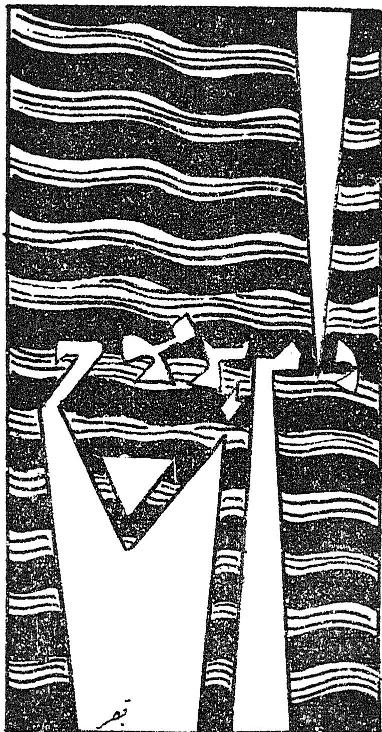
کہتے رہے۔ اگر انھیں مبارک باد کی بجائے کوئی گالی دی جاتی تو بھی وہ نہایت اطمینان سے مری ہوئی آواز میں شکریہ ادا کرتے۔

دلہن کا چلہ ہوا تو ننھے کا نام بھی اسی دن تجویز کیا گیا۔ نام رکھائی کے بتاشے تقسیم کیے گئے۔ سارا خاندان مدعو کیا گیا۔ دلہن کو سجا سنوار کر پھر دلہن بنایا گیا۔ بی اماں نے شہر کے سب سے بڑے فوٹو گرافر کو بلایا پوتے کو بیٹے کے گود میں دے کر بہو بیٹے کے ساتھ اپنی تصویر کھچوائی۔

—— اسی رات نادو میاں کچی نیند سے چیختے ہوئے اٹھے اور بے تحاشہ بھاگنے لگے۔ پکڑو پکڑو بھاگنے نہ پائے۔ میں جب تک زندہ ہوں دلہن کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ ان کی طرف آنکھ تک اٹھا نہیں سکتا۔ مگر اس کو پکڑو بھئی، پکڑ لو۔ وہ چھپ رہا ہے۔ وہ چھپ رہا ہے۔

مردانے دروازے کے قریب دھرے ہوئے تخت کو جس پر نوبت بجائی گئی تھی، وہ اندھیرے میں دیکھ نہ سکے اور ٹکرا کر اس پر گر پڑے، ایک مہیب چیخ ماری تخت کا کونا ان کے پیٹ میں دھنس گیا۔

اسی رات کو نادو میاں نے کفن اوڑھ لیا اور نہایت خاموشی سے چپ چاپ اپنی عزت و آبرو کو اپنے ساتھ لیے زمین کے اندر جا چھپے۔



باورچی خانہ کی چوکھٹ پر کھڑا علی احمد کھانستا رہا۔ اور اس نے بجھی ہوئی بیڑی بڑے پیار سے سلمیٰ پر دے ماری جو اس کی بکھری ہوئی لٹوں میں اٹک گئی۔

سرخ مرچیں ہانڈی میں ڈال کر سلمیٰ نے ہانڈی پر صحنک ڈھانک دی اور اپنا آنچل منہ میں ٹھونس لیا لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ علی احمد برابر کھانستا رہا۔ سلمیٰ نے صحنک ہٹا کر دو ایک سرخ مرچیں ہانڈی میں اور ڈال دیں اور اطمینان سے ٹھنسا ہوا آنچل منہ سے نکال کر ہنسنے لگی۔ چرر چرر کی آوازیں گویا دال کے بگھار کا پروپگنڈہ کر رہی تھیں اور اپنی کامیابی پر سلمیٰ قہقہے لگا رہی تھی۔ کیوں کہ علی احمد مسلسل کھانس رہا تھا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر رہے تھے۔ علی احمد جب کھانس کھانس کر نڈھال ہوگیا تو ہانڈی میں چرر چرر کی آوازیں ختم ہوگئیں اور سلمیٰ کی بے طرح پھیلی ہوئی باچھیں ذرا سا سمٹ گئیں اور اب لبوں پر صرف نیم نرم مسکراہٹ باقی رہ گئی، علی احمد کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ وہ جست لگا کر باورچی خانہ میں کود پڑا۔ سلمیٰ اٹھی اور ہرن کی طرح تڑپ کر ایک گوشے میں کھڑی ہوگئی۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے آگے کی طرف مزاحمت کے لیے

بڑھا دیئے اور بل کھا کر ہنستی رہی۔ اپنی دانست میں وہ جیسے سمجھ رہی تھی کہ مزاحمت کے لیے آگے بڑھتے ہوئے اس کے نازک ہاتھ کسی خونی شیرنی کے پنجے ہیں جنھیں دیکھ کر علی احمد جھجک جائے گا۔ لیکن علی احمد فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتا گیا اور وہ تڑپ کر صحن کی طرف بھاگی لیکن صحن میں پہنچتے پہنچتے تک اس کی اوڑھنی اس کے سینے پر سے سانپ کی طرح رینگتی ہوئی علی احمد کی مضبوط گرفت میں آ چکی تھی، اور اس نے نہایت اطمینان سے اس سانپ کو اپنی گردن میں لپیٹ رکھا تھا۔ سلمیٰ صحن ہی میں تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے صحن میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ بوڑھی دادی اماں پان کے بٹرے میں لونگ لگانے میں مگن تھیں۔ پھر یکا یک اس کی نظریں جھکیں۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے علی احمد اس سے انتقام لے رہا ہے۔ ہانڈی رسوئی گھر میں خاموش پڑی تھی لیکن وہ ابال وہ اتھل پتھل جو لمحہ بھر پہلے ہانڈی میں مرچیں ڈال کر سلمیٰ نے پیدا کر دی تھی کچھ ایسی ہی کیفیت علی احمد نے اس کے سارے بدن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ نہ سوچ سکی اور اس سے پہلے کہ دادی اماں کی نگاہیں پان کے بٹرے سے ہٹ کر اس پر پڑتیں وہ دبے پاؤں باورچی خانے میں پہنچ گئی تھی۔ علی احمد کی مضبوط گرفت میں اس کی ساری ہستی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے علی احمد اس کے جسم میں سرخ سرخ مرچیں بھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بگھاری ہوئی دال کی ہنڈیا کی طرح وہ بھی بالکل خاموش ہو رہی۔ علی احمد نے اپنی گرفت سے اس کو آزاد کیا تو اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ گالوں کو تھپ تھپاتے ہوئے علی احمد نے کہا کہ کان پکڑ کر کہتی جاؤ ــــ

"او بالم۔ آئندہ سے اس طرح دال نہیں بگھاروں گی کہ تم جو ہٹے کٹے نوجوان ہو میرے سامنے بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگو۔"

لیکن سلمیٰ نے کہا کہ

"او بالم۔ روزانہ اسی طرح دال بگھاروں گی کہ تیری کڑیل جوانی کھاتے کھاتے میری نظروں کے سامنے بوڑھی ہو جائے۔"

سلمیٰ نے یہ باتیں علی احمد کی پہنچ سے باہر ہو کر کہی تھیں اور وہ اب صحن میں تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر اور سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب کی بار علی احمد نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے زبان چڑانے پر ہی اکتفا کیا۔

امرود کے درخت کی ایک پتلی سی ٹہنی کو ہاتھ سے چھو کر سلمیٰ نے بھی احمد کو اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گیا کہ آج ٹھکے کا جواب اس کو اس چھڑی سے ملے گا اور آج سلمیٰ ہار جائے گی تو جیت اسی کی رہے گی۔

آج سلمیٰ بہت خوش تھی۔ ننھی کو ہاف بائلڈ انڈا کھلانے کے بعد اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑا انعام حاصل کر لیا ہے۔ وٹامن سے بھرپور انڈا جس کی تعریف میں گوالیار پولٹری فارم کے مالک نے سلمیٰ کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی تھی۔ اس نے حساب جوڑ کر کہا تھا کہ ایک مرغی واقعی ایک سال میں سونے کا ایک انڈا ضرور دیتی ہے اس کے تجربے میں بوڑھیوں کا یہ مقولہ سو فیصد بلکہ ایک سو پانچ فیصد صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس نے قفس میں پھرتی ہوئی سفید مرغیوں کو اور بروڈر میں پھدکتے ہوئے ننھے ننھے چوزوں کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا لیکن سونے کا انڈا پیدا کرنے والی یہ ننھی منی چلتی پھرتی خوبصورت مشینیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ فی الوقت تو اس کو روزانہ صرف ایک انڈا چاہیئے تھا۔ وٹامن سے بھرپور ایک سیلڈ شیشی جسے بقول مالک گوالیار پولٹری فارم اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے سیل کیا تھا۔ اونلی وٹامن (ONLY VITAMIN) نوڈاوٹ فل آف وٹامن ـــ (NO DOUBT FULL OF VITAMIN) صرف دو آنے میں

لیکن روزانہ صرف دو آنے کا چکر سلمیٰ کے لیے بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر نے بڑے پیار سے ننھی کے ملائم گالوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا "اس کو کچھ بھی تو بیماری نہیں ہے بس ذرا سی کمزور ہے بے بی۔ مگر بہت جلد پاؤں پاؤں چلنے لگے گی۔ سردیاں شروع ہو رہی ہیں۔ روزانہ ایک ہاف بائلڈ انڈا دے دیا کرو" اور اس طرح سلمیٰ نے سر ہلا کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا جیسے انھوں نے ننھی کو میٹھا ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے کہا ہے یا پھر انڈے بھی تو نلکی کھول کر بالٹی لگا دینے سے لبالب بالٹی میں بھر جاتے ہیں۔

ننھی کو سینے سے چمٹاتے ہوئے وہ بچوں کے وارڈ کی سیڑھیاں اترنے لگی تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں گھس آیا۔ اللہ میاں نے ماں کی دونوں چھاتیوں میں دودھ ہی دودھ بھر دیا ہے۔ ایک طرف انڈے کی زردی اور سفیدی بھر دیتے تو ـــــ اس نے ننھی کو سینے سے چمٹا لیا تھا۔

راستے بھر سلمیٰ سوچتی رہی۔ روز آنہ وہ کس مد سے نکال سکتی ہے۔ فوری اس کو ایک ترکیب سوجھی کہ گھر کے اجالوں کو ننھی پر سے قربان کر دیا جائے یعنی رات کو گھر کی لائٹ بہت کم جلائی جائے اور لائٹ کے بل کی بچت سے ننھی کو انڈے کھلائے جائیں۔ لیکن ننھی اُس کو اندھیروں میں رینگتی نظر آئی اور اپنے اس خیال سے گھبرا کر اس نے پھر ننھی کو چوم لیا۔ اس کو ننھی ہی کے لیے روشنی کی بھی ضرورت تھی۔ وہ سارے گھر میں رینگتی پھرتی۔ نئی نئی آوازیں نکالتی۔ ہونٹوں سے پھُر پھُر کرتی گھر بھر کی چیزیں ٹٹورتی پھرتی۔ سوئچ پر ہاتھ رکھ کر سلمیٰ ننھی کو دیکھا کرتی۔ کھٹکا دباتے ہی سارا ماحول منور ہو جاتا اور ننھی کا چہرہ پورے چاند کی مانند کھل اٹھتا۔ سلمیٰ کو یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ساری روشنیاں اسی ہنستے ہوئے ننھے منے چہرے کی یہ دولت ہیں ـــــ منٹ دو منٹ کے لیے فیوز ہی اڑ جاتا تو ننھی ہنگامہ برپا کر دیتی ـــ میاں علی احمد

لاکھ سمجھاتے "ننھی میں تیرا بابا ہوں"۔ سلمیٰ کہتی "ننھی یہ رہی میں تیری امی"۔ لیکن ننھی کو جیسے اندھیروں سے نفرت رہے وہ اپنے بابا اور امی کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اس کا ایک ہی مطالبہ رہتا۔ رات ہوتی ہے تو بابا اور امی کے ساتھ روشنی بھی چاہیئے۔

لہٰذا سلمیٰ سوچتی رہی۔ لائٹ کے بل سے وہ کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔ ننھی کو اندھیروں سے نفرت ہے۔ ننھی کو اجالوں سے پیار ہے اور اس نے سوچا کہ ننھی مستقبل کی نقیب ہے تو وہ اجالوں سے پیار کرے گی ہی۔

گھر پہنچتے پہنچتے اس نے مہینے بھر کے سارے اخراجات کا جائزہ لیا۔ زندگی کی ہر ضرورت نے اپنی اہمیتوں کو اس پر واضح کیا۔ وہ بالکل اسی طرح ہر ضرورت کی منت سماجت کرتی رہی جیسے ساری کی ساری ضرورتیں مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں ــــ اناج اور غلہ کی شہزادی سے اس نے بہت انکسار سے کہا کہ بھئی تم کچھ کمی سے مہینہ بھر کے لیے راضی ہو جاؤ۔ لیکن اس کو بالکل ٹکا سا جواب مل گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے سفید سفید چاولوں کی قاب، پھولی ہوئی چپاتیوں کی پلیٹ اور بگھاری ہوئی دال کا کٹورا سب کے سب اس سے گلہ شکوہ کر رہے ہیں کہ بھئی تم نے ہمیں گوشت کی بوٹی بوٹی کے لیے ترسا دیا۔ علی احمد گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ دستر خوان پر گوشت ہوتا ہے تو وہ مزے لے لے کر ہمیں سراہتے ہیں۔ لیکن تم نے ہمیں تعریف و توصیف کے قابل ہی نہ رکھا۔ اب تو وہ بیچارے اس طرح زہر مار کرتے ہیں جیسے نہ کھانے پر انھیں سزا بھگتنی پڑے گی۔ دال کے کٹورے نے بڑھ کر کہا کہ بھئی ہم نے تمھارے پاس سوائے سرخ مرچوں کے اور کچھ نہ دیکھا۔ یہ دال ہمیشہ کی دال ہی رہی کبھی دالچہ نہ بن سکی۔ اب ہمارے لیے باقی ہی کیا ہے جو تم اس میں سے بھی بچت کی سوچ رہی ہو۔ سلمیٰ بدقت مسکرا سکی۔ اس نے ننھی کو پھر چوما۔ ننھی کے سر سے سرکتی

ہوئی منکی کیاپ کو برابر کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن اس کا ذہن اس کو او ننھی کو سڑک پر چھوڑ کر پلک جھپکتے تک گھر کے کمرے کے ایک گوشے میں دھرے ہوئے صندوق تک جا پہنچا۔ لیکن صندوق بھی تو آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ سلمیٰ کی دو تین ساڑیاں۔ علی احمد کے ایک دو قمیص اور پتلون۔ ان ساڑیوں اور قمیصوں نے جیسے اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ سلمیٰ بی بی تم ہمیں گھر میں بھی تو دھو سکتی ہو ـــــ دیکھو نا ـــــ اب ہم میں اتنی سکت ہی کہاں رہ گئی ہے کہ تمھارے دھوبی کے مظالم سہہ سکیں۔ بڑی بے دردی سے وہ ہمیں پتھر پر پٹک پٹک کر چھانٹتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو تو ہمارا کیا حال ہو گیا ہے تم اگر اسی طرح ہمیں گھاٹ گھاٹ کی ہوا کھلواؤ گی تو تمھاری یہ حسرت بھی دل ہی دل میں رہ جائے گی کہ تم کتر بیونت کے ہمیں ننھی کے خوبصورت فراکس میں تبدیل کر سکو۔ بس بھئی، آج سے ہم تمھارے نرم ہاتھوں ہی سے اشنان کریں گے اور پھر اس طرح تمھارے ماہانہ چار روپے بھی تو بچ سکتے ہیں ـــــ بات سلمیٰ کی سمجھ میں آ سکتی تھی وہ کھل کر مسکرائی اور اس نے طے کر لیا کہ آئندہ وہ دھوبی کو جواب دے دے گی۔

وہ گھر پہنچی تو ولی محمد لانڈری والا اس کا منتظر تھا۔ ولی محمد کی ویسے کوئی لانڈری نہ تھی۔ وہ کپڑے دھو کر خود گھر گھر پہنچاتا پھرتا۔ خود نہ جا سکتا تو اس کی بیوی یہ کام کر دیتی لیکن اپنے نام کے ساتھ اس کو دھوبی کا استعمال گوارا نہ تھا۔ وہ جب بھی کسی کے گھر جاتا تو کہلا بھیجتا کہ ولی محمد لانڈری والا آیا ہے۔ کبھی کبھی زیادہ خوش رہتا تو کہتا ولی محمد لانڈری والے آئے ہیں۔ لانڈری کھول بیٹھنے کی حسرت اس کے دل میں بہت زمانہ سے تھی۔

سلمیٰ پہنچی تو ولی محمد لانڈری والے نے اس کو جھک کر سلام کیا۔ ولی محمد کی غیر متوقع آمد پر سلمیٰ سٹپٹا سی گئی جیسے اس کے فیصلے کی اطلاع ولی محمد کو ہو گئی ہو۔ لیکن اس

نے نوری خود کو درست کر کے ولی محمد سے پوچھا "تم کس طرح آدھمکے ہولانڈری والے سیٹھ۔ آج کپڑے لے جانے کی تاریخ بھی تو نہیں ہے۔" لیکن ولی محمد بجائے اس کے کہ کچھ جواب دیتا، ننھی پر نظریں جمائے رونے لگا۔ سلمیٰ نے دلجوئی کرتے ہوئے سبب پوچھا تو اس نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا کہ بی بی جی میرا بچہ شدید بیمار ہے۔ دواخانہ میں شریک کر کے گھر گھر پھرتا رہا۔ ہر جگہ سے مایوس ہو چکا تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ اس بار میری تنخواہ پیشگی دے دیجئے بی بی اور دعا کیجئے کہ میرا لال جلد اچھا ہو جائے۔"

سلمیٰ کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی۔ وہ زبان تک نہ کھول سکی۔ کچھ سنبھل کر اس نے آنسو چھپاتے ہوئے کہا، فکر نہ کرو ولی محمد تمھارا ننھا بالکل اچھا ہو جائے گا۔ اس کے آگے کچھ کہنے کی سلمیٰ میں ہمت نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ پچھلے پاؤں واپس لوٹ گئی پڑوس سے دو روپے قرض لاکر اس نے ولی محمد کو دے دیئے اور نہایت ہی لجاجت سے کہا ۔۔۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہ مل سکا ولی محمد تم تو جانتے ہو تنخواہ کے لیے ابھی دس دن باقی ہیں لیکن تم فکر نہ کرنا۔ وہ آتے ہی میں انتظام کر کے انہیں کے ہاتھ تمھارے گھر بھجوا دوں گی۔" ولی محمد نے کچھ اس انداز سے سلمیٰ کو دیکھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی زبان صاف پڑھ سکے اور سلمیٰ نے اس کی آنکھوں کے پیام کو سمجھ کر کہا کہ میں تمھیں تمھارا حق ہی تو دے رہی ہوں، اس میں شکریہ کیسا، مہربانی کیسی۔"

ولی محمد جا چکا تو سلمیٰ نے محسوس کیا کہ ننھی کی انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سلمیٰ خوش تھی اور اس نے طے کر لیا تھا کہ ولی محمد کی علیحدگی سے ننھی کو انڈے مل سکتے ہیں تو پھر ننھی کو انڈے نہیں ملیں گے لیکن ڈاکٹر نے گویا اس کے دل کے قریب نشتر چبھو کر یاد دلایا کہ ننھی بہت جلد پاؤں پاؤں چل سکتی ہے اس کو صرف ایک انڈا روز کھلا دو۔

علی احمد گھر آیا تو سلمیٰ نے اس کو کپڑے بدلنے نہ دیئے ولی محمد کے لیے سلمیٰ کی بے چینی سے علی احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے بڑی محبت سے سلمیٰ کے گالوں پر چپت لگاتے ہوئے کہا کہ میں ابھی انتظام کیے دیتا ہوں لیکن تم ان گہری نیلی جھیلوں میں ڈوبنے سے تو مجھے بچالو۔ سلمیٰ مسکرائی تو علی احمد نے اپنا رومال اس کی چھلکتی آنکھوں پر رکھ دیا ــــــ

علی احمد ولی محمد کے پاس چلا گیا تو سلمیٰ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ننھی کو چارپائی پر لٹا کر لوری دیتے ہوئے وہ خالی خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ اس کی آواز بڑی میٹھی اور بڑی سریلی تھی۔ وہ جب کبھی گنگناتی یا ننھی کو لوری دیتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود گیت بن گئی ہے۔ وہ اسی طرح گیت بن کر فضاؤں میں تیرتی پھرتی ــــ سُروں کے مدوجزر کے سہارے وہ ماضی، حال، مستقبل کے سارے فاصلے طے کرلیتی۔ وہ مست ہو کر گنگناتی رہتی اور اس کی گوری انگلیاں ننھی کے گھنے کالے بالوں میں کنگھی کرتی رہتیں اور اس کے حلق سے نکلتی ہوئی سریلی آواز ماضی کے دھندلکوں میں اُجلی اُجلی کرنیں بکھیرنے لگتی۔

میری بٹیا تو نغموں کی جان ہے۔ اس قدر خوبصورت گلا خوش نصیبوں کا ہی حصّہ ہے، میری اچھی بیٹی چلو بھئی اس طرح نہیں شرماتے اچھے بچّے ــــــ ہاں ہاں اچّھا سا چھوٹا سا بکس لادیں گے۔ بھئی سب لادیں گے لیکن ہمیں اس طرح شرمانے والے بچے پسند نہیں۔ اب گائے گی میری رانی۔ اچھا بھئی نور جہاں کا بدلی والا چاند ہی سہی ــــ تو کونسی بدلی میں۔

بس ایک اور ــــ ایک ہی ۔ اب نہیں ستائیں گے تمھیں ــ لتا کا ــــــ

سلمیٰ نغمات کی شہزادی تھی خاندان بھر میں دھوم مچاتی رہی۔ نغموں کے سہارے اس

نے اپنی امی سے اپنی ضدیں منوائیں۔ چھوٹا سا بکس۔ نئی نئی اوڑھنیاں۔ اور یہ ضدیں چاکلیٹ کے ڈبوں سے لے کر سینٹ کی شیشیوں تک پوری کی گئیں۔ دادی اماں اداس ہوئیں تو جھٹ پٹ بلائیں لے کر سلو کو اپنے پاس بٹھالیا۔ کچھ بھی سنا دے میری اماں بس تو گنگنا دے ذرا اور سلمیٰ نے گنگنا کر دادی اماں کو ماضی کی حسین یادوں کی وادیوں میں پہنچا دیا۔

عقیقہ ہو رہا ہے۔ ممتاز دلہن کے بچے کا لیکن سب کی نظریں تھیں سلمیٰ بٹیا پر۔ چچی اماں، پھوپھی اماں، بڑی بہنیں سب کی سب پیش بندیاں کر رہی ہیں۔ طرح طرح سے سلو کو رجھا رہی ہیں۔ اس محفل میں سلو گائے گی نہیں تو پھر ممتاز کبھی بات نہیں کریں گی اس سے۔ خوشی کی محفلوں میں گانے سے انکار نہیں کرتے بھئی۔ بری بات سمجھی جاتی ہے اور سلو کچھ شرما کر کچھ اترا کر گانے لگتی تو سب کے سب اس کو گھیر لیتے۔

سلمیٰ جب اپنی ہم عمر سہیلیوں کی جھرمٹ میں ہوتی تو اس کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا۔ کوئی کچھ فرمائش کرتی کوئی کچھ فرمائش کرتی کوئی کچھ کہتی۔ وہ سب کی فرمائشیں یکے بعد دیگرے پوری کرتی۔ اپنی ہم جولیوں میں بیٹھ کر تان اڑاتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا کہ وہ بڑی گلوکار ہو گئی ہے اور واقعی کھل کر بے جھجک گانے کی وجہ سے اس کی آواز میں بڑی پختگی پیدا ہو جاتی۔ اپنے سے بڑوں کے آگے وہ اس طرح اپنے فن کا مظاہرہ نہ کر پاتی۔ جس کا اس کو بعض وقت رنج بھی ہوتا اور وہ گا چکنے کے بعد سوچتی کہ میں نے اتنا اچھا نہیں گایا جتنا اچھا میں گا سکتی ہوں لیکن اب کی میں بے جھجک گاؤں گی ۔۔ اس کی امی کہتیں کہ تم اس طرح ہمیں گا کر سناؤ جس طرح اپنی سہیلیوں میں گاتی ہو تو ہم تمھیں بہت عمدہ سنگار دان لا دیں گے بالکل دلہن باجی کے سنگار دان کی طرح۔

آخر ایک دن امی کے اصرار پر سلو نے جی کڑا کر کے ایسا گایا کہ دوسرے دن اس کو

سنگار دان مل گیا۔

ننھی کے کالے کالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلمیٰ گنگنا رہی تھی۔

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا

ننھی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے تھے۔ آج وہ اپنے نغموں کی آگ میں خود جل رہی تھی۔ اور اس کا ذہن آ کے بچپن کے سہانے ایام کی تصویرکشی میں مصروف تھا۔ وہ سوچ رہی تھی ــــ کیسے بے فکری کے دن تھے وہ بھی۔ ہر خوشی حاصل تھی، ہر تمنا کی تکمیل ہو جاتی تھی۔ ان نغموں کے سہارے اس نے دلوں کو موہ لیا تھا۔ اس کی آواز کی نغمگی نے ساری زندگی کو نغمہ بنا رکھا تھا۔ کاش میری ننھی بھی ان دنوں ہوتی۔ یوں تو آج بھی میں اپنی آواز سے سب کو مسحور کر سکتی ہوں۔ خاندان بھر میں آج بھی سب کے دلوں میں میرے لیے اتنا ہی پیار ہے آج بھی میری امی مجھے چوم چوم لیتی ہیں، آج بھی میرے ابا میری پیشانی پر اسی طرح بوسہ دیتے ہیں۔ آج بھی مجھے ان سب کا پیار حاصل ہے لیکن اس کے باوجود آج زندگی میں کتنی جراحتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ آج میرے نغمے اپنے ابا اور امی سے ان کی ننھی ننھی کے لیے انڈا بھی تو انعام میں حاصل نہیں کر سکتے۔ آج میں گاتی ہوں تو امی کے کانوں میں گرامفون بجنے لگتا ہے جسے ابا نے بڑے چاؤ سے ساڑھے تین سو روپے میں خریدا تھا۔ اور جو صرف ستر روپے میں ایک سیٹھ کے پاس رہن ہو کر ڈوب گیا ــــ ان ریکارڈوں پر تھرکتی ہوئی سوئیاں جن کو بار بار بجا کر میں گیتوں کی لے سے لے ملاتی ننھی آج خود میرے کلیجہ کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور پھر کیا کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی کا سارا حسن، ساری خوبصورتی ــــ کیا اسی لیے آج خود میرے کان میری اپنی آواز کے لیے تو نہیں ترس رہے ہیں۔

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا

ننھی کی خوبصورت آنکھوں میں نندیا چپکے چپکے اس طرح آ گئی جس طرح چاند دبے پاؤں چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور سلمٰی کی آنکھوں سے دو تین چمکدار موتی اس طرح اس کے دامن میں گر کر کہیں غائب ہو گئے جس طرح جگ مگ کرتے ستارے ٹوٹ کر گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن کہاں گرتے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

دو مانوس ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ بچپن اور دوشیزگی کو بہت پیچھے چھوڑ کر پلک جھپکنے تک وہ ایک ہی لمحہ میں پھر اپنے حال سے چمٹ گئی۔

یہ کیا ہے سلمٰو۔ علی احمد نے اپنی بھیگی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا لیکن ان ہاتھوں کا سہارا پا کر سلمٰو کی آنکھوں نے علی احمد کے قدموں پر سارے موتی لٹا دیئے۔ اور علی احمد نے پلکوں سے ان موتیوں کو چن کر اپنے دامن دل میں چھپا لیا۔

جب سلمٰی کا آنچل اور علی احمد کا گریبان نم ہو چکا تو علی احمد نے تھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ سلمٰو۔ دیکھو نا۔ بات کس قدر معمولی ہے اور ہم کس قدر جذباتی ہیں۔ مجھے بعض وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی بہت بڑی گنبد میں کھڑی ہوئی مجھے پکار رہی ہو لیکن میں تمہیں جواب دینے کی بجائے تمھاری آواز بازگشت بن گیا ہوں۔ دو دلوں کا اس قدر ایک ہو جانا کس قدر خوبصورت سانحہ ہے۔ تم روتی ہو تو تمھارے آنسو پونچھ دینے کی بجائے میں تمھارے ساتھ رونے لگتا ہوں۔ اس طرح تو زندگی زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔

وہ مسکرانے لگا۔ کم سے کم سلمٰی نے تو یہی دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس نے سلمٰی کی بانہہ میں چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ لاؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ وہ ترکیب سوجھی ہے کہ بس طے سمجھو۔ کل سے صاحب سگریٹ نہیں پئیں گے۔ بیڑی پئیں گے۔ بیڑی پیتے ہوئے انھیں

ذرا شرم آئے گی اس لیے دفتر میں وہ اسموکنگ نہیں کریں گے۔ اسموکنگ کا پروگرام گھر پر ہی ہوگا اور ننھی انڈا کھائے گی۔

اور آج ننھی نے انڈا کھالیا تھا۔ سلمٰی اسی لیے بہت خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ آج زندگی میں پہلی بار علی احمد کو بیڑی پیتا ہوا دیکھ کر بھی اس کے دل پر کچھ نہ گزری۔ علی احمد نے بیڑی کا ایک لمبا کش کھینچا تو پھر دوسرا کش نہ لے سکا۔ سلمٰی سے چھالیہ کا ٹکڑا مانگ کر منہ میں ڈالتے ہوئے دوسرا کش لینے کے لیے جب اس نے بیڑی کو باچھوں میں دبایا تو سلمٰی نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔ علی احمد چاہتا تھا کہ سلمٰی اس سے ہمدردی کرے۔ ننھی کے لیے کم سے کم اس کے جذبۂ پدری کو سراہے لیکن ننھی انڈا کھا چکی تھی اور سلمٰی نے اپنے اطراف مسرتوں اور خوشیوں کا ایک ایسا جال سا بن رکھا تھا جس کے خول کو کوئی حادثہ، کوئی سانحہ اس وقت نہیں توڑ سکتا تھا۔ علی احمد نے سلمٰی کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ گلستاں بنا ہوا تھا اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اس کے بدن کا رواں رواں جیسے رقصاں تھا۔ آج اس نے نئی دنیا بسا رکھی تھی جہاں اس کو ہر چیز حاصل تھی، جہاں اس کا ہر قدم منزل تھا۔ علی احمد کی نظر برآمدے میں رینگتی ہوئی ننھی پر پڑی تو اس کو سلمٰی پر بے اختیار پیار آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سلمٰی کی اس بے پناہ مسرت میں زندگی کے سارے انسانی جذبے شامل ہیں۔ یہ خوشی جہاں ننھی کے لیے ماں کی مامتا ہے وہیں اس کے لیے بے اندازہ محبت کا مظہر بھی ہے کیونکہ سلمٰی نے مصیبتوں کو شکست دے کر زندگی سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

اس نے سلمٰی کو چپت لگاتے ہوئے کہا کہ سلّو تمھاری بٹیا نے انڈا کھالیا ہے تو تم سمجھ رہی ہو کہ میرا پیٹ بھی بھر گیا ہے۔ آج اس قدر خوش ہو کہ ہمارے ناشتے کی بھی فکر نہیں سلمٰی نے بہت محبت سے علی احمد کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ آج یہ پیٹ بھی صرف خوشیوں سے بھر گیا ہے، اسی لیے تو تم نے بیڑی کو بہت شان سے دانتوں

میں دبا رکھا ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغ مسلّم کھا کر موٹا سا ڈکار پیتا ہے۔

اور اب پلاؤ اور مرغِ مسلّم کھا چکنے کے بعد علی احمد رسوئی کے پاس کھڑا ہوا دال کے بگھار سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

پلاؤ اور مرغ مسلّم کھا چکنے کے بعد میاں علی احمد کے لیے بگھاری ہوئی دال اور گرم گرم چپاتیوں کے انتظام میں سلمٰی مصروف ہو گئی تھی۔

بی اماں اپنے آخری بیڑے میں آخری لونگ ٹانک چکی تھیں اور بہت احتیاط سے ننھی کی گرفت سے سروطہ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سلمٰی کی زندگی بہتی ہوئی ندی کی طرح شانت تھی۔ ننھی نے بیچ ندی میں کھڑے ہو کر کچھ ایسا اودھم مچایا تھا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں ہی سے ساری ندی کی شانتی ڈول گئی تھی لیکن علی احمد نے ایک چھوٹی سی ناؤ ندی کی نرم موجوں پر بہا دی تھی، اور ننھی اس ناؤ میں بیٹھ کر دھیمے دھیمے بہنے لگی تھی۔

زندگی کی گاڑی راستے کی ناہمواری کے سبب ٹھہر گئی تھی لیکن علی احمد نے ذرا سا دھکا دے کر ان راستوں سے گاڑی کو گذار دیا تھا اور اب یہ گاڑی جیسے مانوس راستے کے چوڑے چکلے سینے پر رینگتی ہوئی منزل کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

ننھی کو روز ایک انڈا مل رہا تھا، چار دنوں میں اس نے چار انڈے کھائے تھے۔

پھر دن طلوع ہوا تو دادی اماں کی طبیعت زیادہ اداس تھی زیادہ مضمحل تھی۔

رات بھر وہ نیند میں بڑبڑاتی رہی تھیں۔ خدا میرے احمد کو ترقی دے۔ اے معبود تو نے علم کی دولت سے اس کو سرفراز کیا اب اس کو زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دے ننھی پھول بن کر مہکے اور اس کی خوشبو سارے چمن کو معطر کر دے — پھر وہ یکایک کہنے لگیں "دلو بہو رانی احمد کی ڈگری کا فریم ٹوٹ گیا تھا نا پھر تم نے بنوایا کیوں نہیں۔

آج ہی بنوا دیتا۔ بٹی یہ شگون ٹھیک نہیں۔ اتنا بہت سا علم پڑھ لیا ہے تیرے دولھے نے پگلی بی اے پاس کی دلہن ہو کر علم کی حفاظت کرنا تو نے نہ سیکھا۔"

ارے سلّو بٹی یہ تیری ننھی تو لنگڑی کی ٹّبی کا سہارا لیے بغیر بھی دو چار قدم چل لیتی ہے لے بھئی سنبھال اس کو۔ اس نے میری ساری گلوریاں بکھیر دیں۔"

سلمٰی نے بڑی بی کے چلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔" اماں ننھی تو آرام کر رہی ہے۔ ڈگری کا فریم تو میں نے قرینے سے بنوا لیا تھا جس کی آپ تعریف کر چکی ہیں ماتھے پر پسینہ آ رہا ہے۔ اب آپ آرام کیجئے اماں بخار اتر رہا ہے۔"

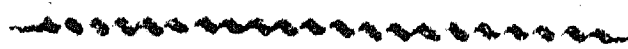
صبح ہوئی لیکن دادی اماں کا بخار نہ اترا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں موسمبی کے رس کا گلاس تھامے دادی اماں نے نحیف آواز میں پوچھا۔" ننھی کو انڈا نہیں دے رہی ہو کیا۔" سلمٰی نے دادی اماں کے سوال کو ان سنا کر کے جواب دیا۔" اماں آپ شربت پی چکیئے نا۔ دوا کا وقت ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ کو زیادہ آرام کرنا بھی تو چاہیئے۔"

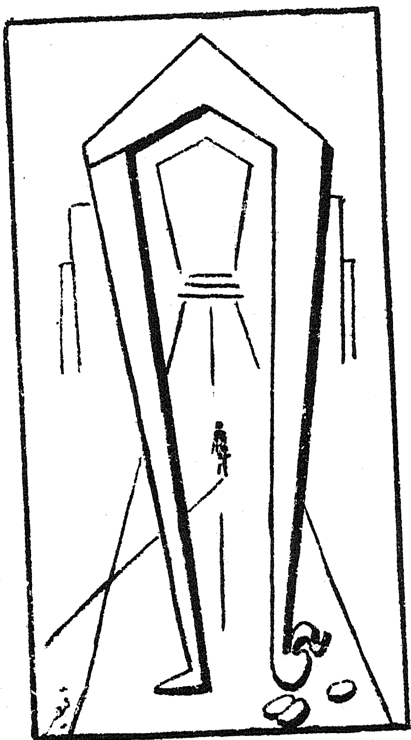
دادی اماں نے موسمبی کا گلاس منہ سے لگایا اسے پی چکیں تو کچھ سوچ کر انھوں نے سلمٰی کو پکارا۔" سلّو بٹی ذرا اس گلاس میں تھوڑا سا پانی لے آنا۔"

پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے دادی اماں آنکھیں بند کیے دیر تک کچھ پڑھتی رہیں۔ پڑھ چکیں تو سلمٰی کو گلاس دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔" گیارہ نام میں بڑی تاثیر ہوتی ہے بٹی۔ دم کیا ہوا پانی ننھی کو روز پلایا کرنا۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد پاؤں پاؤں چلنے لگے گی۔"

سلمٰی نے ننھی کو گود میں اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگانا چاہا تو جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر دم کیے ہوئے پانی میں جا چھپا۔

ننھی کے ہونٹوں سے لگاتے لگاتے سلمیٰ نے گلاس ہٹا لیا۔ لیکن ٹپکا ہوا آنسو دم کیے ہوئے پانی کا جزو بن گیا تھا۔ کوئی موتی تو تھا نہیں جسے سلمیٰ الگ کر لیتی۔ اس نے کچھ رک کر گلاس ننھی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ پی کر ننھی نے منہ پھیر لیا، اور بسورتے ہوئے کہا، "ننداکاتے، نندا دو۔"





بیمار

رام دیال نے میڈیکل سرٹیفکٹ کے ساتھ پھر رخصت بیماری میں مزید پندرہ دن توسیع کے لیے درخواست بھیج دی۔ اس کا چھوٹا بھائی سہما سہما پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا اکزامنر صاحب کے اجلاس کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار بالکل اسی انداز سے وہ آفس آچکا تھا۔ رام دیال کی بیماری کی پرچھائیاں اُس کی گھر والی پر اور اس کے چھوٹے بھائی دونوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے دیکھنے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی غذا اور کپڑا ابھی رام دیال کی دواؤں اور انجکشنوں کی صورت میں ڈسپنسری ہی سے خریدے جاتے تھے۔ وہ جب بھی آتا دزدیدہ نگاہوں سے آفس کلرکوں اور آڈیٹرس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھتا جیسے انھیں یقین دلا رہا ہو کہ میرا بھیّا بہت جلد صحت مند ہو جائے گا۔ وہ موت سے لڑ رہا ہے، اس کی جیت ہوگی، وہ پھر اپنی خدمت پر رجوع ہوگا، اور پہلے سے زیادہ تن دہی سے کام کرے گا، وہ گورنمنٹ کا احسان چکا دے گا، وہ مفت خور نہیں ہے، وہ مرے گا نہیں جناب آپ حضرات اس طرح گھور گھور کر نہ دیکھیں۔

میں نہایت بے چینی سے صیغہ میں اس کی واپسی کا منتظر تھا اس لیے بھی کہ ایک ہفتہ پہلے میں رام دیال سے ہاسپٹل میں مل آیا تھا۔ وہ روبہ صحت تھا لیکن طویل بیماری کی وجہ سے اس کا جسم پیلا پڑ گیا تھا اور نقاہت زیادہ تھی۔ بہت ہی آہستہ سے اس نے کہا تھا کہ کل مجھے یہاں سے DISCHARGE کر دیا جائے گا اور دس دن گھر میں آرام لینے کے بعد گیارھویں دن آفس میں رجوع ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ میری رخصت ۲۱؍ کو ختم ہو رہی ہے۔ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ میں اس طویل بیماری سے تنگ آچکا ہوں۔ سروپ اور اس کی بھابی نہ ہوتے تو مجھے اپنی زندگی اس قدر عزیز نہ ہوتی۔ زندگی واقعی بہت حسین ہوتی ہے، بہت پیاری ہوتی ہے لیکن تندرستی میں صحت جواب دے دے اور آدمی اس کی طرف سے ناامید ہو جائے تو کبھی کبھی موت اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ میری زندگی میں ایسے مواقع آچکے ہیں لیکن سروپ اور اس کی بھابی کے خیال نے مجھے موت سے نبرد آزما رہنے کی شکتی دی اور اب میں اپنے گھر لوٹ جاؤں گا۔ رسوئی گھر سے پھر دھواں اٹھے گا۔ بجلی کے سوئچ پر جمی ہوئی گرد میری انگلیوں کے لمس سے صاف ہو جائے گی اور کھڑکیوں میں سے گذر کر روشنی پھر سڑک کے کنارے تک پہنچے گی۔ سروپ کی بھابی کی دھوتی پھر الگنی پر جھولے گی، اس کے ہاتھ میں پھر سوئی آجائے گی اور میرے کوٹ کے بٹن پھر مضبوط ہو جائیں گے۔ سروپ دیال کا نام اس کی کلاس میں پکارا جائے گا تو وہ غیر حاضر نہ رہے گا۔ اس کی نوٹ بکس کے صفحات اس کے فونٹن پن کی نب کو چومنے کے لیے نہ ترسیں گے۔ اس کی نگاہیں جو مدت سے صرف میرے زرد چہرے پر جمی رہی ہیں پھر ان کتابوں کے سینوں کو گدگدائیں گی میری سائیکل پھر چمک اٹھے گی۔ اس کے پہیے پھر گھومنے لگیں گے۔ میرے دروازے پر پھر تم دستک دو گے۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے رام دیال سے وعدہ کیا تھا کہ

بیمار

اب کی ملاقات اس کے گھر پر ہوگی۔ کیا وہ ابھی ہاسپٹل میں تو نہیں ہے؟ کیا ابھی اس کا رسوئی گھر، بجلی کا سوئچ، اس کا کوٹ، اس کی سائیکل، اس کے گھر کا دروازہ اس کے منتظر ہیں۔ سروپ گردن جھکائے اگزامنر صاحب کے کمرے سے نکلا ہوا دکھائی دیا تو میں اس کی طرف لپکا تاکہ اس کے صیغہ میں پہنچنے سے پہلے ہی تفصیلات معلوم کر لوں کیوں کہ میرے سوا میرے بعض ساتھی بھی اس کے منتظر تھے اور صیغہ میں داخل ہو کر اس کو حسب معمول یکے بعد دیگرے جوابات دینے ہوتے تھے کہ بھیّا اب اچھے ہو رہے ہیں، بھیّا اب نسبتاً بہتر ہیں۔

سروپ دیال چوں کہ زیادہ پریشان تھا۔ اس لیے وہ بغیر کسی سے ملے چلا گیا اور ویسے وہ اس قدر شرمیلا واقع ہوا تھا کہ ہمیشہ ہی اس امر کی کوشش کرتا کہ کم سے کم لوگوں سے ملے اور جلتا بنے۔ وہ دفتر میں داخل ہوتا تو خود کو ایک مجرم محسوس کرنے لگتا۔ اپنے بھیّا کی طویل بیماری میں بغیر نوکری کیے ہر ماہ نصف تنخواہ لینے پر شرمندہ سا رہتا۔ سروپ سے مجھے معلوم ہوا کہ رام دیال کی طبیعت یکایک اس رات خراب ہو گئی جس دن میں اس سے مل کر آیا تھا۔ دواخانے سے اس کو خارج نہیں کیا گیا، اور آج کے تیسرے روز اس کا آپریشن ہوگا تنخواہ کے لیے میرے نام اُس نے AUTHORITY LETTER دیتے ہوئے کہا تھا کہ بھیّا آپ کا بہت انتظار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ ضرور گھر گئے ہوں گے اور دروازہ مقفل دیکھ کر پریشان ہوئے ہوں گے لیکن دوسرے روز جب آپ ہاسپٹل نہیں آئے تو انھیں یقین ہو گیا کہ آپ گھر نہیں گئے ورنہ آپ ہاسپٹل ضرور آتے۔ کل پہلی ہے، تنخواہ ہمیں کل ہی پہنچا دیجئے۔ ہمیں شدید ضرورت ہے۔ آج اگزامنر صاحب نے مجھ سے کچھ ترش روئی برتی بھیّا کی بیماری کی طوالت سے وہ مجھے کچھ بیزار سے نظر آئے۔ درخواست میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا کہ آپ ہی اس کو اسسٹنٹ صاحب کے پاس پیش کر دیجئے کیوں کہ اگزامنر صاحب نے FILE طلب کیا ہے۔ جب میں صیغہ میں واپس پہنچا تو بعض ساتھیوں نے رام دیال

بیمار

کی خیر خیریت پوچھی. اکثر نے ہمدردی کا اظہار کیا لیکن سیوانندم آج بھی اپنی خباثتوں کے ساتھ اپنے ہم عمر چپراسی سے سرگوشی کرنے لگا. میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظریں مجھ سے ملیں اور جھک گئیں.

رام دیال ۳۵، ۳۶ سال کا لمبا تڑنگ آدمی تھا. چھوٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں رخساروں کے اوپری حصہ پر دونوں جانب کچھ اودے اودے دھبے جو ابھری ہوئی ہڈیوں کے ساتھ بالکل نمایاں تھے. بے حد زاہد خشک، کٹر مذہبی، اسی لیے دفتر کے بہت کم لوگ اس سے مانوس تھے، اس لیے بھی کہ اس سے مانوس ہونا بہت مشکل تھا کیوں کہ وہ یا تو آروند گھوش کی تعلیمات سے متعلق بات چیت کر سکتا تھا یا عہدیداروں کی تجاویز سے متعلق یا پھر ضابطۂ ملازمت کی دفعات سے متعلق، اگر آپ اس سے کسی کرنٹ ٹاپک CURRENT TOPIC پر گفتگو کرنا چاہتے تو صرف اس کی وہ فائلس جو زیرِ غور رہتیں، وہ انھیں سے متعلق گفتگو کر سکتا تھا پھر اس پر طرہ یہ کہ وہ مذاہب پر بات چیت شروع کرے گا تو وحدانیت تک لے جائے گا اور دفتری بات چیت ہوگی تو آروند گھوش کی تعلیمات پر ختم ہوگی اور پھر دورانِ گفتگو میں اس کے جملوں میں ربط نہ رہے گا وہ بات کرتا رہے گا اور سوچتا رہے گا اور سوچتے سوچتے خیالات کی رو میں اس طرح بہہ جائے گا کہ زبان اس کا ساتھ نہ دے سکے گی. قوت اظہار جواب دے دے گی اور وہ کچھ محجوب محجوب سامنے تکنے لگے گا. یہاں تک کہ خود آپ کو اس پر ترس آ جائے گا اور آپ لقمہ دیں گے کہ ہاں بھئی ہم نے آپ کا مفہوم سمجھ لیا ہے. آپ اپنی فرض شناسی کو مذہب کی صحیح تعلیمات کا سبب سمجھتے ہیں. جن میں آپ کی انفرادیت کا بھی دخل ہے. لیکن یہ انفرادیت بھی مذہب ہی کی روشنی میں پروان چڑھی ہے. وہ بہت خلوص سے آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے گا اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس طرح آپ کو دیکھے گا جیسے آپ اس کے محسن ہیں کیوں کہ آپ نے اس کی بے ربط باتوں سے

بیمار

اس کے مقصد کو متعین کر لیا ہے اور وہ صرف اسی لیے آپ سے مرعوب بھی ہو جائے گا کیوں کہ آپ بہت دور رس ہیں اور آپ نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں کا مفہوم سمجھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اور بھی کئی خصوصیات تھیں اپنے عہدیداروں کی نظروں میں وہ بہت محنتی، بہت فرض شناس تھا اور اس کے کام سے سب مطمئن تھے کسی کارروائی میں خود اس کو اختلاف ہوتا تو پھر عام طور پر یہ بات سمجھ لی جاتی تھی کہ اب یہ کارروائی نہیں ہوگی اور اسی لیے سارے دفتر میں یہ کہاوت بن گئی تھی کہ رام دیال کا کاٹا پانی نہیں سکتا۔ وہ بہت پابند وقت تھا بقول آفس کے چوکیدار کے کہ رام دیال بابو آئے ہیں تو اس وقت پونے دس بجے ہوں گے۔ آپ کی گھڑی غلط ہے آپ اسے صحیح کر لیجئے اور پھر رام دیال بابو پونے دس بجے اپنی میز پر ڈٹ جاتے تو پانچ ساڑھے پانچ بجے تک اٹھنے کا نام نہ لیتے۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اس آدمی کو نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیشاب ہی آتا ہے۔ میز پر لگی ہوئی فائلوں کی ڈھیر کے نیچے وہ مع اپنے مذہب اور اپنی انفرادیت کے سات ساڑھے سات گھنٹے تک دفن رہتا۔ کوئی الجھی ہوئی کارروائی ہوتی تو دفتر کے لوگ اسی سے مشورہ لیتے۔ وہ فونٹین پن پر کیپ چڑھا کر گردن اٹھاتا اور ٹھوڑی کو ہتھیلی پر رکھ کر گردن کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا اور آپ علانیہ اس کی گردن کی ہڈی کے چٹخنے کی آواز سنتے اور آپ کو یقین ہو جاتا کہ اب وہ آپ کی دشواریوں کو سہل تر کر دے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کارروائی کو سمجھاتے وقت وہ اپنے عہدیداروں کی فطرت سے لے کر ان کی تجاویز کی خامیوں تک ہر چیز پر روشنی ڈالے گا اور پھر اس بات میں مذہب آجائے گا آدمی کی اصلیت آجائے گی، دنیا کی بے ثباتی آجائے گی، روح اور جسم کا رشتہ موضوع بحث بن جائے گا اور کیا عجب کہ اپنے فرائض سے غافل نہ رہنے پر مختصر سی نصیحت بھی آپ کو سننی پڑے۔ اور آپ یہ سب کچھ نہایت سعادت مندی سے برداشت کریں گے کیوں کہ وہ آپ کو کارروائی سمجھانے کے لیے راضی ہو گیا ہے اور آپ جب کارروائی

سمجھ کر اٹھیں گے تو ایک ایک نکتہ آپ پر واضح ہو چکا ہو گا۔ اور آپ کے نوٹس کی تیاری کے لیے کئی آرٹیکلس آپ کے سامنے ہوں گے جن پر صاد کر کے وہ ضابطے کی کتاب آپ کے ہاتھ میں تھما دے گا۔ جب پہلے پہل میرا اپائنٹ منٹ ہوا تھا تب بھی وہ رخصت بیماری پر تھا۔ میں نے اس کے متعلق کچھ اس قسم کی باتیں سنی تھیں کہ وہ عجیب الخلقت آدمی ہے اور خرابی صحت کی وجہ سے کچھ چڑچڑا پن بھی اس کے مزاج کا جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ جب وہ رجوع ہوا تو میں نے اس سے قریب ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی اور چار پانچ دن معمولی آداب سلام کے بغیر ہی گذر گئے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ وہ کس طرح مجھ سے مانوس ہوتا گیا اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے، وہ مجھ سے کچھ متاثر سا نظر آنے لگا جس کی سوائے اس کے کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس کی باتیں اخلاق و مروّت بلکہ صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ صبر و تحمّل سے سن لیا کرتا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس کی کٹر مذہبیت اس کی خرابی صحت کا ردّ عمل ہے اور وہ اپنی مفلوج انفرادیت کا پھٹا ہوا لبادہ اوڑھے کبھی کبھی مذہب سے ستیزہ کار رہتا ہے لیکن ہار ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے اور مذہب کی گرفت اس کے دل و دماغ پر زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ زیادہ دیرپا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ دو زانو ہو کر عہدیداروں کی کج خلقی اور تنک مزاجی کو بھی کسی مذہبی برگزیدہ شخصیت سے رجوع کر دیتا کہ وہ ان کے دلوں میں رحم و کرم پیدا کر سکتی ہے، انھیں اچھا انسان بنا سکتی ہے، انھیں راہ راست پر لا سکتی ہے۔ اس کو دو چیزوں سے بہت پیار تھا۔ آروند گھوش کی نظموں اور مضامین کے مجموعوں سے اور اپنے فائیلس سے۔ پانڈیچری آشرم کی مطبوعہ کتابوں کا وہ شدید احترام کرتا تھا اور اپنے فائلس سے اس کو شدید محبت تھی۔ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہی دونوں چیزیں اس کی شخصیت کی پناہ گاہیں ہیں۔ وہ صرف ان کا احترام نہیں کرتا صرف ان سے پیار نہیں کرتا بلکہ ان میں پناہ لیتا ہے۔ فائلس کو وہ بہت سجا کر رکھتا کیلنڈر کے نمبر کاٹ کاٹ کر

فائلس پر چسپاں کرتا۔ پورے دفتر میں رام دیال کی متعلقہ فائلس آنکھ بند کرکے چن لی جاسکتی تھیں۔ نوٹنگ کچھ اس احتیاط سے کرتا کہ لکھتے وقت ایک لفظ بھی نہ کاٹتا۔ کچھ حذف کرنے کی ضرورت ہوتی تو نہایت چابکدستی سے ربر یا بلیڈ کے ذریعہ قلم زد فی الفاظ مٹا دیتا اور پھر کاغذ کے اس حصہ پر اس احتیاط سے لکھتا کہ روشنائی نہ پھیلنے پاتی۔ فائلس بہت قرینے سے فائل بورڈس میں بندھی ہوئی اس کی الماری میں سجی رہتیں۔ میں نے کبھی اس کو فائل تلاش کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جس فائل کی ضرورت ہوگی وہ فوری رجسٹر کھولے گا نمبر دیکھے گا اور ایک منٹ الماری کے پاس کھڑے رہنے کے بعد دو سال پرانا فائل بھی اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہوگا کہ رام دیال کے خوابوں کی دنیا میں بھی فائل کا دخل تھا۔ میں نے اس ذہنیت کا آدمی نہیں دیکھا۔ اس کے شعور اور تحت الشعور میں بھی اس کے فائلس بس گئے تھے۔ صدر دفتر کی آڈٹ پارٹی تنقیح کے لیے آئی تو ایک فائل باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوئی۔ ہم سب کو حیرت ہوئی کہ رام دیال کی متعلقہ فائل اور وقت پر نہ ملے اور پھر ایسی صورت میں جب کہ رام دیال اس کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس دن وہ بہت دل گرفتہ رہا۔ صیغہ کی ساری الماریاں چھان ماریں اور کوئی سات بجے شام گھر لوٹا۔ دوسرے دن وہ بہت بے چینی سے اسسٹنٹ صاحب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں دفتر پہنچا تو اس نے بہت رازدارانہ انداز سے کہا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ بہت مسکراتے ہوئے کھویا ہوا فائل اسسٹنٹ صاحب کی الماری کے دوسرے خانے سے نکال کر مجھے دے رہے ہیں۔ آپ نے خواب میں بھی مجھ سے ہمدردی کی ہے اور میرے ساتھ فائل کی تلاش میں اپنا سارا دن خراب کیا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں بھولوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا خواب غلط نہ ہوگا۔ رات کو جب آنکھ کھلی ہے تو پھر میں سو نہ سکا۔ جی چاہتا تھا کہ فوری صبح ہو جائے اور میں دفتر پہنچ جاؤں۔ آپ یقین کیجئے کہ رات ہی کو دفتر پہنچ کر اسسٹنٹ صاحب کی الماری

کھولنا میرے بس میں ہوتا تو میں رات ہی کو اس کام سے نپٹ لیتا۔ لیکن اس بدقسمتی کو کیا کروں کہ اسسٹنٹ صاحب اب تک نہیں آئے ہیں اور دوسری کوئی چابی الماری کو نہیں لگ سکتی مجھے اس بیوقوفی پر ہنسی آنے لگی۔ دفتری کام سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے۔ اسسٹنٹ صاحب کی الماری سے فائل برآمد ہو بھی جائے تو کون سی بڑی بات ہو جائے گی۔ ہمدردی تو رام دیال سے ہے کہ فائلس اس کی زندگی کا ایک جز بن گئی ہیں چپراسی نے اسسٹنٹ صاحب کے آنے کی اطلاع دی تو ہم دونوں الماری کھولنے کی غایت سے ان کے اجلاس پر پہنچے، چابیاں حوالے کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھیں یقین ہے کہ فائل ان کے پاس نہیں ہے لیکن رام دیال نے ان کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی الماری کھول دی اور منٹ دو منٹ بعد فائل نکال کر اسسٹنٹ صاحب کے سامنے رکھ دی وہ کچھ پشیمان سے ہو گئے اور زور سے گھنٹی بجا کر چپراسی کو پانی پلانے کے لیے کہہ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ ہم کمرے سے باہر نکلے تو رام دیال کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جانے کیوں وہ رونے کو تھا اور اپنے تحت الشعور کو بشارت اندری سمجھ رہا تھا۔ ایک دن قبل جس فائل کے لیے سارے دفتر میں تہلکہ مچا ہوا تھا وہ آج بغیر کسی جستجو کے رام دیال کے خواب کی تعبیر بن گئی تو یہ بات سارے دفتر میں گونجنے لگی۔

ایک بار یرقان ہو جانے کی وجہ سے اس نے رخصت لے رکھی تھی۔ میرا اس زمانے میں اس کے گھر آنا جانا نہ تھا کیوں کہ دوسروں کی طرح خود میرے لیے بھی یہ مسئلہ بہت اہم تھا کہ اس سے کس قسم کی باتیں کی جائیں اور اس خیال سے مجھے وحشت ہونے لگتی یہاں تک کہ میں عیادت اور مزاج پرسی کے معمولی فرائض کو بھی نظر انداز کر دیتا۔ باوجودیکہ اس کے اپنے بارے میں میری رائے معلوم کیے بغیر ہی وہ مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ مجھے

اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا، اپنا دکھ درد مجھ سے بیان کرتا تھا اور کم از کم نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے شد و مد سے نصیحت کرتا۔ اس نے ایک دن میرے پاس آدمی بھیجا کہ وہ شام کی ٹرین سے پانڈیچری جا رہا ہے، اس لیے میں اسٹیشن پر ضرور ملوں۔ میں اسٹیشن پہنچا تو گاڑی چھوٹنے میں دو چار منٹ باقی تھے میں نے تاخیر سے پہنچنے پر معافی مانگی تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کو میں نے بے وجہ تکلیف دی۔ میری صحت چوں کہ خراب ہے اس لیے میں نے سوچا کہ مرنے سے پہلے کم از کم یہ حسرت تو نکل ہی جائے کہ میں نے پانڈیچری کے آشرم کی زیارت نہیں کی۔ پتہ نہیں کہ میں واپس آ بھی سکوں گا یا نہیں، اس لیے آپ سے ملے بغیر چلے جانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ واقعی رام دیال اب واپس نہ آسکے گا اور یہی اس سے آخری ملاقات ہے ـــــ لیکن رام دیال خلاف توقع واپس آیا اور اپنے ساتھ دو ایسی چیزیں پانڈیچری سے لیتا آیا جو بعد کو اس کی شخصیت کا اہم جز بن گئیں اور آج آپ ان کا تصور کیے بغیر رام دیال کے چہرے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے دل و دماغ تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ اہم چیزیں اس کی ڈاڑھی اور زلفیں تھیں۔ البتہ اپنی کھوئی ہوئی صحت اس کو پانڈیچری کے آشرم میں بھی نہ مل سکی تھی، الٹے اخراجات زیادہ ہو گئے تھے اور وہ مقروض ہو گیا تھا۔

رام دیال کے مزاج کا تلون اور بڑھ گیا۔ وہ معمولی سی بات پر بھی الجھ پڑتا۔ پانڈیچری سے لوٹنے کے بعد میں نے دیکھا کہ اس نے اپنی بچی کھچی ہنسی بھی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ رام دیال جو عہدیداروں کی ذرا سی خفگی پر دن دن بھر اداس ہو جاتا اس میں اس قدر تغیر تو آیا تھا کہ وہ اب ان سے حجت کرتا۔ مجھے افسوس تو اس بات کا تھا کہ یہ حجت کوئی خود اعتمادی کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ تھا جو خود اعتمادی کے چھن جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس کی خود اعتمادی پر کثر مذہبیت نے پہرے بٹھا دیئے تھے اور

صحت کی خرابی کی وجہ سے اس نے ہر پہرہ بندی کو قبول کر لیا تھا۔ اگر وہ صحت مند ہوتا تو ہو سکتا ہے اس کے نہ داڑھی ہوتی نہ زلفیں اور نہ وہ دفتر کی سیاست کو کسی اوتار سے رجوع کرتا ـــــ ایک بار مددگار متعلقہ سے کسی بات پر اس کی ٹھن گئی مددگار صاحب نے رام دیال سے جواب طلب کیا اور تا حکم ثانی دفتر کے کام سے باز رہنے کا حکم صادر فرما دیا۔ یہ رام دیال کی داڑھی اور زلفوں کا زمانہ تھا۔ اس نے تین دن تک کوئی جواب پیش نہ کیا بلاناغہ حسب معمول وقت پر دفتر آتا۔ اپنی میلی سی تھیلی میں سے آئینہ نکال کر میز کی ادھ کھلی دراز میں رکھ لیتا اور دو دو تین تین منٹ تک بغیر پلک جھپکائے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتا رہتا۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا اور دو تین منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا۔ پھر آنکھیں کھول دیتا اور اپنے چہرے کو آئینے میں تکتا۔ لوگ اس کی طرف اشارہ کرتے، اس پر ہنستے، پھبتیاں کسی جاتیں لیکن یہ سب کچھ بہت آہستہ آہستہ ہوتا اس لیے کہ اگر رام دیال سن پائے تو کوئی نیا فتنہ جاگ اٹھے۔ دو دن اسی طرح گذر گئے دوسرے سکشن سے لوگ آ آ کر دیکھتے، زیر لب مسکراتے اور دوسرے تماشہ بینوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے۔ یہاں تک کہ رام دیال نے اس کے خلاف ہونے والے تبصروں کو تاڑ لیا لیکن کسی سے الجھنے کی اب اس میں ہمت نہ تھی کیوں کہ اگر بات بڑھتی تو یکہ و تنہا رام دیال کو پورے دفتر سے مخاصمت مول لینی پڑتی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار نہ کر سکا۔ ان دنوں میں بھی اس سے انجان سا۔ لیکن دوسرے دن دل کڑا کر کے میں نے پوچھ ہی لیا کہ آخر اس آئینہ بینی کا مقصد کیا ہے ـــــ رام دیال نے جواب دیا کہ ـــــ

"I WANT TO CULTIVATE MY INDIVIDUALITY" میری سمجھ میں نہ آیا کہ شخصیت اور انفرادیت کی نشو و نما آئینہ بینی سے کس طرح ہوتی ہے اور مددگار نے جو جواب طلب کیا ہے اس پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ بات کو طول دینا میں نے مناسب

نہ سمجھا اور چپ ہو کر اپنی میز پر آکر فائلیں پر جھک پڑا۔ تیسرے دن رام دیال آئینے کی بجائے آروند گھوش کی فریم میں جڑی ہوئی چھوٹی سی تصویر اپنے ساتھ لے آیا۔ اور اگلے دو دنوں کی طرح آئینہ بینی کی بجائے تصویر بینی میں لگا رہا۔ دفتر ختم ہونے سے پہلے مددگار نے ایک دن کی مہلت دیتے ہوئے سختی سے جواب طلب کیا تو رام دیال . . . زندگی میں پہلی بار منتظم سے اجازت لے کر وقت سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ چوتھے دن اس کے ساتھ نہ آئینہ تھا نہ آروند گھوش کی تصویر۔ مددگار کے اجلاس پر وہ معذرت نامہ چھوڑ آیا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔

آپ کو شاید رام دیال سے ہمدردی نہ ہو لیکن آنتوں کی بیماری کا شکار ہو کر اس نے لمبی رخصت لے لی تو مجھے اس کی جائداد پر منصرمانہ ترقی دے دی گئی کیوں کہ وہ سکنڈ گریڈ آڈیٹر (AUDITOR) تھا۔ ترقی ملی تو آپ یقین کیجیے مجھے خوشی نہ ہوئی۔ میری دلی تمنا تھی کہ رام دیال صحت پاکر جلد واپس آجائے اور یہیں سے میری ہمدردیاں اس سے وابستہ ہو گئیں وقتاً فوقتاً میں اس کی مزاج پرسی کے لیے جانے لگا۔ جب بھی جاتا اس کو یقین دلاتا کہ وہ جلد ہی صحت پاکر لوٹے گا اور اس کی سجی ہوئی مثلیں زیادہ دن اس کے ہاتھوں کے لمس کی منتظر نہ رہیں گی۔ شروع شروع میں تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے میرے خلوص کی صداقت کو سمجھا بھی یا نہیں لیکن آہستہ آہستہ وہ میری ہمدردی کا معترف ہوتا گیا۔ کسی ساتھی کی طویل رخصت بیماری کے سلسلے میں منصرمانہ ترقی مل جائے تو آپ اس کا اندازہ غالباً نہیں کر سکتے کہ ایسی ترقی سے خوشی نہیں ہوتی بلکہ اس کے دکھ درد کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لیتے وقت مجھے رام دیال بے طرح یاد آتا جو بیماری کی حالت میں نصف تنخواہ پر گذر بسر کر رہا تھا اور اسی ترقی کی وجہ سے میں اس سے زیادہ ملتے رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ انھیں ملاقاتوں سے اس کی زندگی کے بہت سے تاریک گوشوں سے مجھے واقف

ہونے کا موقع ملا۔ عیادت کے وقت اس کے لیے کچھ پھل لے جانا میرے لیے سکون کا باعث ہوتا اور وہ اس معمولی تحفے سے اس قدر ممنون ہوتا کہ مجھے شرمندگی ہوتی کیوں کہ میں اسی کے پیسوں سے اس پر احسان کر رہا تھا لیکن کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی مجھے اس ذہنی اذیت سے نجات مل گئی۔ کیوں کہ ایک ساتھی کے دوسرے محکمے میں منتقل ہونے کے سبب سنیارٹی کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اس کی جائداد پر ترقی دے دی گئی اور سیوانندم نے رام دیال کی جگہ منصرمانہ ترقی حاصل کر لی اور اس تاریخ سے وہ کبھی رام دیال کا بھی خواہ نہ رہا۔ یہ اس کی فطری خباثتیں تھیں جو میں نے اپنے کسی دوسرے ساتھی میں نہیں دیکھیں۔ لیکن آمد و رفت کا یہ سلسلہ میں نے اب بھی جاری رکھا۔ اور میوہ لے جاتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہونے لگی۔

دوسرے دن رام دیال کی تنخواہ لے کر جب میں ہاسپٹل پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی معدہ میں ایسڈ کی زیادتی کی وجہ سے آنتیں سڑ گئی تھیں۔ اس پر غنودگی طاری تھی اور وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے تک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں نہ یگانگت تھی نہ بیگانگی نہ شکوہ تھا نہ شکایت۔ صرف کسمپرسی تھی، موت سے چمکیں تھیں اور کچھ ایسی وحشت تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ اروند گھوش کی تصویر اس کے سرہانے پڑی تھی جس کو وہ کبھی گھنٹوں گھورا کرتا تھا لیکن آج اس تصویر میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ رام دیال کی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے۔ اس کی بیوی پائنتی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی اور سروپ مجھ سے نظریں ملنے کے بعد آنسو پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ کل گیارہ بجے تک زندگی اور موت کی جنگ کسی قطعی فیصلہ پر پہنچ جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیوانندم اپنی ساری خباثتوں کے ساتھ آخری اور بھرپور وار کر رہا ہے اور جیت سیوانندم ہی کی ہوگی۔ میں نے رام دیال کی تنخواہ آہستہ سے جیب سے

نکال کر سروپ کے ہاتھ میں رکھ دی اور بغیر کچھ کہے سنے واپس لوٹ گیا۔ سروپ نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

صبح جب میں ہاسپٹل پہنچا تو سروپ مجھے ہاسپٹل کے گیٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ گیٹ کے پہلو کے ہوٹل کی جانب اس کو جاتا ہوا دیکھ کر میں نے بھی اپنا رخ بدل دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رام دیال ابھی زندہ ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا تو مجھے دیکھے بغیر ہی وہ اس انداز سے مجھ سے مخاطب ہوا جیسے جانتا تھا کہ اس کی پشت پر میرے ہاتھ کے سوا دوسرا ہاتھ رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس نے کہا کہ بھیا کا آپریشن رات ہی کو ہو چکا ہے اور وہ ابھی تک بے ہوش ہیں۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ وہ بچ جائیں گے۔ رات ہی کو آپریشن نہ ہو جاتا تو شاید بھیا بچ نہ سکتے۔ رات کو جب آر۔ ایم۔ او نے ان کا معائنہ کیا تو ان کی حالت بہت نازک تھی، اسی وقت سول سرجن صاحب کو فون کیا گیا، اور مشورہ کے بعد آپ کے رام کو موت کے منہ سے چھین لیا گیا۔ آر۔ ایم۔ او بڑے اچھے آدمی ہیں اور کل رات بھابی نے ان کے قدم پکڑ لیے تھے۔

لیکن اس کے باوجود بجلی کے سوئچ پر جمی ہوئی گرد کسی دوسری ہی انگلی نے صاف کر دی ہے۔ رسوئی گھر سے آج بھی دھواں اٹھتا ہے۔ کھڑکیوں سے گذر کر روشنی سڑک کے کنارے تک آج بھی پہنچتی ہے۔ لیکن سروپ کی بھابی کی دھوتی الگنی پر پھر کبھی نہ جھولی۔ رام دیال کے کوٹ کے بٹن پھر مضبوط نہ ہو سکے۔ جیب اور کالر پھر نہ سل سکے۔ سروپ یال اپنی کلاس سے آج بھی غیر حاضر ہے اور ہمارے دفتر میں پروبیشنری کر رہا ہے۔ اس کی نوٹ بکس کے سادہ صفحات اس کی فونٹین پن کی نب کو چومنے کے لیے آج بھی ترستے ہیں یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ رام دیال کی سیکل ۴۰ روپے میں ایک بنیے کے پاس رہن ہے جس پر ماہانہ پانچ روپے کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی محبوب اور مقدس کتابیں چوک میں

پُرانی کتابوں کی دکانوں پر آپ کو دستیاب ہوسکتی ہیں جس پر رام دیال نے بہت احتیاط سے اپنا نام لکھا تھا۔ اس کی متعلقہ فائلس، دوسری فائلس کی ڈھیر میں آج بھی ایک ہی نظر میں پہچان لی جاسکتی ہیں۔ سروپ دیال کی بھابی اس آشرم میں فاقے کرتی ہے جس آشرم سے چار میل کا لمبا راستہ طے کر کے سروپ دیال روزانہ دفتر آتا ہے ہمارے دفتر میں ایک اور رام دیال جنم لے رہا ہے جس میں خوداعتمادی ہے اور جو شکست خوردگی کو موت سمجھتا ہے کیونکہ رام دیال مرا نہیں ہے وہ ہاسپٹل میں صحت پا رہا تھا کہ یکایک رات کو کہیں غائب ہوگیا۔ سنتے ہیں کہ اس نے پانڈیچری کے جنگلوں میں زندگی کے راز کو پالیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ رام دیال زندہ نہیں ہے وہ مرچکا ہے اور سروپ دیال مر کر بھی کبھی نہیں مرے گا۔ اس لیے کہ اس نے زندگی کے اس راز کو پالیا ہے جس کو رام دیال نہ پاسکا اور پھر ہمارے دفتر میں کتنے ہی سروپ دیال جنم لے چکے ہیں۔



مجھے یقین ہے کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹ جائے گا۔ میں اس دن خوش ہوں گا یا نہیں قطعی طور پر اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسٹیشن کے حدود سے لے کر رائل ہوٹل اور اسٹار بار اور دوسری سمت عابڈس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکڑ تک اللہ کی ساری مخلوق سارے بندے جشن منائیں گے۔۔۔۔ خوشی کے مارے ایک دوسرے سے گلے ملتے پھریں گے۔ یہ نہ سوچیں گے کہ کون اجنبی ہے، کون بیگانہ ہے۔ ایک دوسرے سے اجنبی ہونے کے باوجود، بیگانہ ہونے کے باوجود اس خطرناک وبا سے، اس خوفناک دشمن سے متحدہ طور پر سب کے سب بیزار ہیں۔ اس کی حکومت صرف ان ہی حدود تک محدود ہے جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی مشرق میں اسٹار بار سے مغرب میں عابڈس کو مڑنے والی شاہراہ کی نکڑ تک۔ شمال میں درگاہ یوسفین سے جنوب میں رائل ہوٹل تک۔ لیکن اس کی راجدھانی نامپلی اسٹیشن ہے۔ ورنہ وہ سارے شہر کو اپنے ایک پیر سے روندتا پھرتا۔ راجدھانی کی اہمیت کے مدنظر قریب قریب ہندوستان بھر کے باشندے اس کی زد میں آئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ آپ دلی سے آ رہے ہوں، بمبئی سے

آرہے ہوں، بجواڑے سے آرہے ہوں، آئیں گے تو نامپلی اسٹیشن پر ہی ـــــ بس پلیٹ فارم پر آپ نے قدم رکھا اور آپ اس کی زد میں آئے۔ وہ ترس کھا کر آپ کی طرف نظر نہ اٹھائے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ اور اگر بجلی کی سی تیز رفتاری سے اس کے ذہن میں یہ خیال آجائے کہ آپ سے ملنا چاہیئے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو آپ سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔ اور ہاں ہے بھی تو بڑا منکسر المزاج۔ ایسی ایسی شاہراہیں، ایسے ایسے ہوٹل، بار، پیروں کی خانقاہیں، ان سب پر حکومت کرنے والا دھڑام سے آپ کے قدموں میں گر جائے گا۔ آپ اچھل پڑیں گے۔ غیر متوقع طور پر آسمان سے کوئی چیز ایک دم آپ کے قدموں میں آگرے تو اس طرح اچھل پڑنا بالکل فطری عمل ہے۔ لیکن عین اس وقت وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کے پیروں کو پکڑ لے گا۔ آپ یا تو سڑک پر گر جائیں گے یا بمشکل تمام اپنے بازوں کو فضاؤں میں لہرا کر سنبھل جائیں گے۔ اس کا انکسار اور بڑھے گا۔ وہ آپ کے قدموں سے چمٹ کر رہ جائے گا۔ اس طرح کہ آپ ایک قدم نہ بڑھا سکیں گے اور بالکل بے بس ہو کر اپنے اطراف دیکھنے لگیں گے کہ شاید کوئی آپ پر ترس کھائے۔ لیکن آپ یہ بھول گئے ہیں کہ اسٹیشن سے نکلنے کے بعد جہاں آپ اس کے ہاتھوں میں بے بس ہو گئے ہیں وہ بھی تو وہی علاقہ ہے جہاں اس کی حکمرانی ہے۔ لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ سب اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اطراف بے شمار دکانیں ہیں۔ زیادہ تر پان کی دکانیں اور ہوٹل ہیں۔ پنواڑی گلوریاں بناتا رہے گا۔ ہوٹلوں کے بیرے آوازیں لگاتے رہیں گے۔ کوئی آپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ آپ مجبور اور بے بس کھڑے کھڑے ہر راہ چلنے والے کو ٹکر ٹکر دیکھیں گے، لیکن کب تک دیکھیں گے۔ کچھ سوچ کر اپنی جیب میں اپنی انگلیاں ٹھونس دیں گے ـــــ حیدرآباد کی پہلی شاہراہ پر آزادانہ چلنے پھرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کوئی چمکدار پیسہ کوئی آدھانی آپ کو

سڑک پر پھینک دینی ہوگی۔ وہ آپ کے قدموں کو چھوڑ کر اس پیسے یا دھانی پر جھپٹے گا اور آپ اپنی پتلون کی کریس یا پاجامے کا پائنچہ، یا دھوتی کا نچلا سرا درست کر کے اپنے اس حملہ آور کو نظر بھر کر دیکھنے کے لیے پلٹیں گے تو وہ انتہائی تیز رفتاری سے ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا موٹروں، رکشاؤں اور سیکلوں سے بچ بچ کر سڑک پر رقص کرتا ہوا نظر آئے گا۔ یا پھر نظر ہی نہ آئے گا۔

میں جس شخص کی باتیں کر رہا ہوں وہ کوئی تیمور لنگ نہیں ہے جو اپنے لاؤ لشکر کے سہارے حکومت چلاتا ہو۔ گیارہ بارہ سال کا ایک چھریرا سا کھلے رنگ کا لونڈا ہے جس کا ایک پاؤں کٹا ہوا ہے۔ گالوں کے اوپر کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی ہیں اور ہونٹوں کے اوپر یا پیشانی کے نیچے (صحیح مقام انھیں کے درمیان کہیں ہوگا) ناک کچھ اس طرح چپکی ہوئی ہے جیسے کوئی مینڈک پاؤں سمیٹ کر جست کرنے سے پہلے سکڑ گیا ہو۔ وہ سامنے کھڑا ہو کر ہاتھ پسارے گا تو جانے کیوں یہ احساس ستاتا رہے گا کہ جیٹ سے اب اس کی ناک اپنی ناک پر سوار ہو جائے گی۔ بہر حال اس کی شخصیت میں اس کی کٹی ہوئی ٹانگ اور مینڈک جیسی ناک کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے جسم میں معلوم نہیں خون ہے یا نہیں لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کی شریانوں میں خون کے بدلے پارہ ہی پارہ دوڑتا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ آپ کے آگے کھڑا ہوگا تو اس کی ٹنڈ منڈ کٹی ہوئی ٹانگ جو قمیص کے دامن کے نیچے چھپی ہوئی ہوگی جھٹ سے دامن ہٹا کر آپ کو دیکھنے لگے گی اور اس سے پہلے کہ آپ اس کو غور سے دیکھیں جھٹ سے دامن کے نیچے چھپ جائے گی اور جب تک آپ دیا سلائی سے اپنا سگریٹ جلا کر پہلا کش لیں وہ پھر دامن کے نیچے سے آپ کو تاکنے لگے گی۔ جانے کیوں ذہن اس طرح سوچے گا کہ اس کے دامن میں ایک چھپا ہوا خنجر ہے جو آہستہ سے آپ کی ایک ٹانگ کو آپ کے دھڑ سے الگ کر دینے کی تاک میں ہے

برہانِ قاطع

آپ کچھ اس قسم کی باتیں سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کھڑا کھڑا اچھل پڑے گا اور ہوا میں ایک چکر لگا کر زمین پر اپنی ایک ٹانگ ٹکائے بالکل اسی طرح کھڑا ہو جائے گا جیسے پہلے کھڑا تھا ہونٹوں پر بینڈک رکھے ہوئے ہاتھ پسارے دامن کے نیچے خنجر چھپائے۔

بھیک مانگتے ہوئے بے شمار اپاہجوں کو دیکھا ہے۔ میں نے تو صرف دیکھا ہے آپ نے تو بھیک بھی دی ہوگی۔ یا کبھی جیب خالی ہونے پر معذرت بھی کی ہوگی۔ لیکن برہان سے آپ کا سابقہ نہیں پڑا۔ اس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ اس کا ڈھنگ سب سے الگ۔ بھیک دے کر بھی آپ کو اس سے استدعا کرنی پڑے گی کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ یعنی یہ نہیں کہ مانگنا ہی چھوڑ دے۔ لیکن اس دھڑلّے سے نہیں کہ دینے والا کانپ کانپ جائے۔ اس کی گھگھی بندھ جائے۔

اب آپ ہی انصاف کیجیے۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا۔ دور کونے میں کھڑا ہوا چپ چاپ آپ کو دیکھتا رہے گا۔ آپ سامنے سے گذر جائیں گے۔ آپ کی طرف دھیان ہی نہ دے گا۔ یہاں تک کہ آپ اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس توقع میں نظریں پھیر لیں گے کہ یہ لونڈا نظر ملتے ہی گلے کا ہار ہو جائے گا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوگا۔ آپ اس کی غیر متوقع خاموشی پر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھیں گے۔ نظریں ملیں گی تو وہ فوری منہ پھیر لے گا۔ آپ نہایت اطمینان سے آگے بڑھ جائیں گے۔ بمشکل دس قدم جا سکیں گے کہ وہ بجلی کی طرح اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا آپ کو آ لے گا۔ اس طرح کہ آپ محسوس بھی نہ کر پائیں گے کہ کوئی پیچھے سے حملہ کر رہا ہے اور وہ دھڑام سے آپ کے قدموں میں گر کر دونوں ہاتھوں سے پیر تھام لے گا۔

بلا مبالغہ آپ بھی گر جائیں گے۔ کوئی ٹنکی آڑے آئے تو ہواؤں میں بازو پھیلا کر بھائیں بتا کر سنبھل جائیں گے۔ لیکن اپنی چاروں طرف سے راہ گیروں کو زیرِ لب مسکراتا

دیکھ کر کچھ خفیف ہوں گے۔ خود بھی کھسیانی ہنسی ہنس دیں گے اور فوراً جیب سے ایک پیسے کی بجائے ایک اٹھنی نکال کر جھکیں گے اور اس کے ہاتھ میں تھما دیں گے، اور کچھ ایسا ظاہر کریں گے جیسے اس کی اس حرکت پر آپ نے بُرا نہیں مانا لیکن سچ پوچھیے تو آپ بڑی مشکل سے اپنے غصّے پر قابو پا سکیں گے اور اپنے دل میں نفرت کا ایک خزانہ چھپائے چپکے سے آگے بڑھ جائیں گے۔ برہان کی کمینگی پر دراصل آپ کی شرافت نے فتح پائی ہے، ورنہ ہر شخص تھوڑی اس طرح اس کی خطا خندہ پیشانی سے معاف کر دیتا۔

لیکن باوجود اپنی شرافتوں اور نیکیوں کے آپ بھی تو آخر آدمی ہیں۔ مہینے دو مہینے میں گاہے ماہے اس راستے سے آپ کو گذرنا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ اب مہینوں آپ اس طرف نہیں آئیں گے، اور برہان کی یہ بدتمیزی آپ کے ذہن سے دوسرے ہی لمحے محو ہو جائے گی، اور اگر اپنے دفتر کے لیے آپ کو روز ہی اس راستے سے گذرنا پڑتا ہے تو دوسرے دن بھی برہان قاطع (اکثر لوگ اس کو اسی نام سے پکارنے لگے ہیں) آپ سے یہی سلوک کرے گا۔ اس کے بعد تو یقین ہے آپ "گربہ کشتن روزِ دوم" کے مصداق نہ صرف روزِ اوّل ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس کریں گے بلکہ اپنی برہمی کو بھی نہ چھپا سکیں گے اور کان پکڑ کر برہان قاطع کو اپنے قدموں میں سے اٹھائیں گے اور ایک طمانچہ اس کے گال پر رسید کرنے پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ ایک آدھ دھول جمائیں گے اور اچھی طرح سمجھا دیں گے کہ آئندہ سے اگر ایسی حرکت کی تو پھر مار مار کر چمڑی ادھیڑ دوں گا اور ایک دمڑی نہ دوں گا۔

آپ اس کو مار رہے تھے نا، یقین ملنیے میرا جی خوش ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو مشورہ دوں آپ اس کو اس طرح ماریں، اس طرح ماریں۔ اس لیے کہ

مجھے اس سے نفرت ہے۔

میں اس بات کا سخت مخالف ہوں کہ ہم جو ترقی پسندی کا لیبل اپنی پیشانیوں پر چسپاں کیے پھرتے ہیں، سینوں پر لٹکا کر فخر محسوس کرتے ہیں، انسان دوستی پر قلم گھستے اور کاغذ کالے کرتے ہیں، ذرا سی مخالفت پر انجانے تو کیا اپنے جانے پہچانوں کے لیے نفرت اور بغض کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنے تنگ و تاریک سینوں میں چھپا لیتے ہیں۔ کیوں کہ سینے میں دبے ہوئے سمندر کی ساری موجیں بڑی زہریلی ہیں۔ اس لیے جب تموّج تیز ہوتا ہے تو آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ چہرے پر سیاہی کھنڈ جاتی ہے اور روح کتنی ہی سیاہ چادروں میں لپٹے کو چھپائے عالم نزع میں روشنیوں اور اجالوں سے بیزار نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ کیا آدمی آدمی کو معاف نہیں کر سکتا؟

لیکن برہانِ قاطع کے تعلق سے میں خود اس مجرمانہ جذبے کا شکار ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ اس کو معاف کر دوں۔ بات آئی گئی ہوئی ہے تو بھول بھی جاؤں لیکن صاحب اس دن تو بڑی بے عزتی ہوئی ہے نا میری۔ میری بجائے آپ بھی ہوتے تو اپنی انسان دوستی کی ساری قدروں کو برہانِ قاطع کی ناقدری کے ہاتھوں قتل ہوتا ہوا دیکھ کر فساد برپا کر دیتے۔

میں نیا نیا درگاہ یوسفین کے قریبی محلے، آغا پورے میں منتقل ہوا تھا۔ روزانہ شام کو چہل قدمی کرتا ہوا رائل ہوٹل پہنچتا۔ دو چار احباب اور جمع ہو جاتے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک وہیں بیٹھے گپ لڑاتے۔ لیجیے میں تو اپنا پروگرام آپ کو سنانے لگا جس کی یہاں کوئی ضرورت ہی نہیں ——— ہاں تو ایک دن جب میں جنگی آفس کے برابر کی سرائے کے سامنے سے گذر رہا تھا تو پوچھیے مت مجھ پر کیا بیت گئی۔ کتابیں بغل میں دبائے جگالی کرنے کے انداز سے پان چباتے، گنگناتے خراماں خراماں چلا جا رہا تھا ــــ یہی پتہ

نہیں کیا ہوگیا، ایک دم ایک جھٹکا سا لگا۔ دونوں بازو ہوا میں لہرائے جس ہاتھ میں کتابیں تھیں اس ہاتھ نے بڑی محبت سے پاس ہی بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کے سر پر چپت لگادی اور کتابوں نے اس کے قدموں میں بکھر کر ایک حلقہ سا بنالیا جیسے اس کو محصور کرلیا ہو۔ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوگیا کہ میں حیران و ششدر کھڑا اس لڑکی کا منہ تکتا رہ گیا جو قبول صورت تھی جس کو میری کتابوں نے حلقہ بنا کر محصور کرلیا تھا، جس کے سر پر میں نے محبت سے چپت لگادی تھی جس کا شوہر برابر کی دکان پر پان خرید رہا تھا جس سے میں انگریزی میں معافی مانگنے کے لیے ذہن میں کوئی اچھا سا جملہ بنا رہا تھا جو اردو کا ترجمہ معلوم نہ ہو۔ لیکن میں ابھی کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ اس نے خود گل افشانی کی ــــــ "نان سنس، ایڈیٹ، گدا"

لیجئے میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے قدموں میں کتابیں سمیٹ کی تھیں تو اس نے لب نازک کو جنبش دی اور گل ہائے دشنام مجھ پر نچھاور کیے۔ لیکن میں بدنصیب اپنا ذہنی توازن جیسے قریب قریب کھو بیٹھا تھا۔ نزاکت آواز پر بھی تو دھیان نہ دے سکا۔ نہ صرف اس نے مجھے انگریزی میں نوازا بلکہ "گدا" کہہ کر اپنی اردو دانی سے بھی مجھے مرعوب کیا۔ میں سمجھ گیا کہ گدا اس نے اس "بھک منگے" لنگڑے لونڈے کو کہا ہے جو میرے قدموں سے چمٹا اطمینان سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے ایک حد تک سکون ہوا کہ اس نے ہم دونوں ہی کو قصوروار ٹھہرایا ہے اور اس ٹکڑ گدے کو بھی معاون جرم سمجھا ہے۔ میں تو مجرم تھا ہی۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ اس سے انگریزی میں گفتگو کا آغاز کروں لیکن بھلا ہو لوگوں کا جو مرد کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور عورت کی ہمدردی میں اپنے باپ داداؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ میں تو ٹھہرا اجنبی راہ گیر جوان سڑکوں کے لیے بھی ابھی بنا بنایا تھا۔ بے شمار لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مجھے نصیحتیں فضیحتیں کیں۔ بعضوں نے شرافت کا

ثبوت بھی دیا۔ مجھے بے قصور ٹھہرایا اور اس بھک منگے ٹکڑ گدے لنگڑے لونڈے کو بُرا بھلا کہا۔ میری جان میں جان آئی۔ ایک اٹھنی میں نے نکال کر سڑک پر پھینک دی۔ وہ اب تک میرے قدموں سے چمٹا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک اٹھنی مجھے کچھ اور پہلے ہی پھینک دینی چاہیے تھی۔ لیکن میرا تو ذہن جیسے ماؤف تھا۔ سوچ بچار سے بالکل عاری۔ اس نے میرے قدم چھوڑ دیئے۔ اٹھا اور اٹھنی پر بجلی کی طرح گرا۔ میں ابھی اپنی پتلون کی کریز ہی ٹھیک کر رہا تھا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا زمین پر بکھری ہوئی میری ساری کی ساری کتابیں اٹھائے میرے پاس پہنچ گیا۔ مسکراتے ہوئے کتابیں پیش کیں۔ میں نے لیں تو اس نے نہایت اطمینان سے ہنستے ہوئے مجھے سلوٹ کیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ چھٹنے لگے۔ میں نے بھی سوچا کہ اب نکل جانا چاہیئے۔ چنانچہ کتابیں بغل میں دبا لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا۔ دو چار قدم ہی چل سکا تھا کہ جیسے کسی نے کان میں چپکے سے کہہ دیا "اس نے تمھیں گدھا کہا ہے"۔ میرے لیے اس وقت سوائے مسکرا دینے کے چارہ ہی نہ تھا۔ فقیر کا غصہ ہی جب فقیر کی جھولی میں رہتا ہے تو میں کس شمار میں ہیں تو ٹھہرا فقیر گزیدہ۔ خیر صاحب پلٹ کر دیکھنے کی جرأت کی کہ کہیں محترمہ کے شوہر جو اتنے لمبے پورے عرصے میں کہیں غائب تھے پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود محترمہ پیچھا کر رہی ہیں ــــ انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا، میں ٹھہر گیا ــــ قریب آئیں تو مسکرا کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں میرا شکریہ ادا کرنے لگیں۔

"بھوت شکری ہے آپ کا مسٹر"

میں سمجھا طنز کر رہی ہیں، اس لیے میں نے کہا ــــ "میڈم میں پھر ایک بار معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں قصور میرا نہیں بلکہ......"

—— میڈم نے بات کاٹ دی۔

"ام کو تم اکسکیوز کرو۔ ام گالی تم کو نہیں دیا۔ ایک کرمنل گونڈہ امارا پیچھا پیچھا پڑا۔ ام کو چھوڑنا مانگا۔ ام بھوت ڈر گیا مسٹر۔ ام ٹارسی سے آیا۔ ابھی گاڑی سے اترا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے رستم کی طاقت مجھے عطا کر دی ہے۔ میں نے بہت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا۔ لہجے میں پتہ نہیں تھوڑی سی رعونت کہاں سے آدھمکی۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" نہ میں نے اس کو آپ سے مخاطب کیا نہ اب وہ میڈم رہی۔

"امارا انکل بنگل کنٹہ میں رہتا ہے۔ ام کو بنگل کنٹہ تک...."

"اچھا اچھا" میں نے بھی بات کاٹ دی۔

میں نے دیکھا وہ واقعی گھبرائی ہوئی تھی۔

پاس ہی کھڑے ہوئے رکشا والے سے میں نے بات کی۔ اس سے پوچھ کر اس کو صحیح پتہ سمجھا دیا اور تاکید بھی کی کہ احتیاط سے لے جا کر انھیں ان کے گھر ہی پر چھوڑ دے ورنہ نئی نویلی ہیں بھٹک جائیں گی۔

بڑی شرافت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا اور خوش خوش مڑ کر ایک قدم بھی نہ جا سکا تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

دیکھتا کیا ہوں کہ اس کا ایک پاؤں رکشا میں ہے اور ایک پاؤں سڑک پر ٹکا ہوا ہے جس کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے لنگڑا لونڈا اطمینان سے سڑک پر لیٹا ہے اور وہ چیخ رہی ہے۔

میں نے لپک کر اس کو تسلی دی "گھبراؤ نہیں میڈم، یہ وہ گونڈہ نہیں ہے جو ناگپور سے تمھارا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ تو وہی لنگڑا لونڈا ہے۔"

یہ دیکھ کر میرا پارہ بہت چڑھ گیا کہ وہ نہایت اطمینان سے مجھے ٹکر ٹکر گھور رہا ہے اور مسکرا رہا ہے۔

میں نے کان اینٹھ کر اس کو اٹھایا۔ دو طمانچے رسید کیے، لیکن اس نے اپنی پرس سے اکنی نکال کر جھٹ سے اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"یہ تم نے کیا کیا میڈم۔ ایک پیسہ بھی نہ دیتیں اس پاجی کو۔"

لیکن اس کو میرے طمانچوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ اس نے اطمینان سے ہنستے ہوئے میڈم کو سلوٹ کیا اور مجھے خشونت سے گھورتا ہوا چھلانگ لگا کر فٹ پاتھ سے سڑک پر آ گیا۔ اور موٹروں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا جیسے سڑک پر رقص کرنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس نے پھر میرا شکریہ ادا کیا اور رکشا میں سوار ہونے سے قبل اپنی پرس سے تھوڑی سی ریزگاری نکالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی ــــ

"ام تھوڑی چینج ہاتھ میں رکھتا۔"

وہ اور زیادہ گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ کہیں نا گیور سے تعاقب کرنے والا نہ آ دھمکے ـــــ میں نے سوچا ذرا اس کا خوف دور کرنا چاہیئے۔ اس لیے اس سے کچھ اس طرح مخاطب ہوا۔

"تم تھوڑی چینج کیوں ہاتھ میں رکھتا ہے؟"

"ام کو راستے میں مانگنے والا ملے گا تو ام وامیٹ لیسٹ ون ڈب ان کو دے گا۔ پاؤں پکڑنے کو مت بولے گا۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی ـــ "مت بولے گا" میں نے دہرایا۔

وہ بھی ہنسنے لگی۔

وہ سمجھتی ہوگی کہ یہاں بھیک مانگنے کا طریقہ یہی ہے کہ جھٹ سے بھکاری پاؤں پکڑ لیتے ہیں پھر سینے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر بھیک لے کر ہنستے اور سلوٹ کرتے ہیں۔

میں نے بڑے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ اس کو کوئی اعتراض نہ تھا

میں نے کہا "تم اطمینان سے چلی جاؤ اب کوئی بھکاری تم کو نہیں ستائے گا۔ تم پاؤں پکڑنے کو بولے گا تو بھی نہیں پکڑے گا۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ اس شہر کا یہی دستور ہے کہ بھکاری پاؤں تھام کر بھیک مانگتا ہے؟"

اس نے حیرت سے پوچھا "سب پکڑنے کو نہیں مانگے گا؟"

میں نے کہا "کوئی بھی پکڑنے کو نہیں مانگے گا۔ ادھر آئے گا تو یہ لونڈا پکڑنے کو مانگے گا۔ یا پھر میں پکڑنے کو مانگے گا۔"

"تم مانگے گا" اس نے پہلے تعجب سے پوچھا پھر بے اختیار ہنسنے لگی۔

"تم آؤ نا ہمارا انکل کا ہوم۔"

"آؤ نا۔"

اچھا بھئی آجاؤں گا" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کو رکشا میں سوار کرایا اور وہ چلی گئی۔

"ہاتھ ہاتھ میں ۔ مورے ڈنڈاں ڈنڈاں، ڈاں ۔ سلوٹ صاحب۔"

وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی ناک چپٹے سے اچھل کر جیسے میری ناک پر سوار ہونے والی تھی۔ اس کا ٹنڈ منڈ کٹا ہوا پاؤں قمیص کے دامن میں سے مجھے تاک رہا تھا۔

"کیا چاہتا ہے۔ لگا دوں کیا ایک دھول۔"

"وہ بی بی جی اچھی تھیں۔"

"بی بی جی" میں نے دہرایا۔
"وہی میم صاب" اور اس نے اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی ایک جگر مگر کرتی چوانی مجھے دکھلا دی۔
میں سمجھ گیا، بوکھلاہٹ میں اکنی کی بجائے چوانی اس نے دے دی تھی۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا — ہانتھ ہانختیں۔ مورے ڈڈاں، ڈڈاں —" سامنے سڑک پر مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی، اور وہ اپنی ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا چھلاوہ بن چکا تھا۔
دوسرے دن میں رائل کی طرف نہ جا سکا۔ تیسرے دن شام کو دکان پر کھڑا ہوا پان بنوا رہا تھا کہ برہان آ دھمکا۔
"کل آئے نہیں آپ۔ اُدھر بی بی جی کی طرف رہ گئے ہوں گے؟"
"بی بی جی کی طرف؟" میرا ذہن فوری منتقل نہ ہوا۔
"وہی صاب، اپنی گوری گوری میڈم چوانی والی۔"
"اچھا جی! اب مجھے یہی کام رہ گیا ہے کہ جس میڈم سے تم کو چوانی مل جائے اس کی خیریت سے تمھیں آگاہ کرتا رہوں۔"
برہانِ قاطع نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں اس سے علانیہ جھوٹ بول رہا ہوں، اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔
میں نے اس کی مسکراہٹ کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"تم نے پرسوں اس سے بھی وہی ذلیل حرکت کی! بھیک مانگنے کا یہ بیہودہ ڈھنگ تم نے کیوں اختیار کیا ہے۔"
وہ کھڑا مسکراتا رہا اور میرے سوال کے جواب میں ایک ہاتھ سے قمیص کا دامن

اٹھا کر اپنا ننگا پیٹ بجانے لگا۔

میں نے لہجے میں تھوڑی سی برہمی کو شامل کرتے ہوئے کہا۔

"پھر مجھ سے بدمعاشی کی بات کرتا ہے۔ میں تجھ سے بھیک نہ مانگنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن شریف لوگوں کو بیچ سڑک پر اس طرح رسوا کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔"

"سیدھے مانگنے پر لوگ پیسہ نہیں دیتے بابوجی۔"

"پیر پکڑ لینے سے دے دیتے ہیں؟"

"ہاں! پر میں سب کے پیر نہیں پکڑتا بابو۔"

"کیوں؟"

"سب اچھے دل کے نہیں ہوتے بابو۔"

"اچھا۔ تو جانتا ہے کہ سڑک پر اتنے تمام چلنے والوں میں کون اچھے دل کا ہے کون بُرا؟"

"ہاں صورت دیکھ کر کچھ کچھ تو جان لیتا ہوں۔"

میں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے، پاس سے گزرتے ہوئے ایک پہلوان کی طرف اشارہ کیا جس کا سر گھٹا ہوا تھا جس کے گلے میں تعویذ تھا اور جو مہین سے کرتے میں سے اپنے چوڑے چکلے سینے کی نمائش زیادہ کر رہا تھا اور سڑک پر چل کم رہا تھا۔

"پکڑ لے نا اس کے پاؤں۔ تب جانوں۔"

وہ اس کو گھورنے لگا۔

میں نے ڈرایا "دیکھ کیا رہا ہے، مارے ٹھوکروں کے دم لے لے گا تیرا۔"

میں بس اتنا کہہ پایا تھا کہ وہ ایک ٹانگ پر اُچھلتا ہوا جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قریب پہنچ کر دھڑام سے اس کے قدموں میں گر کے اس سے

چمٹ گیا۔ پہلوان ایک دم اُچھل پڑا تو برہان قاطع کا سر اور دھڑ بھی سڑک سے کچھ اوپر اٹھتا ہوا سا محسوس ہوا۔ یعنی جسارت کر کے اُچھلتے وقت بھی اس کے قدم اس نے سنبھال رکھے تھے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پہلوان نے جیب سے کچھ نکالا اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جھک کر اس کو اٹھایا۔ اس کے سلوٹ کرنے پر پیٹھ ٹھونک کر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پنواڑی بھی میری اور برہان قاطع کی باتیں سن چکا تھا اس لیے وہ بھی کسی غیر متوقع حادثے کا منتظر تھا۔ وہ ہنستا ہوا کہنے لگا۔

"مار دیا بازی۔ بڑا حرّاف ہے صاحب یہ حرامی۔"

میں نے پنواڑی سے پوچھا "لونڈا اس سے واقف تو نہیں ہے؟"

گو جبران پنواڑی نے یقین دلایا کہ وہ اس کو پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

میں نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر دھوئیں کی ایک چادر ہوا میں پھینک دی، اور اس کی اوٹ میں اپنی آنکھوں کو چھپا لیا۔ ابھی یہ چادر پوری طرح میری آنکھوں کے آگے سے ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ برہان سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں نے ہاتھ ہوا میں ہلا کر دھوئیں کی چادر کے ٹکڑے کر دیئے تو اس کے کھلے ہوئے ہاتھ پر ایک آنہ اور ایک ادھنّی چمک رہی تھی۔

"تو کب سے جانتا ہے اس کو؟"

"بس ابھی سے۔ جب سے آپ جانتے ہیں۔"

"پھر!"

"پھر کیا بابوجی؟"

میں کچھ بوکھلا گیا۔ اور اس کیفیت کو چھپانے کے لیے میں صرف غصّے ہی کا

سہارا لے سکتا تھا۔

"ابے جھوٹ کیوں بولتا ہے پاجی!"

"جھوٹ نہیں بولتا بابو جی۔ اللہ قسم جھوٹ نہیں۔"

"پھر!"

"پھر کیا؟"

"ابے ڈر نہیں لگا تجھے اس کے پیر پکڑتے ہوئے؟"

"بالکل نہیں لگا ڈر۔"

"کیوں؟"

"بابو جی وہ تو مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ سینہ تان کر چل رہا تھا۔ اس کو اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ ہے نا ـــ بس۔"

وہ رک گیا اور اس کی ناک جیسے چٹ سے اچھل کر میری ناک پر سواری کرنے کی تیاری میں تھی۔

"تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا۔"

"بس ـــ بول دیا نا ـــ ایسا آدمی کبھی کسی بچے کو اور مجھ جیسے لنگڑے کو مار نہیں سکتا بابو جی۔"

میں نے ایک اور دھوئیں کی چادر ہوا میں پھینک دی اور اپنا چہرہ چھپا لیا۔ چادر ہٹی تو وہ سڑک پر رقص کرتا ہوا سڑک کو عبور کر رہا تھا۔

میں حسبِ معمول رائل ہوٹل پہنچا تو خلافِ توقع آج میرے ساتھیوں میں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ بے دلی سے کچھ دیر بیٹھا رہا۔ چائے پی۔ سگریٹ کا پیکٹ نکالا تو وہ خالی تھا۔ سوچا کہ اب واپس ہی کیوں نہ لوٹ جاؤں۔ گیٹ پر آیا تو

اُجلی پرچھائیاں

برہانِ قاطع

سامنے مجمع تھا۔ سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور سگریٹ جلاکر اپنی راہ لی۔ مجمع کے قریب پہنچا تو حسب توقع نہ وہاں کوئی مداری تھا، نہ مسمریزم کرنے والا اور نہ کوئی دوائی بیچنے والا — دو آدمی جھگڑ رہے تھے۔ سارا مجمع جیسے جھگڑا چکا رہا تھا۔ حالانکہ سب کے سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی مجمع میں شامل ہوگیا۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے

"واہ صاحب واہ، آپ تو تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"تو حضرت سڑکوں پر منہ کے بل گرکر خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے تعلیم نہیں پائی میں نے"

کسی دوسرے نے کہا —

"ٹھیک ہے مولانا۔ پر نہ کوئی آپ کے بازو برابر کا آدمی تو نہیں ہے۔ ذلیل سہی کمینہ اور سفلہ سہی، اپاہج ہے، اور پھر ٹانگ برابر کا لونڈا ہی تو ہے۔"

کسی تیسرے نے کہا —

"ہاں جی گوشمالی کی ہوتی۔ چانٹا رسید کیا ہوتا۔ دھپیا دیتے۔ لیکن اس طرح نوٹ تار تار کر بھرکس تھوڑی نکال دیتے ہیں۔ خوب تعلیم پائی صاحب خوب شرافت دکھائی۔"

"اجی بڑے آئے حمایت کرنے والے، گھر لے جاکر پرورش کیجیے۔ آل اولاد نہیں ہے تو فرزندی میں قبول کیجئے۔ میں نے جو کیا درست ہی کیا۔"

اور کسی کرخت آواز کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔

"کون ہے رے سالے خٹل نٹل۔ کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے! — ذرا میں بھی تو دیکھوں — بیٹے اپنی صورت بھول جاؤ گے۔ جرو اسالی پہچان نہ سکے گی۔"

اور منجلے میاں پرانے ٹائروں کی دکان سے چھلانگ لگاکر مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا — میں نے دیکھا تھا۔ چھلانگ لگانے سے قبل اپنے تہمد کی گانٹھ اس

نے مضبوط کرلی تھی۔ اس کے بعد میں مجمع میں آگے نہ بڑھ سکا، اور یہ خیریت اسی میں معلوم ہوئی کہ دور سے نظارہ کروں۔ اور عواقب کو پیش نظر رکھوں۔ میں دس قدم پیچھے ہٹ کر فٹ پاتھ پر آگیا۔

منجلے میاں کی آواز مسلسل آرہی تھی "مولوی صاحب آپ کے پیر پکڑتا ہوں آپ بیچ میں نہ آئیں بس ایک ہاتھ دکھادوں سالے کو۔ دوسرا ہاتھ لگاؤں تو چیل کوؤں کی نسل۔ چھپکلی کی اولاد۔"

بیسیوں آوازیں مل گئیں۔

"نہیں بھئی نہیں۔"

"جانے بھی دو منجلے میاں۔"

کسی نے مخالفت کی ـــــ

"جانے کیوں دیں، مولوی صاحب سے بدزبانی کررہا تھا۔ جماد ے بڑے بھائی ایک پرانے ٹائر کا ہاتھ۔"

شاید وہ پکار رہا تھا ـــ "ارے میری ٹائی تو چھوڑ دے شیطان۔"

دو چار پولیس کے جوان بھاگے آئے۔ لوگ چھٹنے لگے۔ کچھ نیتوں نے سپاہیوں کی جگہ لی۔ لیکن فوری ادھر ادھر ہو گئے۔ چھٹتے چھٹتے مجمع چھٹ گیا۔ منجلے میاں بڑبڑاتا ہوا اپنی دکان میں گھس گیا۔

بانی فساد ٹائی والا جنٹلمین مجھے نظر نہ آیا۔

میں اطمینان کا سانس لے کر قریب پہنچا تو سعدیہ ہوٹل کی سیڑھیوں پر برہان قاطع اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ آس پاس کے دکان والے رکشا والے اس سے ہمدردی کررہے تھے۔

اس کی ناک پر خراشیں تھیں اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا ہینڈک پیر تلے آکر دب گیا ہے جس کو اٹھا کر برہان نے اپنی پیشانی کے نیچے جما لیا ہے اور جو ذرا سے دھکے سے گر جائے گا — لیکن اس کو اس ہینڈک کی پروا نہ تھی۔ وہ رہ رہ کر اپنی پسلیوں کو اور کمر کو دبا رہا تھا۔

"آوارہ" کے راجکپور کی طرح اونچی پتلون پہنے، دلیپ کمار کی طرح بال جمائے تیل کی شیشیوں کا اسٹینڈ ہاتھ میں تھامے ایک تیل مالش والا لونڈا برہان قاطع کی طرف بڑھا پرانے یار کی طرح اس کی پیٹھ ٹھونکی، سر پر ایک چپت لگا کر کہا "چل پہلوان ٹھوک بجا کر پھر کل کے لیے تیار کر دوں تجھے"

برہان قاطع سیڑھیوں پر دراز ہو گیا تھا اور مالش کرواتے ہوئے عجیب عجیب صورتیں بناتا ہوا کہہ رہا تھا —

"اللہ قسم بوٹی بوٹی الگ کر دی — ذرا آہستہ ہاتھ دھرنا راجہ بھائی" اور راجہ بھائی اس کی کچھ سنے بغیر ہاتھ پر ہاتھ دھر رہا تھا۔ برہان بعض وقت منہ بناتا۔ بعض وقت کراہتا۔ بعض وقت "مر گیا باپ" کہہ کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتا۔ "ہے ہے میں سمجھا تھا باپ اتنا مارے گا — راجہ بھیا مر گیا — ذرا ہاتھ روک لے باپ"

راجہ بھیا نے گلے کی انگلی سے پیشانی کے پسینے کی بوندیں پونچھ کر پسینہ ٹپکاتے ہوئے برہان قاطع کو دیکھا تو وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہاں شاباش — چل — ح — ا — ل کھڑا ہو جا۔

اور بدقت تمام برہان قاطع کھڑا ہو سکا۔

مجھ سے نظریں ملیں تو سلوٹ مار کر مسکرانے لگا۔

میں نے پوچھا "کیسے چوٹ آئی ماہر نفسیات ؟"

وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

میں نے وضاحت کی کہ "تم نے غلط آدمی کے پاؤں کیسے تھام لیے۔ چہرہ دیکھ کر نہ پہچان سکے کچھ؟"

"بالکل نئیں پچھانا بابوجی، پاؤں کٹیں حرامی کے۔ اللہ قسم کیا ٹھوکراں لگایا ہے"

"تم ان حرکتوں سے باز کیوں نہیں آتے، چھوڑ کیوں نہیں دیتے اس طرح مانگنا۔"

"پھر کس طرح مانگوں بابوجی؟"

"جیسے سب مانگتے ہیں!"

"نئیں دیتا بابوجی کوئی ــ اللہ قسم"

"دے گا بھئی۔ نہیں کیوں دے گا۔ سب کو آخر دینا ہی ہے۔"

"آج سے چھوڑ دوں گا بابو۔"

"ہاں۔ شریفوں کی طرح مانگا کرو۔ تمھیں پتہ ہے! لوگ تمھیں برہان قاطع پکارنے لگے ہیں؟"

"ہو بابوجی ــــــ کیوں پکارتے ہیں؟ بس ایک بار مولوی صاحب بولے اور سب پکارنے لگے۔"

"اس لیے کہ تم راہ چلتوں کو لوٹتے ہو۔"

"نئیں جھوٹ بات، میں کاں لوٹتا ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگا۔

دوسرے دن سے اس نے اس طرح مانگنا ترک کر دیا۔ روز ہی شام کو رائل ہوٹل جاتے وقت پنواڑی کی دکان پر اس سے ملاقات ہوتی ــ سلوٹ کر کے چپ چاپ کھڑا ہو جاتا۔ میں دو پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بادل ناخواستہ مسکراتا تو جواب

میں اس کی مسکراہٹ سے محروم رہتا۔

تین دن اسی طرح گذر گئے۔ گوجران پنواڑی نے کہا "اس دن سے بڑا شریف ہوگیا ہے لفنگا۔ کسی کو نہیں چھیڑتا ــــ اس دن جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا صاب۔ اس لمڈے کو جرورت تھی اسی بات کی۔"

چوتھے دن پنواڑی کی دکان پر وہ مجھ سے نہیں ملا۔ میں نے پوچھا "گوجران کیا بات ہے، آج برہان نہیں آیا؟"

"جرور آیا ہے۔ ابھی ابھی تھا۔ وہ ٹھیک نہیں ہونے کا صاب۔ پھر وہی کرنے لگا باجی۔"

میں نے لونگ پھینک کر گلوری منہ میں رکھ لی ــــ کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ برہان قاطع دکھائی دیا۔ سرائے کی دیوار کے پاس کونے میں کھڑا وہ موت رہا تھا ــــ مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے نظریں پھیر لیں۔ میں سمجھ گیا وہ مجھے چکر دے کر نکل جانا چاہتا ہے میں جب وہیں ٹھہر گیا تو وہ مجبوراً میری طرف بڑھا۔

"تم نے پھر ــــ!"

اور اس نے جملہ پورا ہونے سے قبل ہی اعتراف کیا ــــ

"نئیں کرتا تھا بابوجی۔ پر کیا کروں۔ دن میں ایک ٹیم بھی بھر پیٹ نہ کھا سکا۔ کل تو صرف "چھٹانوں" پر رہ گیا ــــ اللہ قسم بابوجی آج پیٹ بھر کھایا ہوں۔"

میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، اور پھر کہتا بھی تو کیا کہتا۔ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا تو اس نے خود پوچھا "خفا ہو بابوجی" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ برہان کبھی رو ہی نہیں سکتا۔ اس کو میں نے بری طرح پٹتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت بھی وہ مسکرا رہا تھا۔ لونڈا ہے بڑا ذہین۔ کوئی چال تو نہیں چل رہا ہے؟

برہانِ قاطع

میں نے کن انکھیوں سے اس کو دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں
میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا تو برہان میرے قریب آ گیا۔ کہنے لگا۔

"بابوجی، تین دن سے فاقہ کر کے آج میری ماں پڑوس میں آٹا قرض مانگنے چھوٹے خاں ٹیکسی ڈرائیور ہے نا، اس کے گھر گئی تھی۔ سالے کی جورو اگھر پر نہیں تھی۔ ماں کو بہن بہن پکارتا تھا۔ تین دن فاقوں کا حال سن کر ماں کا ہاتھ پکڑ لیا نا حرامی۔"

اس نے کچھ رک کر پھر کہا۔

"میری ماں بڑی بہادر ہے۔ دو جھانپڑ میں ٹھیک کر دیا بیٹا کو۔"

اس کی آنکھوں میں اب نمی باقی نہ تھی۔ شاید ماں کی بہادری پر وہ فاتحانہ طور پر مسکرا رہی تھیں جو ان میں چمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں سوچنے لگا برہان قابلِ نفرت ہے یا نہیں۔ میں نے اس سے زیادتی کی ہے۔ پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس کی رگوں میں پارہ نہیں انسانی خون دوڑ رہا ہے۔

یکایک وہ پھر کہنے لگا۔

"مولوی صاحب بول رہے تھے کہ ماں کا کسی سے نکاح کرا دوں وہ بڑی اچھی ہے میری ماں معلوم نہیں ہوتی بابوجی ــــ وہ اتنی خوبصورت ہے مگر ـــ" اور برہان جملہ پورا کیے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جیسے اس کے بعد برہان سے اپنا رویہ بدل دیا۔ انسانیت کے کتنے مستحسن پہلو اس ہمدردانہ جذبے میں پنہاں تھے اس کا مجھے کچھ علم نہیں اس لیے کہ میں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ وہ نفرت جو برہان کے تعلق سے اپنی مضبوط جڑیں میرے ذہن میں پیوست کر رہی ہے اس کو اپنے دل و دماغ سے اکھیڑ پھینکوں۔

لیکن میں آج بھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ گوجران پنواڑی کی دکان پر گلوری سے لونگ نکال کر جب میں گلوری منہ میں رکھتا ہوں اور دیا سلائی سے سگریٹ جلا کر دھوئیں کی چادر ہوا میں پھینک دیتا ہوں تو ایک لنگڑا لونڈا جس کے جسم میں انسانی خون نہیں پارہ ہے موٹروں اور رکشاؤں سے بچتا ہوا سڑک پر رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو سوائے میرے ہر راہ گیر کا پاؤں پکڑ لیتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرے لیے اس کی ان حرکتوں میں کوئی نیا پن نہیں رہا جس طرح دوسرے لوگ اس کی حرکات سے مانوس ہو گئے تھے۔ میں بھی اس کو اسی طرح دیکھ کر گذر جاتا جیسے سگریٹ کا کش لگا رہا ہوں یا پان کی پیک سڑک پر تھوک رہا ہوں۔

لیکن ایک دن اس نے پھر مجھے جیسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

آفس جاتے ہوئے میں نے گوجران پنواڑی کی دکان پر رک کر حسب معمول پان لینا چاہا تو وہ دکان کے پٹ بھیڑ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بھی گوجران نے پان بنانے کی زحمت نہ کی تو میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے گوجران؟"

وہ بہت دکھی تھا۔ اس نے کہا ــــــ

"آپ کو معلوم نہیں صاب؟ اپنے برہان نے مولوی صاحب کو فجر کی نماز پڑھتے وقت چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔"

"برہان نے نا۔۔۔" مجھے یہ بات کچھ ناممکن سی معلوم ہوئی۔

میری حیرانی دیکھ کر گوجران کہنے لگا ــ "وہ مولوی صاحب تھے نا۔ برہان کی ماں سے ان کے تعلقات تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی ماں سے وعدہ کرتے کہ اس سے نکاح کر لیں گے

لیکن سُنا ہے کہ برسوں وہ صاف انکار کر گئے۔"

میں جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

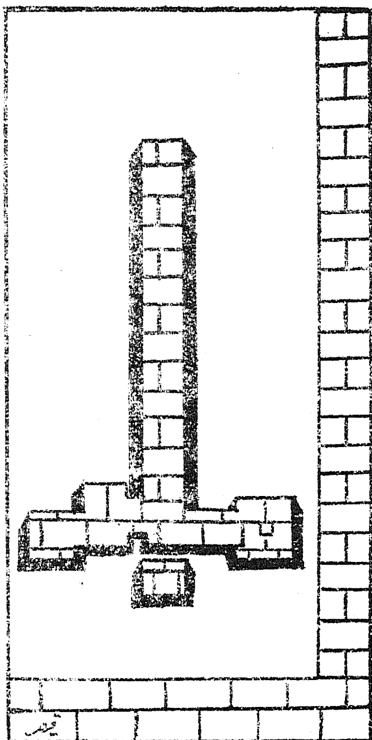
گوجران دکان بند کر کے جانے لگا تو میں نے پوچھا "کیا آج دکان بند کر کے جا رہے ہو؟"

گوجران نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ــــ

"آج کام میں کچھ جی نہیں لگ رہا ہے صاب! برہان بہت یاد آ رہا ہے"

جانے کیوں میرے قدم بھی دفتر کی جانب نہ بڑھ سکے اور میں گھر لوٹ آیا!





ملبہ

فانوس بجھ گئے۔ قمقمے گل ہو گئے۔ لیکن نواب کبیر حسین خاں برآمدے میں ٹہلتے ہی رہے ــــ

آرام گاہ میں داخل ہوئے بڑے نواب صاحب کو پندرہ منٹ ہی گذرے ہوں گے۔ گلبدن بوا پلنگ پوش کی سلوٹیں صاف کرتی ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے آدھا جسم زمین پر اور آدھا جسم پلنگ پر پھینک کر بس دو چار بار پلکیں جھپکا سکیں اور پھر جیسے فرشتوں نے انھیں آہستہ آہستہ زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ انھیں اپنے ٹوٹے ہوئے بدن کی کچھ سدھ بدھ نہیں رہی ــــ نواب صاحب خواب گاہ میں داخل ہوئے تو انھیں گلبدن بوا کی عبارت پر بے اختیار پیار آگیا ــــ آنکھ کھلی تو گلبدن بوا نے دیکھا کہ فرشتوں نے انھیں نواب صاحب کی گود میں پھینک دیا ہے ــــ انھوں نے سوچا کہ جس کا نمک رگ رگ میں ہو اس کی ہو رہنا بھی تو نمک حلالی ہے ــــ اور صبح ہوتے ہوتے گلبدن بوا، گلبدن بیگم بن گئیں ــــ

سرفراز علی بے چارہ اردلیوں کا صدر تھا۔ یہ اعزاز نواب صاحب نے دیا تھا

نواب صاحب کے ایک موروثی دشمن نے جب ان پہ حملہ کیا تھا تو سرفراز علی نے ہی اپنی جان پہ کھیل کر نواب صاحب کو بچایا تھا۔ نواب صاحب بھی جوہر کے قدرداں تھے۔ نوازا اور دل کھول کر نوازا ـــــ انعام اکرام تو روز مرہ کی بات تھی۔ پھر ساری ڈیوڑھی سرفراز میاں، سرفراز میاں کہہ کہہ منہ سکھاتی تھی ـــــ لوگ نواب صاحب سے نظریں چار نہ کر سکتے تھے اور سرفراز علی کی نظروں کو تکتے تھے۔ سرفراز علی مہربان ہو جاتے تو نواب صاحب کی مہربانیاں بھی شامل حال ہوتیں ـــــ زمین بوس ہو کر فرشی سلام کرنے والوں کی جانب نواب صاحب کی نظر اٹھ جاتی تو گویا سلام قبول ہو جاتا۔ لیکن سرفراز میاں کی بات الگ تھی۔ نواب صاحب سے رازدارانہ باتیں ہوتیں۔ لوگ محسوس کرتے کہ مولاً شاہ کے پیر کتر رہا ہے ـــــ لیکن جب گلبدن بوا، گلبدن بیگم بن گئیں تو ساری ڈیوڑھی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ـــــ

گلبدن بوا، سرفراز علی کی بیاہتا بیوی تھیں، اور سرفراز میاں لوگ کہتے ہیں کہ بوا پر جان چھڑکتے تھے ـــــ بوا بھی سرفراز علی کو اپنے سر کی قسمیں دیتی رہتی کہ نواب صاحب کے لیے مال فراہم کرتے کہیں خود کسی کے نہ ہو رہنا ـــــ اور سرفراز علی کسی کے نہ ہوئے ـــــ بھرے بازار سے اٹھا کر انھوں نے نواب صاحب کی خلوت میں بلبل کو داخل کیا اور پھر اس تاریخ سے ان کو اپنی مالکن سمجھا اور پھر ان کی تعظیم و تکریم کی ـــــ

ایک قصہ تو اس طرح بھی مشہور تھا کہ نواب سکندر حسین خاں کی والدہ کو سرفراز علی نے ہی مار کر ٹرین کے ڈبے سے دھکیل دیا تو نواب صاحب جب اپنی جاگیر گئے تھے تو ان کی نظر ایک لڑکی پر پڑ گئی ـــــ یہ نواب صاحب کے بہار کے دن تھے۔ بس حکم ہوا کہ محل میں داخل کر دی جائے۔ لڑکی کے ماں باپ اگر راضی نہ ہوں تو انھیں یقین دلایا جائے کہ ہم لڑکی سے

باضابطہ عقدِ شرعی کریں گے۔

لڑکی والے نہ مانے۔ پکڑ دھکڑ کر بے زبان گائے کو اسٹیشن تک لایا گیا —— ٹرین چھوٹنے ہی کو تھی۔ بیچاری نے سوار ہونے میں پس وپیش کیا۔ سرفراز علی نے کھینچ کر دو لاتیں اس کی چونڑوں پر جڑ دیں اور سرکتی ہوئی ٹرین میں ڈھکیل دیا —— دوسرے دن ڈیوڑھی میں جب وہ پاندان کھولے مسند پر بیٹھی تھیں تو سرفراز علی نے سرو قد ہو کر بیگم کو سلام کیا اور ہاتھ باندھے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ آنکھیں تک چار نہ کیں —— لیکن آج دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اپنی بیوی بھی مالکن بن گئی تھیں۔ نواب صاحب کے معتمد خاص نے تخلیے میں سرفراز علی کو بہت سمجھایا —— تین دن سے سرفراز علی نے کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت رونے سے سارے آنسو ختم ہو گئے ہیں اور اب آنسو کی جگہ خون نے لے لی ہے لیکن جیسے یہ خون بھی آنکھوں تک پہنچ کر خشک ہو گیا تھا ——

معتمد صاحب نے راز میں بات چیت کی تو لوگوں نے سرفراز علی کی سسکیاں تین دن بعد پھر سنیں —— گلبدن بیگم نے مہر معاف کر دیا، سرفراز علی نے طلاق دے دی۔ نواب صاحب نے جو گراں قدر رقم سرفراز علی کو بھیجی تھی وہ لوٹاتے ہوئے سرفراز علی نے نہایت ادب سے ایک خواہش کی کہ گلبدن بیگم کو صرف ایک بار دیکھ لینے کی اجازت دی جائے۔ نواب صاحب نے اس کو مناسب نہ سمجھا، ٹال جانا چاہا لیکن گلبدن بیگم سے مشورے پر انھوں نے جب کوئی مضائقہ نہ سمجھا تو سرفراز علی کو اجازت دے دی گئی۔ گلبدن بیگم چھجے پر جلوہ افروز ہوئیں، نواب صاحب ذرا سا اوٹ میں چھپ گئے۔ سرفراز علی طلب کیے گئے۔ نظریں اٹھیں۔ انھوں نے گلبدن بیگم کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دوہرے

ہوکر فرشی آداب بجا لایا اور پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیوانہ وار بھاگے ــــ اس کے بعد سنتے ہیں کہ سرفراز علی نے کبھی ڈیوڑھی کا رخ نہیں کیا اور کسی خیراتی ہسپتال میں مر گئے۔

گلبدن بوا جب نواب صاحب کے عقد میں آئیں تو پورے دس ماہ بعد نواب قلندر حسین خاں پیدا ہوئے ــ دو تین ماہ پہلے تولد ہو جاتے تو آج یہ چلتا پھرتا تناور درخت جس کے ٹھنڈے سائے میں ڈیوڑھی کے لوگوں کو اپنی باقی زندگی بتانی تھی کسی سوکھے ٹھنٹھ کی طرح کسی گوشے میں دھوپ چھاؤں اور سرد گرم سہتا رہتا۔ لیکن نواب صاحب کو یقین تھا کہ بلا شرکت غیرے زمین کی آبیاری انھوں نے کی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہے پودے کو پروان انھوں نے چڑھایا ہے ــ اسی لیے تو نواب قلندر حسین خاں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ بس باپ کے منہ سے ٹپک گئے ہیں۔ چال ڈھال، رنگ روپ، دوھری ہڈی، عمر سے زیادہ گوشت پوست اور چربی ــــ نواب صاحب کو اگر جوانی بخش دی جائے تو اللہ میاں بھی پہچان نہ سکیں کہ باپ کونسا ہے اور بیٹا کونسا؟ ــــ اسی لیے تو وہ نواب صاحب کے چہیتے تھے۔ ورنہ ڈیوڑھی بھر میں کتنے ہی ایسے ننگے بچے درخت ہر کونے میں پڑے سوکھ رہے تھے جن کے متعلق نواب صاحب کو شبہ تھا کہ تخم کسی نے بویا ہے تو کھاد انھوں نے دی ہے۔ تخم انھوں نے بویا ہوگا تو کھاد کسی اور نے دی ہوگی ــــ دونوں کام نواب صاحب نے نہیں کیے۔ جب اس بات کا یقین ہو جائے کہ فصل اپنی نہیں تو کون دردِ سر مول لے۔ کون جھگڑوں سے بچائے۔ کون پتے اور ٹہنیاں گن گن کر پروان چڑھائے۔ آخر قدرت کے تفویض بھی تو کچھ کام ہیں۔

نواب قلندر حسین خاں نے حضور ابا کا دل اس طرح موہ لیا تھا کہ ان جیسا بیٹا شہر بھر میں ایک آدھ ہی تھا۔ باپ کے سامنے ہوتے تو نظریں زمین سے ہٹانے کی ہمت نہ

ہوتی ـــــ ہاتھ باندھے، ٹوپی اوڑھے اس طرح منقطع بنے رہتے کہ اب سجدہ کریں گے اب سجدہ کریں گے ـــــ نئی نویلی شادی ہوئی تھی لیکن کبھی بھی انھوں نے آبا حضور کے آرام کرنے تک حجلۂ عروسی کا رخ نہ کیا۔ دلہن انتظار کرتی کرتی تھک جاتیں ـــــ تنہائیوں سے اکتا جاتیں، پھر ماحول کی اجنبیت سے مجبور ہو کر تنہائیوں سے سمجھوتہ کر لیتیں، تنہائیوں کی ہو رہتیں۔ لیکن نواب قلندر حسین خاں ان ساری باتوں سے بے نیاز آبا حضور کے آگے مسجد کے پیش امام یا درگاہ کے مجاور بنے رہتے۔

اس وقت بھی جب کہ نواب صاحب آرام گاہ میں بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے نواب قلندر حسین خاں نے فانوس اور قمقمے گل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ جگمگاتی ڈیوڑھی نے چشم زدن میں سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے حجلۂ عروسی میں قید تنہائی کاٹنے والی دلہن نے چپکے سے اپنے دل کی دنیا کے اندھیرے ساری ڈیوڑھی میں گشت کرنے کے لیے چھوڑ دیئے اور ان اندھیروں میں نواب قلندر حسین خاں آبا حضور کے خراٹوں کی آواز سننے کے لیے بے قرار ٹہل رہے تھے۔ اس لیے کہ آبا حضور جب تک سو نہ جائیں وہ کس طرح اپنی منتظر دلہن کے پاس جا سکتے تھے ـــــ انھیں اپنے اجداد سے ترکے میں یہی چند چیزیں تو ملی تھیں۔ بزرگوں کا ادب، بڑوں کا احترام یہ ان کا زیور تھا، اور وہ اس زیور سے ہمیشہ آراستہ رہتے اور پھر آبا حضور کے آگے سیدھی سیدھی سانس لے لینا ہی ان کے لیے بہت تھا۔ بھلا آبا حضور کے جاگتے وقت ان کا ذہن دلہن کا خیال کرنے کی گستاخی بھی کر سکتا تھا ـــــ اللہ اللہ کر کے آبا حضور نے خر خر شروع کی اور وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں ساری حویلی کا چکر کاٹ کر پائین باغ میں داخل ہوئے جہاں ان کی دلہن ان کے انتظار میں جاگ

جاگ کر جماہیاں لے رہی تھیں۔

دلہن کے کمرے میں بھی نواب قلندر حسین خاں دبے پاؤں داخل ہوئے —— سوچا اگر دلہن سو رہی ہیں تو خود بھی چپ چاپ لمبی تان لیں تاکہ دلہن کو ان کے اس قدرت دیر سے آنے کا اندازہ نہ ہو سکے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار انھوں نے یہ حرکت کی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دس پندرہ منٹ بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے پھر خود ہی دلہن کو جگا لیتے۔ دلہن بھی اس طرح کچی نیند سے بیدار ہوتیں جیسے ابھی ان کی آنکھ لگی تھی —— کبھی کبھی تو واقعی چوکھٹ پر نظر جمائے آہٹ کی منتظر دھاگتے جاگتے سو جاتیں۔ کبھی جاگتی رہتیں تب بھی لحاف میں منہ چھپائے پڑی رہتیں، زبان سے کچھ نہ کہتیں۔ لیکن آج خلافِ توقع پلنگ پر بیٹھی ہوئی وہ سسکیاں لے رہی تھیں۔ نواب قلندر حسین خاں کو دیکھا تو نظر بچا کر آنچل سے آنکھیں خشک کرنے لگیں۔ قلندر حسین خاں سیدھے سادے نواب تھے۔ ساحلِ سمندر پر رہیں گے لیکن نہ طغیانیوں کا اندازہ نہ طوفانوں کی آمد کا پتہ۔ پانی سر سے اونچا ہو جاتا تو ڈوبنے وقت انھیں اس کا اندازہ ہوتا کہ وہ ڈوب رہے ہیں۔ لیکن ابھی تو طغیانیاں دلہن کے سینے میں مچل رہی تھیں یا دل منڈلا رہے تھے کھل کر کب برسیں گے اس کا خود دلہن کو علم نہ تھا۔ آج دو چار قطرے برس پڑے تھے تو نواب قلندر حسین خاں نے محسوس تک نہ کیا کہ گھٹائیں امڈ امڈ کر چھا رہی ہیں تو کبھی کبھی ٹوٹ ٹوٹ کر برس بھی جاتی ہیں۔ انھوں نے صرف اتنا ہی پوچھا کہ "بیگم نصیب دشمناں طبیعت ناساز تو نہیں۔ آپ اتنی رات تک جاگ کیوں رہی ہیں؟" —— دلہن جو ڈیوڑھی بھر کے لیے دلہن بیگم تھیں اور نواب قلندر حسین خاں کے لیے صرف بیگم —— کچھ بھی نہ کہہ سکیں —— بستر کی شکنوں نے نشتر بن کر دلہن کو کچوکے دیئے۔ دیواروں پر ٹنگی

ہوئی تنہائیوں نے دلہن کے کانوں میں سرگوشیاں کیں ــــ کھلی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے دلہن کو اشارے کیے ــــ کہہ دو دلہن ــــ آج ہی کہہ دو ــــ کہ تم ڈیوڑھی کے طویل طویل احاطے میں بھٹکتی ہوئی زخمی روحوں سے واقف ہوگئی ہو ــــ ایسی روحوں سے جن کے ماضی کو........ بڑے نواب صاحب نے حرفِ غلط کی طرح محو کروا دیا ہے۔ ان روحوں کا نہ کوئی ماضی ہے اور نہ کوئی مستقبل۔ لوحِ پاک میں ان کے ناموں کے متوازی ان کی تقدیر صرف تین لفظوں میں لکھی گئی ہے۔ پیدائش، عقد، موت۔ پیدائش سے لے کر موت تک اتنی لمبی پوری مدت میں ان کو نہ کوئی نیکی کرنی ہے اور نہ کسی بدی سے ان کا واسطہ ہے۔ اللہ نے اشرف المخلوقات کو پیدا کیا اور بہت سے کام اس کے تفویض کیے لیکن اللہ نے انھیں صرف ایک ہی کام دیا اور وہ تھا نواب صاحب سے عقد کر لینا۔ اس کے بعد اللہ نے اور کوئی کام سونپنے کی ضرورت نہ سمجھی ــــ در و دیوار چیخ رہے تھے ــ تم نے بھی نواب ابن نواب سے عقد کر لیا ہے دلہن! تمھاری زندگی کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ تم جس لیے پیدا ہوئی تھیں وہ تم کر چکیں، اب اپنے مستقبل کو نواب صاحب کے قدموں میں رکھ کر بالکل بھول جاؤ ــــ اب تمھیں مستقبل کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کچھ نہیں ملے گا ــــ ماضی کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا چاہو گی تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا ــــ اس لیے کہ ماضی کی دل خوش کن یادیں بھی حویلی کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کر تم تک نہیں آسکتیں۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے کب تک در و دیوار کو گھورتی رہو گی دلہن۔ اپنی ہی سنگی ساتھن کا عالم دیکھو۔ تمھارے شوہر کو جس کوکھ نے جنم دیا ہے، جس کے بطن سے وہ پیدا ہوئے ہیں آج وہ ڈیوڑھی کے در و دیوار میں اپنا ایک ایک آنسو اس احتیاط سے

ذہن کرتی پھر رہی ہے کہ کہیں بڑے نواب صاحب یا نواب قلندر حسین خاں اس کے اس مجرمانہ فعل سے واقف نہ ہو جائیں ـــــ ماں کے پیروں تلے اولاد کے لیے جنّت ہوتی ہے دلہن ـــــ لیکن تمھاری حویلی کی ساری ماؤں نے یہ جنّتیں بھی نواب صاحب کے حوالے کر دی ہیں۔ اس میں تمھارے شوہر کا کیا قصور ہے۔ ان جنّتوں کے حصول کے لیے وہ نواب صاحب کے قدموں میں بچھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ نواب صاحب ان کے باپ ہیں ـــــ اور نواب صاحب کے پہلو میں وہ جو سولہ برس کی حسینہ ہے اس کا احترام تمھارے شوہر پر صرف اس لیے لازم ہے کہ وہ نواب صاحب کی چہیتی بیوی ہے اور نواب صاحب نے اس کے قدموں تلے کی جنّت ابھی نہیں چھینی ہے۔

لیکن دلہن تمھارے لیے ابھی وقت ہے۔ تم نے اپنے پیٹ میں جس چیز کو بے پناہ محبت سے چھپا رکھا ہے اس کے لیے وہ جنّت بھی چھپا رکھو جو تمھارے تلووں کے نیچے ابھی تک محفوظ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی گلبدن بیگم کی طرح ـــــ دلہن نے سر کو زور سے جھٹکا دے کر ان وحشتناک خیالات کو زمین پر پٹک دیا۔ وہ قریب قریب کانپ رہی تھیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ صدائیں گھر کے در و دیوار سے نہیں آرہی ہیں بلکہ خود ان کا ذہن اپنے شوہر کے خلاف سوچنے کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، یا کوئی شیطان ہے جو ورغلا رہا ہے۔ دلہن نے آیتیں پڑھ کر سینے پر پھونک لیں، اور توبہ استغفار کر کے طے کیا کہ کل ہی سے وہ پانچ وقت نماز پڑھیں گی تاکہ اپنے بیکار ذہن کو شیطان کا کارخانہ بننے سے بچا لیں۔

نواب قلندر حسین خاں کو ہر گھڑی یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ آبا حضور کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کریں ـــ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آبا حضور کے ہو رہنے

میں عزت، حکومت اور دولت ہر شئے ان کے قدم چومتی رہے گی، اور واقعی انھیں ہر چیز حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود گلبدن بیگم ڈیوڑھی بھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دوسری بیگمات گلبدن پر اس لیے رشک کرتیں کہ قلندر حسین خاں نے نواب صاحب کا دل موہ لیا ہے۔ نواب صاحب چوں کہ ہر کام نواب قلندر حسین خاں کے مشورے سے کرتے تھے اس لیے گلبدن بیگم کی اہمیت ڈیوڑھی بھر کے لیے مسلّم تھی۔ سوکنیں سوچتیں کہ قلندر نواب کے ذریعہ گلبدن بیگم جو چاہے نواب صاحب سے کروا لیتی ہیں۔ ان کی پانچوں انگلیاں تو گھی میں ہیں ہی ——— ڈیوڑھی کی ایک ایک چیز قلندر میاں کے ہاتھوں اونے پونے بک رہی ہے لیکن گلبدن بیگم برابر کی حصہ دار ہو کر بھی ہائے وائے کرتی ہیں۔ سمجھتی ہیں کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پلکیں جھپکانے کی طاقت بھی وہ سب سے چھین لیں گی جن آنکھوں نے ڈیوڑھی کا رنگ ڈھنگ دیکھا ہے، سرد گرم دیکھا ہے وہ رات کے اندھیروں کو ڈولتے ہوئے بادلوں کا سایہ کس طرح سمجھ سکتی ہیں۔ وہ نکھرے ہوئے دن کے اجالے کو لہراتی ہوئی بجلی کی چکا چوند کس طرح مان سکتی ہیں۔ لیکن گلبدن بیگم ہیں کہ آنچل پھیلا کر اشکوں کی پونجی اس احتیاط سے جمع کر رہی ہیں کہ جیسے پلّو میں باندھے ہوئے انھیں موتیوں کے سہارے مستقبل کے دن کاٹ لیں گی۔ جیسے انھیں نہ قلندر نواب سے واسطہ ہے نہ نواب صاحب سے ——— گلبدن بیگم یہ سب کچھ سن کر کڑھتیں۔ اس لیے کہ جس طرح بات چلتی تھی حقیقت اس کے برعکس تھی۔ یہ سچ ہے کہ نواب صاحب ڈیوڑھی کی ہر وہ چیز بیچ رہے تھے جس سے ان کے اجداد کی شان و شوکت وابستہ تھی، نام و ناموس وابستہ تھا، عزت و توقیر وابستہ تھی لیکن اس میں گلبدن بیگم کا کیا دوش تھا وہ تو صرف

اتنا جانتی تھیں کہ جب سے نواب صاحب بمبئی کی ایک ٹپری جھڑی اکسٹرا لڑکی کو اٹھا لائے تھے اس دن سے اُن کے اپنے ہاتھوں میں بجتی ہوئی سہاگ کی چوڑیاں جامد ہو کر اپنا نغمہ بھول گئی تھیں۔ اپنی اس چہیتی چھوٹی بیگم کے لیے جب سے نواب صاحب نے دیوڑھی کے قریب ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان لے رکھا تھا اس دن سے دیوڑھی ویران ہو گئی تھی اور ان ویرانیوں نے آہستہ آہستہ سمٹ کر، سکڑ کر ان کے اپنے دل میں پناہ لے لی تھی۔ اور اب یہ ویرانیاں جو دیوڑھی بھر پر مسلط تھیں گلبدن بیگم کے سینے میں گھٹ گئیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ دیوڑھی بھر کے مشترکہ غم کے سوا بھی کوئی غم ایسا ہے جو ان کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ بھی دن تھے جب نواب صاحب کے التفات سے ان کی زندگی بھی چمن در چمن تھی۔ پھر اس چمن میں ایک ننھا سا پودا اگ آیا۔ گلبدن بیگم نے خونِ دل سے اس پودے کو سینچا، جب یہ تناور درخت بن گیا تو وہ اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں زندگی کے باقی دن گذارنے کے لیے اس کے نیچے آ بیٹھیں لیکن نواب صاحب کے چھوتے ہی چھوئی موئی کے پودے کی طرح اس درخت کے سارے پتے جیسے مرجھا گئے۔ ٹھنڈے سائے گرم دھوپ کی تمازت سے جیسے پگھل گئے اور اب گلبدن بیگم چلچلاتی دھوپ میں کھڑی ہانپ رہی تھیں ——— اور یہی غم گلبدن بیگم کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا ——— وہ اپنے دکھ درد کا مقابلہ دوسری بیگمات کے رنج و غم سے کرتیں تو انھیں خود پر ترس آنے لگتا۔

فرخندہ بانو کے تو اولاد ہی نہ تھی، وہ اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح کاٹ رہی تھیں۔ معراج خانم سے نواب صاحب نے آنکھیں پھیر لیں تو سکندر حسین خاں نے کسی غنیمت پر باپ کو معاف نہیں کیا ——— نواب صاحب نے ڈرایا دھمکایا لیکن آخر کو

انھیں اپنی لاج رکھنی پڑی۔ آج ماں بیٹے نان جویں کھا کر ہی ہنسی خوشی سہتے تو صبر کر لیتے ہیں اور پھر ڈیوڑھی بھر میں قدر و منزلت معراج خانم ہی کی ہے — کیا مجال جو گھر کے نوکر چاکر ان سے کوئی گستاخی کریں اور یہاں یہ عالم ہے کہ وہ لوگ جو کبھی ان کے اشارے پر دیوانہ وار ناچتے تھے آج سیدھے منہ بات تک نہیں کرتے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے — معراج خانم کو بھی پیا نہیں چاہتے لیکن ان کی عزت تو ڈیوڑھی میں نیلام نہیں ہوتی — اللہ رکھے جوان جہان بیٹا ہے، دکھ درد کی خبر تو رکھتا ہے۔ ماں پر بات آتی ہے تو سینہ سپر ہو جاتا ہے — لیکن قلندر حسین خاں کی ماں بھی جیسے نواب صاحب ہی تھے اور باپ تو نواب صاحب تھے ہی۔

گلبدن بیگم سے نواب صاحب نے سہاگ چھین لیا تو قلندر حسین خاں نے پیری کا عصا چھین لیا — اور کبھی کبھی گلبدن بیگم سوچتیں کہ کہیں مرحوم سرفراز علی کی بددعا نے یہ دونوں نعمتیں تو ان سے نہیں چھین لیں — اور یہی سب باتیں سوچ سوچ کر ان کا جی کڑھتا رہتا۔ وہ اپنا دکھ درد کس سے کہہ سکتی تھیں۔ ہونٹوں کی مسّی، مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھناکے تو زمانہ ہوا نواب صاحب نے چھین لیے تھے لیکن پیٹ کی اولاد نے ماں کی ممتا کو ماں کے سینے ہی میں دفنا دیا، اور اب گلبدن بیگم ممتا کا مزار سینے میں چھپائے دو دو دن نواب قلندر حسین خاں کی صورت کو ترستیں۔ اولاد کا یہ دکھ تو صرف ان ہی کا حصہ تھا۔ اس دکھ میں کوئی ان کا شریک نہ تھا — ہونٹوں کی مسّی، مانگ کی افشاں اور چوڑیوں کے چھناکوں کی دولت سے تو نواب صاحب نے ڈیوڑھی میں سسکیاں لیتی ہوئی حوا کی سب ہی بیٹیوں کو کب کا محروم کر دیا تھا۔ نواب صاحب کی دین تھی نواب صاحب نے ہی سب سے چھین لی۔ اللہ میاں زندگی

بخشتا ہے تو زندگی چھین لینے کا حق بھی اس نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے۔ نواب صاحب اپنی بیویوں کے خدائے مجازی تھے ہنسیاں بخشتے تھے تو ہنسیاں چھین بھی لیتے تھے۔ یہ کوئی ایسا جرم تو تھا نہیں۔ خوشیوں سے کھیل لیتے تھے زندگیوں سے تو نہیں کھیلتے تھے۔ قانون نے خدا کو زندگیاں چھین لینے کا حق دے رکھا تھا۔ دنیا کے کسی کورٹ میں اس پر مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا تھا قانون نے اسی طرح نواب صاحب کو خوشیاں چھین لینے کا ادھیکار دے رکھا تھا، دنیا کے کسی کورٹ میں ان پر بھی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ اور اس راز کو حویلی کی چار دیواری میں بھٹکتی ہوئی تشنہ اور بیمار روحیں اچھی طرح جانتی تھیں —— لیکن بات یہ تھی کہ نواب صاحب نے پھر بھی اپنا فرض ادا کر دیا تھا، یعنی خوشیاں دے کر خوشیاں چھین لی تھیں۔ لیکن اللہ میاں تو زندگی دے کر بس بھول بیٹھے تھے۔ انھیں اپنا فرض یاد آنے تک سانسوں کی آمد و شد کو زندگی سمجھنا ہر ایک کے لیے ضروری تھا۔

گلبدن بیگم سوچتیں عجیب کاروبار ہیں سانچے بادشاہ کے، عجیب مصلحتیں ہیں۔ سب کچھ دیکھنے والا سب کچھ سننے والا ہم بندوں سے اس طرح نظریں پھیرے ہوئے ہے جیسے ہماری بربادیوں پر ہم نہیں تو وہ خود قانع ہے —— اگر اللہ میاں عورت رہتے اور نواب صاحب سے —— استغفر اللہ —— یکایک یہ خیال گلبدن بیگم کے ذہن میں برقی رَو دوڑا کر گذر گیا —— وہ دیر تک دل ہی دل میں توبہ کرتی رہیں پھر گڑگڑا کر التجائیں کیں کہ سچے بادشاہ مجھے اس دنیا سے اٹھالے یا پھر اس دماغ سے سوچنے کی ساری قوتیں سلب کرلے جو تجھ سے بھی گستاخی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ پھر انھیں خود پر ترس آگیا کہ نواب صاحب نے ان کا سہاگ چھینا، پیٹ کی اولاد چھینی اور اب خدا تک کو چھین لینے کے درپے ہیں۔ یہ کیسے صبح و شام ہیں۔ یہ کیسے شب و روز ہیں۔ یہ کیسی زندگی ہے کہ یہاں سب کچھ نواب صاحب کا ہے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی بے بسی پر رونے لگیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ اٹر دلیوں کے

صدر میاں سرفراز علی ان کے سینے پر سر رکھ کر ان کی دھڑکنیں کو گن رہے ہیں۔

"چھوٹی بیگم پکڑی گئیں آج ـــــ سُنا بی کچھ؟"

گلبدن بیگم اس طرح چونکیں جیسے وہ خود سرفراز علی کے ساتھ پکڑی گئی ہیں۔

پلّو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے گلبدن بیگم نے نظریں اٹھائیں تو بوڑھی بوا سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی ـــــ صوفے کا سہارا لے کر قالین پر جھکتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔

گلبدن بیگم نے ڈرتے ڈرتے بہت آہستہ پوچھا۔

"کس کے ساتھ بوا۔ اور کس نے پکڑا؟"

"وہ قلندر نواب کے ساتھ بیگم۔ بڑے سرکار نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

"ہائیں!"

گلبدن بیگم کے دل کو اپنی مٹھی کی مضبوط گرفت میں لے کر جیسے سرفراز علی نے سارا خون نچوڑ لیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگیں اور ان کے ذہن نے جانے کیوں اس طرح سوچا کہ نواب صاحب ڈیوڑھی کے گرے ہوئے حصے کا وہ ملبہ ہیں جس کے بڑے سے ڈھیر کے پیچھے چھپ چھپ کر قلندر میاں چھوٹی بیگم سے ملنے کے لیے جایا کرتے تھے جو سولہ سال کی سہی لیکن پھر بھی ان کی ماں تھیں۔



آج اس نے پھر پی رکھی تھی

اپنے ساتھی کے کاروبار کے گھاٹے سے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دماغ بوجھل ہو گیا تھا۔ ہوٹل کے مضبوط کواڑ مقفل تھے۔ وہ مقفل کواڑوں کے سامنے کھڑا اپنی بدنصیبی پر مسکرا رہا تھا۔ جب ہوٹل نیا نیا کھلا تھا تو کونٹر پر بیٹھ کر بیروں کو بلانے کے لیے بل بجاتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ اب اس کی زندگی ان ویرانیوں اور سناٹوں سے بہت دور نکل آئی ہے جو اس کی روح اور دل پر حکمران تھے۔ چیختے ہوئے ریڈیو اور سامعہ خراش گھنٹی کی ٹرنگ ٹرنگ میں اس کو اپنے مستقبل کی چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ اس کو یوں نظر آتا تھا کہ اس کے بچوں اور بیوی کی آوازیں بھی ریڈیو اور گھنٹی کے شور میں گھل مل گئی ہیں۔ جب ہوٹل کا یہ ریڈیو خاموش ہو جائے گا، یہ گھنٹی نہ بجے گی تو اس کے ہنستے کھیلتے بچوں کے دمکتے ہوئے چہروں پر مردنی چھا جائے گی۔ اس کی بیوی کے سرخ گال جن پر زلفیں بکھر کر وہ لکۂ ابر میں چھپے ہوئے زہرہ و مشتری سے تشبیہ دیتا ہے راکھ میں دبے ہوئے انگاروں کی طرح

اجلی پرچھائیاں
بجھ جائیں گے۔

وہ اسی قسم کی بہت سی باتیں سوچتا رہا اور بھاگ کر اس نے ایک اسکاچ حسینہ کا دامن تھام لیا۔ جس نے اس کے ذہن کو سکون بخشا اس کے قلب و روح کو مسحور کیا، رجھایا اور اپنا لیا۔

"جان ہیگ دنیا کی سب سے خوبصورت شئے کا نام ہے۔"

"تم بدھو ہو۔ بکواس مت کرو یار ٹھنگو۔ یہ فراریت وراریت نہیں ہے۔ یہ اصطلاحیں تم بزدلوں نے وضع کر رکھی ہیں۔"

"جان ہیگ دنیا کی عظیم ساحرہ ہے۔ تم میں اس کی بارگاہ تک پہنچنے کی جرات نہیں ہے تو پھر تم اس کے پیچھے تباہ کیا ہو سکتے ہو۔"

"تم کافی ہاؤس کے انٹلکچول ہو۔ کافی پیو۔ گرم کافی سرد کافی لیکن کبھی کبھی جان ہیگ کا دامن تھام کر زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"یو فول۔ میں صعوبتوں سے بھاگ کر شراب میں پناہ لینے کو جرم سمجھتا ہوں۔ یہ خودکشی کے مترادف ہے، اور خودکشی پاگلوں کا شیوہ ہے۔"

"اور جان ہیگ آدمی کو پاگل ہونے سے بچاتی ہے۔"

"اچھا اب چل دیئے مائی ڈیر ٹھنگو۔ گڈ بائی، کل ملیں گے۔"

رکشا میں بیٹھتے وقت اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے آج بہت پی رکھی تھی اس کے سامنے بچھی ہوئی سڑک پر رکشا والا چل پڑا تو وہ سوچنے لگا کہ یہ سڑک جس کے سینے کو میں نے باربار روندا ہے اور جو میرے پیروں کی گرمی سے مانوس ہے۔ شاید میرا گذر نہ ہونے پر ہر راہ گیر سے پوچھے ــــ لیکن نہیں اس نے تو اپنے سینے میں بے شمار

یادیں دفن کر رکھی ہیں ـــــ کوئی آتا ہے تو مسلسل آتا ہے اور نہیں آتا تو پھر کبھی نہیں آتا۔

لیکن یہ سڑک بالکل خاموش ہے۔ صدیوں سے اسی طرح چپ چاپ راہ گیروں کے پیروں میں بچھی ہوئی ہے جیسے اس کو نہ کسی کے آنے کی خوشی ہے اور نہ کسی کے جانے کا غم۔

بالکل ہندوستانی عورت کی طرح۔

جانے اس کو سڑک کے ساتھ ہندوستانی عورت کا خیال کیوں آیا، اور پھر اس کی نظروں کے آگے اس کی بیوی کا چہرہ جم کر رہ گیا۔ یہ مہمل خیال ہندوستانی عورت کی توہین ہے۔

لیکن جیسے اس کی بیوی نے آہستہ سے اس سے کہا کہ تم پھر حقائق سے گھبرا رہے ہو، تم نے عورت کی کوئی ایسی توہین تو نہیں کی ـــــ کیا میں ایک ایسی سڑک نہیں ہوں جس کے سینے کو تمھارے ماں باپ اور تم مسلسل روندتے رہے ہو ـــــ اور میں خاموش تماشائی بنی دیکھ رہی ہوں۔

اس نے سر کو جھٹکا دے کر رکشا کے اترے ہوئے ٹاپ پر سر ٹیک دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اب کچھ بھی نہ سوچے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے تینوں بچے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کرلیں جیسے خیالات کی درآمد میں ذہن کا نہیں آنکھوں کا حصہ تھا، اور اب پپوٹے سدراہ بن جائیں گے۔ گھر پہنچ کر رکشا والے نے اسے جگایا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوکر اس نے سوئچ دبایا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ میز پر اپنی عینک تلاش کرنے لگا جو پہلے ہی سے اس کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کو اپنے سامنے لٹکتا ہوا بلب نظر نہیں آرہا تھا۔ کبھی نظر آرہا تھا تو

دُھندلا دھندلا، کبھی بہت روشن روشن اور کبھی بلب کے اوپر ایک بلب اور سوار ہو گیا تھا۔ ایک بلب آہستہ آہستہ چھت سے زمین کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ زمین سے چھت کی طرف اور بڑی اوپر اٹھ رہا تھا یا شاید کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ وہ فرش ہی پر اپنے پیر جمائے رکھنا چاہتا ہے لیکن زمین خود نیچے ہی نیچے کہیں جا رہی ہے اس کیفیت کو شاید اس نے ایک ثانیہ کے لیے محسوس کیا اور آنکھیں مل کر ہوشیار ہو جانے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن آنکھوں اور ہاتھوں کے درمیان کوئی چیز اسے مزاحمت کرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے عینک اتار کر میز پر پھینک دی اور یہ سمجھ کر کہ عینک اس نے اتاری نہیں ہے بلکہ لگائی ہے صوفے پر دراز ہو کر جلگگاتے بلب کو گھورنے لگا۔

اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ صرف گستاخ ہی نہیں بلکہ کمینہ اور سفلہ بھی ہے۔ اس کا باپ بہت متمول تھا۔ زمینات کے علاوہ بڑے بڑے کئی مکانات اور نقدی کا مالک۔ اتنی بڑی جائیداد رکھنے والے باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ خود کو بھی کم از کم ننگا بھوکا تو نہ سمجھ سکتا تھا لیکن بہت جلد اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کا اپنا کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کو زندگی میں کئی بار اپنی مفلسی اور نکبت کا شدید احساس ہوا، اور آج یہ احساس شدید تر ہو گیا تھا کیوں کہ ہوٹل دیوالیہ ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل کے مالک نے اس کو منیجری کی اہم خدمت سے علیحدہ کر دیا تھا اور آج سے پھر اس کی زندگی اس کے باپ کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے خاندان کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بہت ضدی ہے اور اسی ضد کی وجہ سے وہ زندگی کی بہت ساری نعمتوں سے سب کچھ رکھ کر بھی محروم ہو گیا ہے

لیکن وہ اپنی ضد کو اصول پرستی سمجھتا، اور اس کا باپ اس کی اصول پرستی کو اس کی کمینگی سمجھا کرتا۔

جب تک وہ چھوٹا تھا اس کو زندگی کی ساری مسرتیں حاصل تھیں۔ ایرگن لے کر چڑیاؤں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ بڑا ہوا۔ پھر ٹوبلیوبور لے کر خرگوشوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ مسیں بھیگیں تو وہ غزالوں کا دیوانہ بنا ہوا جنگلوں میں پھرتا رہا۔ لیکن جب اس کے باپ کو پنشن مل گئی اور انھوں نے ضلعوں کی زندگی ترک کر کے شہر میں مستقل سکونت اختیار کی تو ان دنوں وہ خود ایک غزال چشم حسینہ کے تیر نظر کا شکار ہو گیا اور اس نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی۔

ہوش سنبھالنے کے بعد اپنے باپ سے اس کے اختلافات کا آغاز اسی واقعہ سے ہوا۔ وہ پٹھان قوم ہی کی ایک شریف الخاندان لڑکی تھی۔ لیکن اس کے باپ کا کہنا تھا کہ دو فٹ پاتھ پر ہاتھ پھیلانے والے بہت سارے فقیر بھی شریف الخاندان ہوتے ہیں۔ برقع پہن کر گھر گھر اپنا دکھ درد بیان کرتی پھرنے والی عورتیں بھی خاندان کی شریف ہو سکتی ہیں۔ نواب حکیم الملک کے بیٹے کا پوتا جس نے ریس اور شراب میں اپنی ساری پونجی لٹا دی ہے اور تسبیح گلے میں ڈال کر درگاہ کا مجاور بن بیٹھا ہے وہ بھی شریف زادہ ہے لیکن ان سب سے زیادہ "شریف الاشرف" ہے تو وہ روپیہ ہے جو ہر شخص کی کمینگی پر پردہ ڈالنے کی قوت رکھتا ہے۔ کسی کی بُرائی کی پردہ پوشی کرنا عین شرافت ہے اور اس شرافت کا اگر کوئی دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ روپیہ ہے۔ تم جس لڑکی کے چکر میں ہو، اس کے گھر اس شریف ترین شئے کا گذر ہی نہیں۔ جوانی کے جوش میں تم اندھے ہو گئے ہو۔ میں جہاں دیدہ ہوں، اور پھر ذرا سن رکھنا صاحبزادے میں پٹھان ہوں۔

تم میرا نطفہ ہو کر مجھ سے اکڑ فوں نہیں کر سکتے۔ کہہ چکا ہوں اور مکرر کہوں گا کہ تمہاری لیلیٰ گھر میں بہو بن کر نہیں آسکتی کبھی نہیں آسکتی۔ عشق کیے جاؤ اور تڑپ تڑپ کر مجنوں کا نام روشن کرو۔"

وہ بھی تو آخر پٹھان باپ کا پٹھان بیٹا ہی تھا۔ وہ وہ مجنوں کا نام روشن کیا ہے کہ باپ کا نام بھڑک کر بجھ جانے ہی کو رہ گیا تھا، اور یہ سب اس نے کافی سوچ سمجھ کر کیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اپنے پٹھان باپ کے سامنے پٹھان بن کر ڈٹ جانے سے ہی بات بن سکتی ہے۔ بات منوانے کے لیے ان کو یہ دکھلانا ضروری تھا کہ جو مورد عتاب ہے، جو راندۂ درگاہ ہے وہ بھی ان ہی کا بیٹا ہے جس کی شریانوں میں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے انھیں کا خون دوڑ رہا ہے۔

اس کی اس باغیانہ روش نے آخر ش اس کے باپ کو مصالحت پر مجبور کر دیا۔ وہ راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا۔ کبھی کبھی حالت نشہ میں وہ گھر لوٹتا تو نشہ اتنا نہ رہتا جتنا وہ ظاہر کرتا۔ بلند آواز میں جیسے کسی کو مخاطب کر کے کہتا "میں نے ایسا کوئی بہت بڑا قصور نہیں کیا ہے۔ میری کمینگی بہت ادنیٰ درجے کی ہے اور میرے باپ کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ میری بڑی سے بڑی کمینگی کی بھی پردہ پوشی کر سکتا ہے۔ ادھار پینا جرم نہیں ہے اور میں کون سی ہزاروں کی رقم کا تمہارا مقروض ہوں۔ تم فکر نہ کرنا میں تمہاری ساری رقم لوٹا دوں گا، لیکن کہے دیتا ہوں کہ سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے میرے گھر نہ آنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جاؤ اسی وقت چلے جاؤ۔ میرا غصہ بہت برا ہے۔ میں پٹھان باپ کا پٹھان بیٹا ہوں سمجھے۔"

اس کی ماں کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اپنے کمرے کے کواڑوں کو زور سے بند

کر لینے کے بعد اس کو علانیہ سنائی دیتا کہ اس کے ماں باپ میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔
اس کی ماں بڑی بجاجت سے اس کے باپ کو سمجھاتی "کیوں تباہ کر رہے ہو اس کو
آج شراب کو منہ لگایا ہے، کل بازاری عورتوں کا منہ چاٹتا پھرے گا۔ مصلحت اسی میں
ہے کہ پیر میں بیڑی ڈال دی جائے۔ سرکش ہو جائے گا تو پھر سنبھالنا بس کا روگ نہ رہے گا۔
تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ بھی تمھارا ہی بیٹا ہے۔ اپنا کیا اس طرح بھی بھوگتا ہے کوئی۔
یاد ہے اس بے شرم نرگس کے پیچھے پڑے تھے تو ہزاروں روپے پھونک دیئے تھے
اس پر بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ چند دن گود گرم کر کے اس نے بہت کچھ بٹور لیا اور ایک ناجی
کے ساتھ بھاگ گئی۔ جاتے وقت کمبخت نے تمھیں عمر بھر کا روگ لگا دیا۔ اور پھر ان دنوں
اسلم میری گود میں ہمکتا تھا۔ گھر میں سب کچھ رکھ کر تم بازار کے ہو رہے تھے۔ مجھے
سلگتے ہوئے کوئلوں پر کروٹیں لینے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور پھر کیا میں یہ بھول جاؤں گی
کہ اس بیسوا کو کشمیر کی سیر کو لے جاتے وقت تم نے میرا منہ میں چہرہ نہ دیکھا تھا تو نہ دیکھئے
لیکن اسلم بھی تو نہ یاد آیا تھا۔ آج وہ اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی پر ریجھ گیا ہے تو
جائز طور پر اپنی بیوی بنا کر گھر لانا بھی تو چاہتا ہے۔ لیکن تمھیں یہ شرافت کیوں پسند
آئے گی۔ تمھیں سیدھا راستہ بھایا ہے کبھی۔ کانٹے بچھی ہوئی پگڈنڈی پر چلو گے اور وہ
بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس طرح جیسے مخمل پر چل رہے ہو۔"

اسلم خاں کا نشانہ تیر بہدف تھا۔ ماں نے سرگوشیاں بہت دھیمے سروں
میں شروع کی تھیں لیکن بات ختم ہوتے ہوتے سر جا کر لمبی تانوں کی حدوں کو چھو
رہے تھے اور اس کا باپ بھیگی بلی بنا جیسے کھمبا نوچ رہا تھا۔ لیکن یکایک شاید اس
کے ذہن کو کسی نے بجلی کے تاروں سے شاک پہنچا دیا۔ وہ ایک دم برہم ہو گیا۔ یہ اس کی

ہمیشہ ہی کی عادت تھی۔ بات کرتے کرتے کوئی معمولی سی بات بھی اس کو ناگوار خاطر ہوتی تو وہ ایک دم اس طرح غصے میں آتا کہ آپ کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ وہی شخص ہے جو آپ سے ایک ثانیہ قبل مسکراتا ہوا باتوں میں مصروف تھا یا پہلے ہی سے غصے کے زہریلے اثرات اس کے بدن میں سرایت کر رہے تھے اور جب یہ زہر نس نس میں پھیل گیا ہے تو اس کے چہرے سے رس کر آپ تک پہنچ رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ پلک جھپکنے تک ہو جاتا آپ سوچتے ہی رہ جاتے کہ آپ نے تو کوئی ایسی دل شکنی کی بات نہیں کی تھی۔

آپ کو مختصراً ایک واقعہ ہی کیوں نہ سنا دوں۔ ایک بار جب کہ اسلم خاں اور اس کے بیوی بچے معتوب ہو گئے تھے اور ماہانہ صرف پچاس روپے گذر بسر کے لیے مقرر کر کے ان کو علیحدہ کر دیا گیا تھا تو ایک دن ایک رشتہ دار نے اسلم خاں کی سعی سفارش کی اور اس کے بال بچوں کی زبوں حالی کا نقشہ اس کے باپ کے سامنے رکھا ایک ہی لمحہ میں ساری فضا مکدر ہو گئی۔ خاں صاحب بالکل بھپرے ہوئے شیر کی طرح گرجنے لگے۔ قربانی اور صدقے کے فضائل کی ایک موٹی سی کتاب اٹھا لائے اور فرمایا کہ "صاحب منان ابن صفیان ابن طلحان شرقی الغربی الآفاقی نے صرف ساڑھے تین آنے میں ایک سال گذر بسر کی تھی۔ نیتیں اور اعمال نیک ہوں تو اللہ برکت دینے میں دریغ نہیں کرتا لیکن لونڈا تو مرتد و ملحد ہے۔ صاحبزادے کو اللہ کے وجود ہی سے انکار ہے ایسے میں پچاس تو کیا پانچ سو میں بھی برکت نہیں ہو سکتی۔ آپ کو ترس آتا ہے تو کیجئے کافروں کی سرپرستی۔ میں تو مسلمان پیدا ہوا ہوں مسلمان مروں گا۔" بات کفر و اسلام تک جا پہنچی تھی مولانا اپنا سا منہ لے کر واپس لوٹ گئے۔

آج بھی خانم صلواتیں سناتی رہیں تو خاں صاحب بہت دیر تک خاموش

رہے لیکن خانم کے طنز کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ گرج کر کہنے لگے "ہاں ہاں دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہوں۔ برابر جھونکتا ہوں، ہمیشہ جھونکتا رہوں گا۔ لیکن جو کچھ کرتا ہوں باپ دادا کے برتے پر تو نہیں کرتا۔ خود کمایا ہے۔ محنت مشقت کر کے۔"

خانم بھی تو آخر پٹھان تھیں، شیرنی جب اپنے بچوں کی سلامتی کے لیے بپھرتی ہے تو کہتے ہیں کہ جنگل پر حکومت کرنے والے شیر صاحب بھی دم ہلانے لگتے ہیں۔ بیگم غرائیں "ارے چھوڑو بھی تمھارے باپ دادا نے چھوڑا ہی کیا تھا جو تم اتراتے ہو۔ وہ تو میرے باپ نے داماد بنا کر احسان کیا تم پر۔ اتنی بڑی خدمت دلائی اور وہ بھی ایسے محکمے میں کہ آج لکھ پتی بنے بیٹھے ہو —— یہ سب کچھ تمھارے اجداد کی میراث ہے نا جس پر تم اکڑ رہے ہو۔"

بات بالکل راست ہو گئی تو خاں صاحب نے محسوس کیا کہ اس برہمی کے پیچھے بہت سی صداقتیں بھی ہیں۔ خانم بے وجہ بڑ ہانکتیں تو وہ بھلا کیوں خاموش ہوتے ذرا سا آواز کو دھیما کر کے وہ خانم سے کچھ مصالحت کرنے والے ہی تھے کہ اسلم خاں کے کمرے سے گلاس ٹوٹنے کے چھناکے نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اسلم خاں سمجھتا تھا کہ اس وقت جب کہ آتش و بارود کی گرم فضا مصالحت کی ہوا کے خنک جھونکوں کی زد میں آ رہی ہے اس کو ایک ہائیڈروجن بم استعمال کرنا چاہیے جس سے دل و دماغ کو پھر ایک جھٹکا لگے اور سارا ماحول مکدر ہو جائے، جل اٹھے اور اس نے گلاس فرش پر دے مارا اور ریڈیو اس کا سہگل بن کر انتہائے غم میں قہقہے لگانے کا پارٹ ادا کرنے لگا۔

ٹوٹے ہوئے گلاس کا چھناکا اور قہقہے کی گونج اس کی ماں کے دماغ پر شل بن کر گری اور کمینے شرابی نے اپنے کان کواڑوں سے لگا دیے تو اس کی

ماں کہہ رہی تھی " لوجی بات یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اب صاحبزادے گھر میں لا کر پینے لگے ہیں. تم اپنی ضد پر اڑے رہو وہ خود کو تباہ کرتا رہے گا اور میں بیٹھی دیکھتی رہوں گی. قسمت کیا کیا دکھاتی ہے لیکن قسمت پر الزام کیوں دھروں تم بہت پیسے والے ہونا اس لیے میرا اور میری اولاد کا مقدّر بن بیٹھے ہو."

خاں صاحب خانم اور اولاد کے مقدّر تو تھے ہی. صوفے پر پڑے پڑے رات گئے دیر تک پلکیں جھپکاتے رہے وظیفہ پڑھنے کے لیے بھی آج وہ کمرے میں دیر تک بند رہے تھے. خاں صاحب اسی کمرے میں پورے سکون کے ساتھ اپنے کاروبار کا حساب کتاب کرتے تھے. وظیفہ پڑھتے تھے. ایسے مواقع پر سوائے خانم کے کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی. ہاں کبھی کبھی خاں صاحب کی پسندیدہ چھوکری "تمیزن" اس کمرے میں دبے پاؤں داخل ہو جاتی تھی. کیوں کہ وہ عام ملازموں کی طرح گندہ نہیں رہتی تھی. خانم اور خاں صاحب کی منہ چڑھی تھی. لیکن ایسے مواقع شاذ آتے اور ایسا عموماً اس وقت ہوتا جب خانم گھر پر نہ رہتیں. آج خاں صاحب اسی کمرے میں بند دیر تک اپنے کاروبار میں الجھے رہے جب فارغ ہوئے تو کمرے کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں نکل آئے. خانم دلان میں تخت پر لیٹی ہوئی انھیں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں. خاں صاحب پام کے درخت کی طرف بڑھے تو خانم نے انھیں اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیا اور گوری چمڑی والی فرنگن کو بددعائیں دینے لگیں تاکہ ان کی سرگرمی سے خاں صاحب واقف ہو جائیں. لیکن خاں صاحب پام کے درختوں کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے. پام کے چوڑے چکلے، چکنے اور نرم پتے پر اپنا ہاتھ کچھ دیر اس طرح پھیرتے رہے جیسے کسی کے گالوں کو سہلا رہے ہیں. پھر جانے انھیں کیا

سوچھی جھٹکا مار کر ایک پتّا توڑ لیا۔ دونوں ہاتھوں میں پام کے پتّے کو کھلے ہوئے اخبار کی طرح تھامے ہوئے گھورتے رہے۔ خانم نے منہ پھیر کر یہ سب دیکھا تو ان کے سینے میں انگارے دہکنے لگے۔ کہنے لگیں "کسی پارک کے ساتھ لندن میں مزے کر رہی ہوگی وہ تو — تمھیں پام کے درختوں سے لپٹ کر رونے کے لیے چھوڑ گئی ہے۔ رنڈی نے پودے بھجوائے تھے تو میرے گھر کی زمین میں اس کی جڑیں کیوں پیوست کر دیں — ایک پتّے سے کیا ہوگا۔ سارا درخت اکھاڑ کر اپنے سینے میں لگا لو۔ دل و جگر کا خون پی پی کر یہ پودے خوب پھلیں گے پھولیں گے۔" خاں صاحب چونکے اور خواب گاہ کا راستہ لینے کی بجائے لمبے لمبے ڈگ بھرتے پھر اسی نکڑ والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ رات صوفے پر پڑے پڑے گذاری خانم نے بھی پوچھ گچھ نہ کی۔

صبح ناشتے پر خاں صاحب نے خانم سے سرگوشی کرنے کے انداز میں کہا "بھئی جب اسلم خاں کی خواہش اور تمھاری مرضی ہے تو لا لو لونڈیا کو عقد کر کے میرے خواب ادھورے ہیں تو ادھورے ہی سہی لیکن خانم تم پچھتاوگی اس رشتے سے۔ شادی کے متعلق تو بھلا کیا ہو سکیں گے بس چپکے سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر اٹھا لاؤ۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے تو مجھے غم نہ ہوگا۔ کہہ دوں گا کہ صاحبزادے مرے جا رہے تھے لونڈیا پر۔"

خانم نے جب دیکھا کہ خاں صاحب پوری ذمہ داری ان کو سونپ کر خود بری الذمہ ہو رہے ہیں تو وہ پھر غرائیں "مجھے کچھ خوشی نہیں ہے کہ فقیر کی گدڑی میں لعل تلاش کرتی پھروں۔ میں نے کب ان کی چوکھٹ پر پیشانی رگڑی ہے کہ وہ اپنی چاند سی بیٹی کو میری بہو بنا دیں۔ مجھے تو خیال ہے بس تمھاری اولاد کا۔ سر پھرا تو ہے ہی۔ زندگی برباد کرتا پھرے گا، اور پھر آج کل وہ یوں بھی راستہ بھٹک گیا ہے۔ اوٹ پٹانگ بکنا

ہے۔ معلوم نہیں کونسی کونسی انگریزی کتابیں پڑھتا ہے۔ نئے نئے جلسوں اور جلوسوں میں شامل رہتا ہے اور گھر آکر مجھے بات بات پر ٹوکتا ہے۔ گولی نے پانی ملا ہوا دودھ دیا، میں نے گولی کو ڈانٹا، اور صاحبزادے بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگا امی تمیز ن ۔۔۔ اور خداداد خاں دونوں کے سامنے غریب نے دودھ دھویا ہے۔ چار چار آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ دودھ میں پانی کیسے ملا سکتا ہے بھلا۔ آپ اس طرح برہم ہوتی ہیں جیسے آپ کے گھر کا زرخرید غلام ہی تو ہے ـــــ بے چارہ ـــــ میں نے کہا میاں تم چپ رہو، ابھی بچّہ ہو۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ کافر پر کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ بس اتنی سی بات تھی میری جان پر ہی تو بن گئی ـــــ لگا مجھ سے حجتیں کرنے۔ کہنے لگا بدمعاش مسلمانوں سے نیک منش کافر لاکھ درجے بہتر ہیں۔ جنّت پہلے تو ہے نہیں اور اگر ہے بھی تو اللہ یار خاں جیسے ڈاکو دوزخ میں جلیں گے اور گولی سیدھا جنّت میں چلا جائے گا، کیوں کہ وہ آپ کو سو فیصد خالص دودھ دیتا ہے اور اس کے باوجود آپ کی بری بھلی سر جھکا کر سن لیتا ہے کیوں کہ وہ بھی تلخ جواب دے گا تو آپ کا دل دکھے گا، اور وہ دل دکھانا نہیں چاہتا۔ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی آدمی کو سمجھے اور آدمی آدمی کی عزت کرے۔"

"پچھلے دن خداداد خاں مچھلی بارہ آنے پونڈ نہیں چودہ آنے پونڈ لایا۔ میں نے ذرا جھاڑا۔ وہ میرے منہ لگنے لگا تو میں نے غصّہ میں اس کو حرامزادے اور ذلیل کہا بس اتنی سی بات پر صاحبزادے اپنے کمرے سے نکل آئے۔ خداداد خاں کو پچکار کر باہر بھجوا دیا اور لگے مجھ سے حجت کرنے کہ امی آپ نے اسے گالیاں کیوں دیں۔ میں نے جو خود اس پر گالیوں کی بوچھار کی ہے تو مجھ سے لپٹ گیا اور کہنے لگا کہ اچھے

آدمی گالی گلوج نہیں کرتے امی۔ میں نے سمجھایا کہ میاں جتنی ذات ہو اتنی ہی بات کرنی چاہیے۔ تمھاری نانی اماں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اچھے بھلے ملازم کو نہ صرف ماں بہن کی سناتیں بلکہ زیادہ برہم ہو جاتیں تو آنکھوں میں مرچ لگوا دیتیں یا بید کی چھڑیاں پانی میں بھگو کر شڑاپ شڑاپ چوتڑوں پر رسید کروا دیتیں۔ سارے نوکر آواز ہی سے کانپ کانپ جاتے تھے۔ گھر کا انتظام ذرا رعب ہی سے چلتا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ یہ سن کر مجھ سے اتنی گستاخی پر اتر آئے گا۔ کہنے لگا نانی اماں اب ہوتیں تو ان کی آواز سے کانپنے والے نوکر مرچ انھیں کی آنکھوں میں جھونک دیتے۔ بھیگی ہوئی بید کی چھڑیاں ان کے ہاتھ سے چھین کر توڑ دی جاتیں یا کیا عجب انھیں پر برس پڑتیں۔ یہ سراسر ظلم ہے امی۔ اور اب کسی کا ظلم کسی پر روا نہ رہے گا۔ آج خداداد خاں تمھاری گالیوں کو سہہ لیتا ہے۔ کل خداداد خاں کے بچے میرے بچوں کو گالیوں کا جواب گالیوں سے دیں گے اور میں اس دن کے انتظار میں ہوں۔"

لو جی چار دن کا لونڈا ہمارے اطوار سدھارنے چلا ہے۔ عقل ماری گئی ہے اور کچھ نہیں۔ اور اس خرابی کی جڑ وہی انگریزی کتابیں ہیں جو وہ پڑھتا رہتا ہے۔ میں تو کہوں گی ان انگریزوں نے ناس کر دیا ہے ہمارا ــــ اس فرنگن رنڈی نے تمھیں تباہ کیا اور اب اس کی زبان تمھارے بیٹے کو تباہ کر رہی ہے۔"

خاں صاحب ساری باتیں غور سے سنتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ خانم سب کچھ کہہ لیں تو وہ بھی اپنے صاحبزادے کے چال چلن پر کڑی تنقید کریں۔ کیوں کہ اب خانم ان کی ہم زبان تھیں۔ اس لیے انھیں کچھ خطرہ نہ تھا لیکن خلاف توقع جب خانم نے فرنگن کو رنڈی کہہ کر بات ختم کی تو خاں صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ گفتگو کا رخ پھیر دیں۔

کہنے لگے خانم ایک آدھ لیمو ہو تو افشردہ بنا دینا۔ سارا بدن دکھ رہا ہے۔ طبیعت بڑی مضمحل ہے۔ خانم نے خاں صاحب کو گھور کر دیکھا۔ انھوں نے یہ سوچ کر کہ بات پھر فرنگن رنڈی تک پہنچے گی نظریں جھکا لیں۔

نکاح کے دو بول پڑھوا کر خانم لونڈیا کو اپنے گھر نہ لا سکیں۔ لڑکی والے غریب تھے تو کیا ہوا۔ انھیں بھی عزت و ناموس کا پاس تھا۔ انھوں نے انکار کر دیا کہ وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کرنے کے موقف میں نہیں ہیں۔ جب ان کے حالات اجازت دیں گے تب دیکھا جائے گا۔ خانم اور خاں صاحب نے تو لڑکی والوں کے اس انکار کو غیبی امداد سمجھا اور دل ہی دل میں اللہ میاں کا شکر ادا کیا۔ لیکن اسلم خاں فکر مند ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکی والے اپنی عزت کا تابوت اٹھائے صدیاں گزار دیں گے اور ان کے حالات انھیں عمر بھر اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کو اسلم خاں کی دلہن بنا سکیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خاں صاحب کسی قیمت پر دو طرفہ خرچ کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتے کیوں کہ نہ تو انھیں یہ رشتہ ہی پسند تھا اور نہ ہی اس کے وہ راستے پسند تھے جن پر ان کی دانست میں وہ بھٹک رہا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ اسلم خاں گستاخ اور کمینہ ہو گیا ہے۔ ان کے پوزیشن اور رتمول نے جو عمارت بڑی محنت اور مشکل سے کھڑی کی ہے وہ اسلم خاں کے ہاتھوں اڑ اڑا دھم ہو کر ڈھے جائے گی۔ اسی وجہ سے خاں صاحب چاہتے تھے کہ اسلم خاں کے پیروں میں فولاد کی نہیں بلکہ سونے کی زنجیر پہنا دی جائے۔ وہ جہاں دیدہ جو تھے۔ ان کو اپنے تجربات کی روشنی میں اس کا علم تھا کہ سونے کی نرم ملائم اور چمکدار بیڑیوں کو توڑ کر پھینک دینا ہر نوجوان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسلم خاں بھی تو آخر خاں صاحب ہی کا بیٹا تھا۔ وہ ان کے ہر داؤ پیچ سے واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اب جب کہ خاں صاحب نے

بادلِ نخواستہ ہی سہی لیکن اس رشتے کو منظور کر لیا ہے تو جھٹ پٹ سارے مسائل کا حل نکال ہی لینا چاہیئے۔ ذرا چوک ہوئی اور خاں صاحب کو کہیں سے سونے کی ٹریوں کی امید بندھی تو وہ اپنے ارمانوں کا جنازہ اٹھائے پھرتا رہے گا۔

اس نے اپنے ایک رشتہ دار سے سازباز کی، دلہن والوں کے پاس خاں صاحب کی جانب سے بہت ہی لجاجت اور انکساری سے کہلا بھیجا کہ "شادی میں ہمیں عجلت صرف اس وجہ سے ہے کہ اس نیک کام سے فراغت پاکر ہم دونوں میاں بیوی حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے غیاب میں اسلم میاں تنہا ہو جائیں گے اور پھر اتنے بڑے گھر بار کی دیکھ بھال بہو کے سوا کون کر سکتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کچھ دن توقف کر لینے میں بھی ہمیں تامل نہ ہوتا۔ آپ ہمیں اپنا سمجھیں۔ اللہ کا دیا جو کچھ ہے وہ بیٹے اور بہو ہی کا تو ہے شادی میں کرّوفر اور ٹھاٹ باٹ کرنے کے ہم قائل نہیں ہیں اور پھر زمانے کا تقاضا بھی ہے کہ فضول خرچی سے گریز کیا جائے۔ یہی پیسہ کل آپ کی بیٹی ہی کے کام آئے گا۔ ہم قبر میں دولت ساتھ لے جانے سے تو رہے۔ بس ہزار ڈیڑھ ہزار قرض آپ قبول کر لیجیے حالات جب بھی سازگار ہوں خوشی سے ادا کر دیجیے۔"

پیام میں خلوص تھا۔ محبت تھی۔ بات دلہن والوں کی سمجھ میں آگئی۔ ادھر میاں اسلم خاں نے تمیزن کو لالچ دے کر خاں صاحب کی چک بک حاصل کر لی۔ انعام کے ساتھ انہیں یقین بھی دلایا کہ اگر بھانڈا پھوٹ بھی جائے تو وہ تمیزن بی پر آنچ نہ آنے دیں گے تمیزن بی جانتی تھیں کہ اسلم میاں جتنے چلتے ہوئے ہیں اتنے ہی غریبوں کے ہمدرد اور بات کے پکے ہیں اور پھر تمیزن بی کے لیے یہ کام کوئی بڑا کام نہ تھا۔ باپ کی دولت کا جائز حقدار بیٹا ہی تو ہے وہ کون ایسا ٹراگناہ کرنے چلی ہیں جو ان کا ضمیر انہیں کچوکے دیتا

دوسرے دن چیک بک اسلم خاں کے ہاتھ میں تھی۔ خاں صاحب کے جعلی دستخط ثبت کر کے شام ہوتے ہوتے اس نے چیک کیش کروالیا اور رقم دلہن والوں تک پہنچا دی گئی۔

دلہن سسرال آئی تو ایک ہی دن میں اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی سسکیاں بھرتی ہوئی ماں نے اس کو اپنے سے جدا کرتے وقت جس جنت کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا تھا وہ جنت کم سے کم اس دنیا میں کبھی اس کو حاصل نہ ہو سکے گی۔ حجلۂ عروسی میں اس کی جھکی جھکی اور شرمیلی آنکھیں جب بھی اوپر اٹھیں تو وہ محسوس کرتیں کہ اس کی روح اس کمرے میں بھٹکتی پھر رہی ہے جس کو لمحہ بھر کے لیے سہارا دے کر اسلم خاں نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اس کی ناداری کا وہ احساس جو اس کے بچپن سے لے کر اس کی جوانی تک اس کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا رہا تھا آج جیسے وہ اسی احساس کے ساتھ بیاہ دی گئی تھی۔

اپنے کمرے میں گھونگھٹ میں سر جھکائے ہوئے اس نے سن لیا تھا کہ خاں صاحب اسلم خاں پر بری طرح برہم ہو رہے تھے۔ اسلم خاں نے نہایت ڈھٹائی سے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے خاں صاحب کے جعلی دستخط سے بنک سے روپیہ حاصل کیا تھا۔ خاں صاحب جوالا مکھی بنے ہوئے تھے لیکن اسلم خاں نے اپنی اس حرکت کا پوری طرح خاں صاحب ہی کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا جیسے دو آتش فشاں اپنا اپنا لاوا ایک دوسرے پر اچھال اچھال کر خوفناک قہقہے مار رہے ہیں اور وہ یکہ و تنہا دونوں کے بیچ میں پھنسی ہوئی اپنی آنکھوں سے مسلسل بہتے ہوئے پانی کے ٹھنڈے قطروں سے بھڑکتے ہوئے بھیانک شعلوں کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے لیکن بہت

جلد اس نے دیکھ لیا کہ جس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ اپنی آنکھوں کا سارا خزانہ لٹا رہی تھی اس آگ نے خود بڑھ کر اس کی آنکھوں کا سارا پانی بھسم کر کے رکھ دیا ہے اور اب وہ اس دولت سے بھی محروم ہو گئی ہے جو تنہائی میں اس کی رفیق تھی اور جو درد کا درماں تھی۔ غم کا مداوا تھی، زخم کا مرہم تھی۔

دو روز سے اسلم خاں نئی دلہن کو چھوڑ کر غائب تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے خون آلودہ گٹھڑی کی طرح اپنے پلنگ پر پڑی رہتی جیسے کسی عورت کو خنجر سے بے طرح زخمی کر کے نیم مردہ حالت میں کمرے میں پھینک دیا گیا ہو جس کے بدن سے تازہ خون رس رس کر اس کے پیرہن کو گلنار بنا رہا ہو۔

ایک رات خانم نے دلہن کے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنی۔ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی وہ دلہن کے کمرے تک پہنچیں اور کان کواڑوں سے لگا دیے۔ خانم کے پلے کچھ بھی نہ پڑا تو انھوں نے کانوں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور دروازے کی درازوں سے ان کی نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسلم خاں دلہن کی گود میں سر چھپائے سسکیاں لے رہا تھا اور دلہن کی آنکھیں اسلم خاں کے گالوں کو آنسوؤں سے نہلا رہی تھیں۔ اسلم خاں کو بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہوا دیکھ کر خانم کے پندار کو ٹھیس لگی۔ وہ سوچتی رہیں کہ اپنے باپ سے زبان درازی کرتے ہوئے تو اسلم خاں نہیں چوکتا اور آج دو دمڑی کی چھوکری کی گود میں پڑا نامردوں کی طرح سسکیاں لے رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے خانم اپنے تدبر اور سیاست پر بہت خوش ہوئیں۔ انھوں نے سوچا کہ اب اسلم خاں اپنی باغیانہ روش ترک کر کے پالتو جانوروں کی طرح خاں صاحب کی سرد گرم چپ چاپ سہہ لے گا۔ باپ کی آنکھوں کے تنکے کو شہتیر سمجھنے والا اب شہتیر کو تنکا برابر بھی اہمیت

نہ دے گا، اور پھر ایک دو پلّے جنم لے لیں تو اسلم خاں اپنی واہی تباہی بکواس چھوڑ کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لے گا اور کیا عجب کہ خاں صاحب کو نماز اور روزے کے لیے نصیحت نہ کرنا پڑے۔ خانم نے محسوس کیا جیسے اسلم خاں دلہن کی گود میں سر رکھے نماز ادا کر رہا ہے لیکن فوری دل ہی دل میں انھوں نے اس فاسد خیال سے توبہ کر لی جانے وہ اور کیا کیا سوچتی رہتیں لیکن اسلم خاں کی آواز نے انھیں چونکا دیا۔ ٹھنڈے پانی کا خالی گلاس جب دلہن نے اسلم خاں کے ہونٹوں سے ہٹایا تو اسلم خاں نے ایک لمبی سرد آہ کھینچ کر دلہن سے کہا۔ اب میں تم کو اس گھر کے بے رحم ماحول میں تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نادم ہوں تمھارا قصوروار ہوں۔ میں نے تم سے بیاہ کر کے اس گھر میں ایک مظلوم انسان کا اضافہ کیا ہے۔ میں نے تمھاری مفلسی سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن تم یقین کرو کہ مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت تھی ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس زہر بھرے ماحول میں میں گھٹ گھٹ کر مر جاتا۔ اب میں تمھارے لیے زندہ رہوں گا۔ زندگی کے غم ہم مل کر بانٹ لیں گے کیوں کہ یہاں تم کو اتنے بڑے گھر کی اکلوتی بہو کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ دولت نہیں مل سکتی، حکومت نہیں مل سکتی، یہاں تک کہ محبت بھی نہیں مل سکتی۔ میرے باپ کے دل میں زندگی کی کسی شے کے لیے محبت کی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے۔ اس کو میری ماں سے محبت نہیں ہے، اس کو مجھ سے محبت نہیں ہے پتہ نہیں اس کو ..... اپنے آپ سے بھی محبت ہے یا نہیں میری ماں سے صرف اس لیے اس کی کٹی دبتی ہے کہ اس نے اپنی ساری دولت میرے بڑے ماموں کی سرپرستی میں کمائی ہے اور اسی لیے وہ اپنی دولت میں میری ماں کو بھی چھوٹا موٹا حصہ دار سمجھتا ہے۔ لیکن میں اس وقت بہت دکھی ہو جاتا ہوں

جب سوچتا ہوں کہ میرے باپ کی دولت میری ماں کی ممتا کو خرید لینے میں کس طرح کامیاب ہوگئی۔ تم کہوگی کہ میں اپنے ماں باپ سے زیادتی کر رہا ہوں، تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ اس عمر میں مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے کے قابل ہونا چاہیے تھا۔ دولت میرے باپ نے کمائی ہے۔ میں نے نہیں کمائی تو مجھے اس کا حق بھی نہیں پہنچتا کہ اس کے برتنے پر اتراتا پھروں تم اگر اس طرح سوچ رہی ہو تو ایک حد تک صحیح سوچ رہی ہو۔ لیکن میں نے اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ میرا دوش صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے اصولوں کو اپنے نظریات کو اپنے باپ سے شکست کھا کر اس کے آگے سپر ڈال دینے سے بچا رکھا ہے۔ میرا قصور یہی ہے کہ میں نے اپنے ضمیر کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے باپ سے بغاوت کی ہے۔ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف کافی رشوت دے کر مجھے محکمۂ پولیس میں ایک اچھی سی خدمت دلوادی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس نے میرے لیے بھی زندگی کے وہی راستے چُنے تھے جن پر چل کر میں بہت متمول ہو سکتا تھا، جن پر چل کر میں بھی سوسائٹی میں ایک اونچا مقام حاصل کر سکتا تھا میرے لیے بھی یہ سارے امکانات تھے اور ان دنوں میرا باپ مجھ سے بہت خوش تھا۔ بچپن ہی سے میں نے اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھالی تھی۔ بندوق میرا بچپن تھی۔ بندوق میری جوانی تھی بندوق میرا فن — پھر ایک تاریک رات کو میرے آقاؤں نے مجھ سے سرگوشی کی۔ حکم دیا کہ میں اپنے اس فن سے ساری انسانیت کے سینے کو چھلنی کی طرح چھید دوں — بھوکے ننگے، ذلیل اور کمینے انسانوں کی ایک چھوٹی سی دنیا نے میرے خداؤں کی نیند اڑادی تھی۔ میرے خداؤں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کی آنکھوں سے چرائی ہوئی نیندیں واپس لادوں کیوں کہ ذلیل انسانوں نے صرف اس لیے ان کی نیندیں چرالیں کہ

میرے خداؤں نے ان کمینوں کے ہونٹوں کی شادابی پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ان کی ہنسیوں کو انھیں کے کپکپاتے ہونٹوں میں دفن کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکنوں پہ پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ ان کی آنکھوں کی روشنیاں گہرے اندھیروں کے نیچے چھپا دی تھیں۔ ان کے خالی پیٹوں کے اندر دانۂ گندم کے عوض آتش و باروت بھر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ لیکن آج یہ سارے ذلیل و خوار انسان اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے تھے اور انھوں نے ایک آواز ہو کر آج اپنے ہونٹوں کی شادابی مانگی تھی۔ اپنی مسکراہٹوں کی زندگی مانگی تھی۔ اپنے دل کی دھڑکنیں مانگی تھیں، اپنی آنکھوں کی روشنیاں مانگی تھیں۔ اپنے خالی پیٹوں کے لیے دانۂ گندم مانگا تھا، اور غضب تو یہ ہے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں لجاجت سے نہیں مانگیں ہاتھ پھیلا کر نہیں مانگیں بلکہ برہم ہو کر مانگی تھیں، دھمکا کر اور للکار کر مانگی تھیں۔ بادل کی طرح گرج کر مانگی تھیں اور اس گرج نے میرے خداؤں کی نیند اڑا دی تھی۔ میں سوچ رہا کہ اگر آج میں انھیں کمینوں کی صف میں ہوتا تو اپنے خداؤں کی ویران آنکھوں کے لیے ابدی نیند فراہم کر دیتا جو اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے بندوق پھینک دی اور قلم اٹھا کر نوکری کے لیے استعفا لکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن شبہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن میرے باپ نے ضمانت دے کر مجھے رہا کروا لیا۔ اس کے بعد پھر مجھے کوئی نوکری نہ مل سکی، کوئی کام نہ مل سکا اور آج سوسائٹی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ میرا ہی خاندان مجھے خاں صاحب کا آوارہ اور نکما لونڈا کے خوبصورت نام سے یاد کرتا ہے — اور آج تم اس آوارہ اور نکمے لونڈے کی بیوی بن کر خاں صاحب کے اتنے بڑے گھر میں آئی ہو۔ یہاں تمھارا کچھ بھی نہیں ہے، یہاں میرا کچھ بھی

نہیں ہے۔ لیکن میں نے خود کو خاں صاحب کی دست برد سے بچا رکھا ہے اور آج تم سے میری یہی التجا ہے کہ اس ماحول کی نفری چکا چوند میں اپنی آنکھوں کو چندھیانہ دینا جس دن تم خاں صاحب کے ہاتھوں بک جاؤ گی وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا"

خانم کواڑ سے کان لگائے سنتی رہیں، کچھ سوچتی رہیں، کچھ اونگھتی رہیں۔ صبح دیر سے بیدار ہوئیں تو خاں صاحب ناشتے پر ان کے منتظر تھے۔ خانم نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے خاں صاحب سے کہا کہ تم اب بھی میری فراست کے قائل ہو یا نہیں میں نہ کہتی تھی کہ اسلم کے پیر جکڑ دو۔ وہ رات کو گھر لوٹ آیا ہے اور اب دیکھنا اس کے پاؤں کا چکر گھر کی اس چار دیواری تک محدود رہے گا۔ خاں صاحب کو اس سے مطلب نہ تھا کہ اب اس کے پاؤں کا چکر گھر کی چار دیواری تک محدود رہے یا شہر شہر کی حدود پھلانگتا رہے۔

دن گذرتے گئے تو خانم کو اپنی فراست کا یقین ہوتا گیا۔ اسلم خاں کے پاؤں کا چکر نہ صرف گھر کی چار دیواری بلکہ اس کے کمرے کی چار دیواری ہی تک محدود ہو گیا تھا۔ وہ دن دن بھر یا تو پڑھتا رہتا یا پھر اپنی بیوی سے تاش کھیلتا رہتا۔ کبھی کبھار گھڑی دو گھڑی کے لیے ادھر ادھر دوستوں سے مل کر آتا لیکن اکثر دوست احباب خود اس کے پاس آجاتے۔ البتہ خاں صاحب اور خانم کو یہ مشترکہ شکایت اس سے ضرور رہتی کہ وہ اپنے سارے دوست احباب کو اپنے ہی کمرے میں بلا روک ٹوک بلا لیتا اور اس کی بیوی کسی سے پردہ نہ کرتی، اور پھر اسلم خاں کے دوست بھی تو بھانت بھانت کے بہروپیے دکھائی دیتے لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ سب کے سب چرب زبان تھے۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتے اور ایسی ایسی باتیں کرتے جو نہ خانم کے سمجھ میں آتیں اور نہ خاں صاحب

ہی کے بس ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے جہاں کا دکھ اسلم میاں اور ان کے دوستوں کے دل میں آن بسا ہے۔ ایک عالم کی فکر ان سب کو کھائے جا رہی ہے۔ جوانی کبھی خاں صاحب پر بھی تو آئی تھی۔ کیسے کیسے نواب زادے اور اونچے گھرانوں کے لڑکے ان کے دوست تھے۔ جب کبھی جمع ہوتے پیاری جان، سبزہ جان، جدن بائی، کجن بائی سب کی سب گفتگو کا موضوع بنی رہتیں پھر بیچ بیچ میں کیا کیا فقرہ بازی ہوتی کہ خانم کواڑ کو کان لگاتے ہی شرما جاتیں۔ لجا کر عرق عرق ہو جاتیں لیکن اسلم میاں کے دوستوں کی نسبت یہ شہرت عام تھی کہ اکثر جیل بھگت کر آئے ہیں۔ قید کاٹ کر آئے ہیں خاں صاحب اور ان کے دوستوں کی مردانگی کے قصے چھڑتے تو کوٹھوں کا تذکرہ ہوتا شہر کی بڑی بڑی طوائفوں کی بات چھڑتی اور آج اسلم خاں اور ان کے دوستوں کی مردانگی اور بہادری کے تذکرے ہوتے ہیں تو جیل کی سزاؤں اور صعوبتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جلسوں اور جلوسوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ خانم سوچتیں کہ دنیا کا رنگ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ آج کا انسان انھیں کل کے انسان سے ذرا مختلف سا نظر آتا۔ اسلم میاں اور ان کے دوستوں کو دیکھ کر خانم کو اپنے شبہات یقین کی صورت میں بدلتے ہوئے معلوم ہوتے لیکن ان کا دل نہ مانتا کہ انسان اللہ سے دور ہو کر بھی نیکی کی طرف جا سکتا ہے۔

اسلم خاں نے اسی کمرے میں کتابیں پڑھتے اور تاش کھیلتے ہوئے کئی چھوٹی چھوٹی زندگیوں کا اضافہ کر دیا۔ دلہن جب بھی امید سے ہوتیں تو خانم مصلّے بچھا بچھا کر گڑگڑاتیں کہ اسلم خاں بیٹے کے باپ بنیں اور خاں صاحب کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے۔ لیکن جیسے دلہن نے بیٹے کو جنم نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ خاں صاحب کو ان باتوں سے کوئی

مطلب ہی نہ تھا۔ خانم البتہ کبھی کبھی سوچتیں کہ اسلم خاں کی دوسری شادی کی جائے۔ دلہن کے بطن سے اولادِ نرینہ نہ ہونے کا انھیں قریب قریب یقین ہوگیا تھا لیکن خانم کی یہ حسرت دل ہی میں رہی۔ دلہن بیٹیاں جنتی رہیں اور اسلم خاں کتابیں پڑھتے رہے۔ خانم بے چاری مصلّے بچھاتیں اور تہہ کرتی رہیں۔

اب تو خانم اس بات کی جرأت بھی نہ کر سکتی تھیں کہ اپنے بیٹے سے دوسری شادی کی بات ہی چھیڑتیں۔ کیوں کہ اب تو وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو گیا تھا۔ خانم کا دستِ نگر تھا تب بھی وہ ہمت نہ کر سکیں اور اب تو وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھیں کیوں کہ اسلم خاں یکا یک ایک ہوٹل کا منیجر ہو گیا تھا اسلم خاں کے ایک کھاتے پیتے دوست نے کافی پیسہ خرچ کر کے اسلم خاں کے ساجھے میں ہوٹل کا کاروبار شروع کیا تھا۔ سمجھوتہ اس طرح ہوا کہ اسلم خاں ہوٹل کے سارے کاروبار انجام دے گا اور جو کچھ منافع ہوگا اس میں ایک تہائی کا حصہ دار رہے گا۔ مجدار خاں اسلم خاں کا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسلم خاں کس قدر قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ ہوٹل کا دھندہ شروع کرنے کے بعد اس نے پھر کبھی پلٹ کر بھی ہوٹل کا رخ نہ کیا اور اپنے دوسرے کاروبار میں الجھا رہا۔ ہر ماہ ہزار بارہ سو روپے مجدار خاں کو گھر بیٹھے ہوٹل کا منافع مل جاتا۔ اسلم خاں کے حالات بھی بہت اطمینان بخش ہو گئے تھے۔ اس کی بچیاں اچھے سے اسکول میں شریک کر دی گئی تھیں۔ اس کی بیوی کا نکلس اس کی صراحی دار گردن کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے سیٹھ کی تجوری سے واپس لے لیا گیا تھا۔ اس کی انگوٹھیاں اس کی مخروطی انگلیوں میں پھر جگمگانے لگی تھیں جن کو ایک سیٹھیے کے پاس رہن رکھتے وقت اسلم خاں نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ تمھاری انگوٹھیاں تمھاری انگلیوں میں اس لیے بہت قیمتی ہو جاتی

ہیں کہ تمھاری انگلیوں کا حسن بھی نقلی ہے کہ ان کی تابناکی ہیں شامل ہوجاتا ہے لیکن جوں ہی یہ انگوٹھیاں تمھاری انگلیوں سے الگ کرلی جاتی ہیں تو کوئی سیٹھ ساہوکار انھیں پچاس ساٹھ میں بھی نہیں پوچھتا۔ اسلم خاں ہوٹل کا مینجر ہوگیا تو اس نے پھر ان انگوٹھیوں کو انمول بنا دیا۔ اس ہوٹل نے جہاں اسلم خاں کی زندگی کا رخ بدلا وہیں اس کے نادار دوستوں کی جیب بھی بھری، ان کا تن بھی ڈھانکا، بیماری میں ان کو صحت بھی بخشی لیکن ڈیڑھ سال تک اسلم خاں کی زندگی کو بے پناہ خوشیوں سے ہمکنار کرکے اس ہوٹل نے بھی آج دم توڑ دیا تھا۔

کال بل خاموش ہوگئی تھی۔

ریڈیو ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

اور اس کی زندگی بھی پھر کسی برفیلی چٹان کے نیچے دب کر منجمد ہوگئی تھی۔ اور اس نقطۂ انجماد کو کسی سیال آگ کے سہارے زندگی کی حرارت بخشنے کے لیے اس نے آج پھر ایک اسکاچ حسینہ کا دامن تھام لیا تھا۔

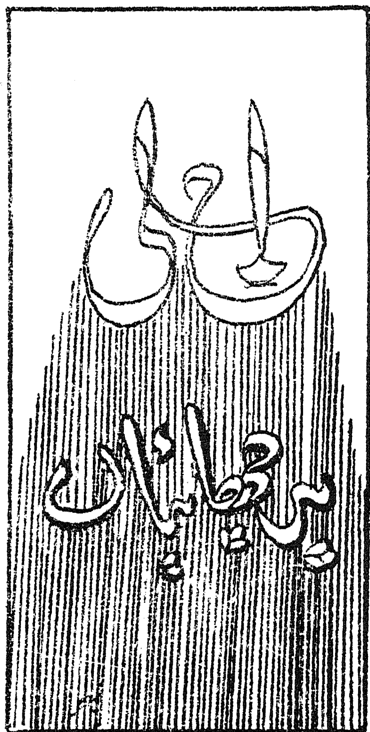
ہوٹل بند ہوگیا تو اسلم خاں کی زندگی بھی ایک ڈگر پر جیسے گھسٹنے لگی۔ اب نہ اس کی بغاوتیں تھیں نہ خاں صاحب کی برہمی۔ اسلم خاں نے زندگی کی جدوجہد میں ہر وقت ناکامی کا منہ دیکھا تھا، اور چپکے چپکے اپنی شکست تسلیم کرلی تھی۔ خاں صاحب کے رحم و کرم پر عمر کا زرین حصہ گذار دینے کے بعد اس نے زندگی کی یکسانیت سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔ ایک گھٹن، ایک بیزاری کا احساس ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا۔ کچھ کرنے کی خواہش نے کچھ نہ کرسکنے کی حسرتوں کا کفن اوڑھ لیا تھا، اور یہ حسرتیں اسلم خاں کے سینے میں دھیمی دھیمی آگ لگائے رکھتیں۔ اس کو بار بار اپنی غلطی کا احساس ہوتا کہ

اپنے ساتھ تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے اس نے اس دنیا میں اور بھی زندگیوں کا اضافہ کر دیا ہے جن کا نہ کوئی حال ہے نہ کوئی مستقبل اور اب یہی چلاتی ہوئی ویرانیاں اور یہ چیختے ہوئے سناٹے اس کا مقدر بن گئے ہیں۔ اس کی زندگی بن گئے ہیں۔ اس کی موت بن جائیں گے۔ ان ویرانیوں اور سناٹوں سے بغاوت کرنے کی اب اسلم خاں میں سکت نہ تھی۔ اس کی بچیاں اسکول کی تعلیم سے اس لیے محروم کر دی گئی تھیں کہ خاں صاحب کو یہ بات گوارا نہ تھی یا مصلحتاً انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا تھا۔

لیکن ایک دن اسلم خاں اپنی بیمار بچی کو سینے سے چمٹائے ہوئے سسکیاں لیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے دواخانے میں فوری شرکت کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ بچی کو طویل المیعاد، ٹائفائیڈ میں آنتوں کی دق ہو گئی ہے۔ اسلم خاں نے ایسی نظروں سے باپ کو دیکھا جیسے اپنی لاڈلی بچی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ خاں صاحب کا چہرہ اس کی ملتجی نظروں کی زد میں باسی پھول کی طرح کمھلا گیا۔ لیکن انھوں نے دوسرے ہی لمحے میں اپنے خضاب چڑھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "اسلم خاں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اپنے پیاروں کو صعوبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تمھاری آزمائش شاید اس کو اسی طرح مقصود ہے۔ اپنے کیے پر دل سے شرمندہ ہو کر اس کی بارگاہ میں گڑگڑاؤ۔ باب اجابت وا ہو جائے گا۔ موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے بیٹا۔ آدمی عاجز ہے، مجبور محض ہے، مجھے جائیداد کا ٹیکس ادا کرنا نہ ہوتا تو میں بٹیا کے لیے کرائے کا وارڈ بھی لے لیتا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے بھلا۔ وہی ڈاکٹر ہوں گے ویسی ہی دیکھ بھال ہو گی۔ عام وارڈ میں بھی تو اللہ کے لاکھوں بندے شفا پاتے ہیں — فقط ایمان کی صلابت اور پختگی چاہیے اور بس۔" اور اس سے پہلے کہ باب اجابت وا ہو جاتا

اسلم خاں نے خاں صاحب کے گھر کا کھلا ہوا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا۔

خانم نے اس بند دروازے کو اپنے بیٹے کے لیے ایک بار پھر کھولا تو اس وقت وہ اپنی مُردہ بچّی کے بستر کے پاس سینی ٹوریم میں بے ہوش پڑا تھا۔ زندگی بھر جس چوکھٹ پر قدم نہ رکھنے کی اس نے قسم کھائی تھی غشی کے عالم میں اس کے نیم مردہ جسم نے وہ چوکھٹا پھر پھلانگ لی تھی۔ خاں صاحب اپنے جگر گوشے کی نورنظر کے کفن دفن کے انتظام میں مصروف تھے۔ اسلم خاں کو ہوش آیا تو میری بچّی میری بچّی چلاّتا ہوا بھاگا۔ سامنے رکھی ہوئی قدآدم الماری کے آئینے میں وہ اپنی پشت پر کھلے ہوئے دروازے کے عکس کو دیکھ کر تمیز نہ کرسکا کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو پیچھے چھوڑ کر بند دروازے کی طرف بھاگ رہا ہے الماری سے ٹکرا کر وہ گرا تو ایک چھناکے سے شیشے ٹوٹ کر بکھر گئے اور الماری کا پٹ بیسوا کے محرم کی طرح کھل گیا۔ اسلم خاں نے دیکھا کہ الماری کے نچلے خانے میں فرنچ اور اسکاچ شرابوں کی درجنوں بوتلیں لڑھک گئی ہیں۔ کوئی آدھی خالی ہے، کوئی پاؤ باقی رہ گئی ہے اس نے یکے بعد دیگرے بچی کھچی خالص شراب کی بوتلیں خالی کردیں آخری بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر چور چور ہوگئی تو وہ جھکا۔ الماری کے سب سے اوپر کے خانے سے نیچے گرا ہوا قرآن فرش پر لنڈھی ہوئی شراب میں نہا رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر قرآن اٹھالیا اور الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھ کر لڑکھڑاتا ہوا خاں صاحب کے وظیفے کے کمرے سے باہر نکل گیا۔



اُجلی پرچھائیاں

اس کے لیے لطخوں کی قیں قیں میں اب بھی اتنی ہی دلکشی ہے جتنی آپ کے
لیے ہنسی کی تانوں میں ہو سکتی ہے۔ آپ اس کو بد مذاق کہہ لیجیے۔ لیکن میں ایسا نہیں
کہہ سکتا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس کا حسین ماضی کچھ دن اسی قیں قیں سے اس
طرح وابستہ رہا ہے کہ وہ ان کی جذباتی قدروں SENTIMENTAL VALUES
سے انکار نہیں کر سکتا۔

چوڑیوں کے چھناکوں کے ساتھ ساتھ ہی قیں قیں کی آوازیں اس
کی زندگی میں داخل ہو گئی تھیں ۔۔ موسیٰ ندی کے کنارے کنارے، کھیت کے
بیلوں کی گھنٹیوں کے ساتھ ساتھ بھی آوازیں وہ گجر دم سنتا رہا تھا ۔۔۔ قریبی
راستے سے گذرنے والے ڈھور ڈھنگر کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ان کے چرواہوں
کی سُریلی اور بے سُری تانوں کے ساتھ اس نے یہی آوازیں سُنی تھیں ۔۔ یہاں تک
کہ چنچل گوڑہ جیل کے سنتریوں کی ہوشیار ہوشیار میں بھی یہی قیں قیں رات گئے تک
شامل رہتی تھی اور اسے ان آوازوں سے اُنس تھا۔

جب وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ محلہ موسبورعیوں پہنچا ہے تو دونوں میاں بیوی مسرور تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز شہر سے کچھ ہی دور ندی کے کنارے اسی چھوٹی سی بستی کے ایک نیم پختہ مکان اور باغیچے سے ہوا تھا جہاں کوئل کی "کوکو" پپیہے کی "پیہو پیہو" مرغوں کی ککڑوں کوں کا ایک ضروری جز بطخوں کی قیں قیں بھی تھی۔

بچپن سے اس نے جس کو چاہا تھا ــــ جوانی میں اس نے جس سے محبت کی تھی وہی لڑکی اس کی دلہن بنائی گئی ــــ لیکن اس طرح کہ عقد میں دلہن کی ماں شریک نہ تھیں ــــ خاندان کے بڑے بوڑھے منہ بسورے جیسے آفتوں کو سہہ رہے تھے ــ پھلوارا سہرہ لاتے ہوئے راستے ہی سے لوٹا دیا گیا تھا اور قاضی جی گھر کی بجائے محلہ کی مسجد میں بیٹھے بادام چھوہاروں کی خیر منا رہے تھے لیکن اس نے ہزار ہزار منتیں کیں اور اپنے والدین کو منا سمجھا کر اس روز عقد مسعود کو ٹلنے نہ دیا ــ

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ قاضی صاحب بیچارے جس عالم میں عقد خوانی سے پہلے تھے اسی عالم میں عقد خوانی کے بعد بھی رہے یعنی سوائے ان کے مقررہ "نیگ" کے انھیں بادام چھوہارے دیکھنا تک نصیب نہ ہوا اور نہ ہی ان کے شملے کا دامن چاولوں سے بھرا گیا۔

ویسے دیکھنے کو لوگ کھاتے پیتے نظر آتے تھے اور کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی کہ اس عقد کا انداز آخر اتنا اسلامی کیوں تھا ــــ نہ نوبت، نہ روشنی، نہ دعوتیوں کا ہجوم نہ میراثنیں ــــ بغیر مسند کے دروازے سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہوئے نوشاہ ــــ گلے میں ایک پھولوں کا ہار جو قاضی صاحب کے عقد خوانی شروع کر دینے کے بعد ڈال دیا گیا تھا ــــ قاضی صاحب سوچتے رہے اس کو اسلامی شادی کیسے

ہا جاسکتا ہے ـــــ مسند نہ ہو تو مضائقہ نہیں لیکن چاول اور چھواروں کی
رکت سے جو واقف نہ ہوں وہ کیا جانیں اسلام کیا ہے ـــــ ماحول کی اجنبیت
نے بے چارے قاضی صاحب کو اتنی اجازت بھی نہ دی کہ وہ اپنے حقوق کے اتلاف
ر احتجاج کرتے ـــــ ورنہ اگر شادی جیسی شادی ہوتی اور چھوہارے بادام کم نظر آتے
و قاضی صاحب ضرور ٹوک دیتے کہ بھئی ان ضروری باتوں میں بخالت نہیں کرنی چاہئے
ہ اللہ کی برکت اسی میں ہے ورنہ باجے گاجے اور جگمگاتے گولے صرف دنیاداری کی باتیں
یں ـــــ لیکن یہاں تو سرے سے سب کچھ غائب تھا ـــــ یہاں تک کہ چہروں کی
بشاشت غائب تھی ـــــ ہونٹوں پر ہنسی غائب تھی اور جب قاضی صاحب نے دلہن
ی عمر اور نام دریافت کیا تو سب کو خاموش دیکھ کر خود دلہا میاں بول اٹھے کہ نام یہ
ہے، عمر یہ ہے اور اس انداز سے قاضی صاحب کو دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ
ولوی صاحب فرمائیے تو ناک نقشہ سب نوٹ کرادوں ـــــ لیکن قاضی صاحب کی تیکھی
ظروں نے دلہا میاں کو ٹوک دیا اور اس بے ضابطگی پر ان کی جھلاہٹ کو محسوس کرتے
ہوئے دلہن کے ماموں نے خواستہ ناخواستہ دوسرے سوالوں کی تکمیل کروادی ـــــ
نقد پڑھا دیا گیا تو قاضی صاحب نے اپنے "نیگ" کو اندرونی جیب میں اس طرح
چھپا لیا جیسے یہ رقم بھی انھیں غلطی سے دے دی گئی تھی، اور سلیپر پاؤں میں اٹکائے
پٹر پٹر کرتے دروازے کی طرف لپکے۔

غرض اس کی شادی بھی اتنے ہی ہنگاموں سے تکمیل کو پہنچی جتنے ہنگاموں
ں اس کی محبت پروان چڑھی تھی ـــــ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی جرائم پیشہ کی
رح وہ خاندان بھر کی نظروں میں کھٹکتا رہا تھا۔ مخالفتیں جتنی شدید ہوتیں ان کا

ردعمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ــــ اور شاید ان مخالفتوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ خاندان ہی کی ایک لڑکی سے جو اس کی قریب ترین رشتہ دار تھی اس نے بے اندازہ محبت کی تھی ایسی محبت جو بڑی سے بڑی رکاوٹوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خاندان بھر کی پہلی محبت تھی ـــ پہلی کہانی تھی ـــ پہلی حقیقت تھی ـــ

چھوٹی عمر ہی سے وہ ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے ـــ ساتھ کھیلنا، ساتھ ہنسنا اور کبھی نہ جھگڑنا ــــ اس کی امی کہتیں کہ لولو سے کوئی جھگڑتا ہے تو یہ شریر اس کی وکالت کرتا ہے اور سب بچّوں کو ڈانٹ بتاتا ہے ــــ پتہ نہیں یہ مزاج داریاں کیا رنگ لائیں اور جب یہ مزاج داریاں رنگ لائیں تو سارا خاندان اس کی مخالفت پر تل گیا اور جوں جوں مخالفتیں بڑھتی گئیں کوئی اس کے دماغ پر چھاتا گیا۔ دل کے اندر ہی اندر ایک چھوٹی سی دنیا تعمیر کرتا گیا، تعمیر کرتا گیا یہاں تک کہ اس کو یقین ہو گیا کہ کوئی تخریبی قوت اس چھوٹی سی دنیا کو تہس نہس نہیں کر سکتی یہاں تک کہ یہ اب اس کے اپنے بس میں بھی نہیں ـــ اور کسی نے اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں سے پکار کر کہا تم سچ کہتے ہو ـــ نہ اب یہ تمھارے بس میں ہے اور نہ میرے بس میں ـــ میں صرف اس دنیا کی تعمیر کر سکتی ہوں اور تم نے جن ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ہے میں ان ہی ہاتھوں سے اس دنیا کے چپے چپے کو سنوار دوں گی، ذرّہ ذرّہ کو نکھار دوں گی ـــ اور آخر کار چپہ چپہ سنور گیا، ذرّہ ذرّہ نکھر گیا اور وہ دونوں اپنے دل کے اندر سجائی ہوئی اس خوبصورت دنیا کو اپنے ساتھ لیے اس مکان میں داخل ہو گئے جہاں انھیں اپنی اس دنیا کو دھرتی پر رکھ کر کچھ اور نکھارنا تھا کچھ اور سنوارنا تھا۔

پندرہ روپے ماہانہ کرایہ کے لحاظ سے یہ مکان کافی اچھا تھا ـــ دو ہال

ایک دیوان خانہ اور دو کمرے جن میں ایک کمرے کو مالک مکان نے اپنا کچھ سامان محفوظ کر کے مقفل کر دیا تھا۔ صحن بہت وسیع تھا۔ اصل عمارت کے پیچھے صحن میں حمام باورچی خانہ وغیرہ الگ تھے۔ صحن کے علاوہ مکان کا احاطہ کافی وسیع تھا۔ جس میں بہت ہی سلیقے سے گلاب موتیا کے درخت، سمنٹ کے پختہ درمیانی حوض کے اطراف لگائے گئے تھے۔ سپوٹوں اور آموں کے درختوں کی قطار چار دیواری سے لگی بلکی احاطہ کی تین سمتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک سمت کیلے کے درخت پھلیوں سے لدے ہوئے کھڑے تھے اور ایک دوسرا حوض کیلے کے درختوں کی جھنڈ میں پوری طرح چھپا ہوا تھا۔ جیسے خود ان درختوں نے اپنے لمبے لمبے پتوں میں اسے سو سو جتن سے چھپا رکھا ہو کیوں کہ یہ محض صرف اسی لیے بنایا گیا تھا کہ کیلے کے درختوں کی آبیاری کے لیے نل کا پانی اس میں جمع کیا جا سکے اور جیسے کیلے کے درخت اس راز سے واقف تھے کہ ان کی بالیدگی کے لیے ان کی زندگی کے لیے اس حوض کی کتنی اہمیت ہے۔

سپوٹوں اور آموں کے درختوں کی پہلی قطار کے گھنے سائے میں ایک بہت ہی کشادہ پختہ ڈربہ بنا ہوا تھا جس میں ایک چھوٹا سا متصل حوض بھی تھا۔ جس کی نالی باغیچے کے درمیانی بڑے حوض سے ملی ہوئی تھی۔ گھر کو ایک نظر دیکھنے پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ مالک مکان بہت ہی سلیقہ مند آدمی ہے اور نہ صرف اس کو باغبانی کا شوق ہے بلکہ اس نے خاص طور پر پختہ اور عمدہ ڈربے کا اہتمام محض بطخوں کے لیے ہی کر رکھا ہے جو شاید کبھی پھٹ پھٹ چنچ چنچ کرتیں دھنکی ہوئی رنگدار نگس روئی کے گالوں کی مانند اس خیالی دار محلسرا میں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتی ہوں گی۔

تصور میں اس کو ننھی ننھی بطخیں خراماں خراماں اس محلسرا سے نکلتی ہوئی نظر

اجلی پرچھائیاں

آئیں جو قیں قیں کرتی باغیچے کی نالیوں میں اشنان کرنے لگیں۔ پاس ہی موسیٰ ندی سے آتی ہوئی یہ آوازیں اس کو اپنی ہی چار دیواری میں گونجتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کی ٹہنی سے ایک اور پھول توڑ لیا اور بڑے چاؤ سے اپنی بیوی کے بالوں میں سجاتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ مقام بطخوں کے دھندے کے لیے بہت موزوں ہے ۔۔۔ ندی کے دونوں جانب یہی کاروبار کرنے والے آٹھ دس گھرانے بستے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ کل سویرے سویرے ہم ٹہلتے ہوئے ندی کے کنارے پہنچ جائیں اور ننھی ننھی بطخوں کی چنچلتا اور شوخیوں سے لطف اٹھائیں ۔۔۔ اور اگر کوئی ڈھب کا آدمی مل جائے تو پانی میں تیرنے والے بادل کے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے متعلق ممکنہ معلومات فراہم کر لی جائیں ۔۔۔ اس کی بیوی نے بہت احتیاط سے پھولوں کو بالوں میں سجاتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ٹھیک ہے میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی کہ ہمیں بطخیں پالنا چاہیئے ۔۔۔

دوسرے دن سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی قیں قیں کی آوازوں نے انھیں نیند سے چونکا دیا۔ اس کی بیوی نے کہا ہم ان دور سے آتی ہوئی آوازوں کو قریب سے سننے کے متمنی ہیں۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہم بہت صبح اٹھنے کے عادی بھی ہو جائیں گے۔ گھر سے باہر نکلنے سے قبل انھوں نے ایک اچٹتی نظر اپنے باغیچے پر ڈالی۔ نئے گھر کی نئی صبح بہت حسین معلوم ہو رہی تھی ۔۔۔ کل تک جو کلیاں تھیں آج وہ گلاب ہو گئی تھیں۔ رات بھر نل کے جاری رہنے سے درمیانی حوض آدھے سے کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا ۔۔۔ انجیروں پر چڑھے ہوئے پورے انیس ڈبے اپنی اپنی جگہ برابر تھے اس کی بیوی نے ڈبوں کو گنتے ہوئے کہا کہ خود اس باغیچے کے پھل پھلاری ہی سے ہم

مکان کا کرایہ ادا کر سکتے ہیں ـــــ مکان دار سچ ہی کہتا ہوگا کہ اس نے صرف اس خیال سے کہ گھر میں اچھے لوگ اتر جائیں تو درختوں کی دیکھ بھال ہو گی اتنے کم کرائے پر ہمیں یہ مکان دے دیا ہے۔

ادھیڑ عمر کا یہ آدمی روزانہ سیکل پر شہر سے یہاں تک صرف اس خیال سے آتا تھا کہ اس کا کتا بھوکا نہ رہ جائے۔ جھاڑ نہ مرجھا جائیں ـــــ خاص طور پر آموں کے صرف دو فیٹ اونچے دو چھوٹے درخت جو سیڑھیوں سے بالکل قریب تھے اور جن پر اس کو بہت ہی ناز تھا کہ ان درختوں کو ہر موسم میں پانچ پیوندی آم ضرور لگتے ہیں ـــ اور ان آموں کے بوجھ سے یہ درخت زمین پر جھک جھک جاتے ہیں اور وہ سینہ تان کر دوست احباب کو بتلاتا ہے کہ سارے حیدرآباد میں ایسے پیڑ کہیں نہیں ہیں۔

"واقعی ان دونوں پیڑوں کی ہمیں بہت حفاظت کرنی چاہیئے۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ مالک مکان کے بہت چہیتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اگر واقعی ان درختوں میں آم لگتے ہیں تو یہ ایک نئی چیز ضرور ہیں ــــ"

اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو انجیر گن لینے کے بعد کیلے کی پھنیوں کے حسن سے زیادہ ان کی مالیت کا اندازہ لگانے میں منہمک تھی اور جو حوض میں گرتے ہوئے نل کے پانی کی آواز کی وجہ سے اس کی بات نہ سن پائی تھی ـــــ

"بہر حال خوب مکان ہے" اس نے اس کو مخاطب کرنے کے لیے ذرا بلند آواز میں کہا ـــ

اس کی بیوی مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ان مسکراہٹوں کو سمجھ رہا تھا۔

اس کے دل کی دنیا کے چپے چپے کو سنوارنے والے ہاتھ اب اس دنیا کو زمین پر رکھ کر اس کی تکمیل کے متعلق سوچ رہے تھے ــــ

کیلے کی پھنیاں عربی گھوڑے کی طرح گردنیں تانے بہت مغرور انداز سے گویا اس بات کی ضمانت دے رہی تھیں کہ فکر مت کرنا چار چھ ماہ کا کرایہ تو ہم ہی ادا کر دیں گے۔ اور اس کی مسکراہٹیں کہہ رہی تھیں کہ میں صرف تعمیر کر سکتی ہوں تکمیل کر سکتی ہوں ــــ اور بطخوں نے دور دور سے پکار پکار کر کہا قیں قیں قیں قیں ــــ تم سچ کہتی ہو ــــ اور دونوں مسکرا دیئے۔ اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے اس کی بیوی نے پوچھا۔ "یہ بطخیں کس حساب سے ملتی ہیں" اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ آج پوچھنے پاچھنے سے کچھ اندازہ لگ ہی جائے گا اور دونوں باہر نکل گئے۔

گلشن بوا نے ٹامی کو اندر بلاتے ہوئے دروازہ بند کر لیا ــــ گلشن بوا اس کی سسرال سے اس کی بیوی کے ساتھ آ گئی تھیں اور لمبے لمبے بالوں والے مسٹر ٹامی گھر کے ساتھ ہی گھر کے رکھوالے کی حیثیت سے اُن کے حصے دار تھے ــــ کھیت کی پگڈنڈیوں پر اس نے اپنی بیوی کو سنبھال لیا ــــ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی ان کے پاؤں کے نیچے جیسے بچھ بچھ جاتی تھیں۔

چپلوں کو ہاتھ میں اٹھائے پگڈنڈی کے کناروں پر اُگی ہوئی مخملی ہریالی پر پاؤں رکھتے ہوئے اس کی بیوی نے اس کو مڑ کر دیکھا ــــ اس کا جی چاہا کہ قدم قدم پہ کومل کومل مخملی ہریالی بچھا دے اور اس کا ہاتھ پکڑے بے شمار پگڈنڈیوں پر چلتا رہے نرم ہاتھوں پر اپنے ہاتھوں کی گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے وہ اس کو گدگدانے والا ہی تھا کہ سامنے پل پر قیں قیں کا شور بلند ہوا۔

دو بچے پاس کے نشیبی راستے سے ننھے منے ململے ململے، رنگ برنگے روئی کے گالے لڑھکاتے لڑھکاتے چلے آ رہے تھے ـــــ قیں قیں قیں کا کورس گاتی ہوئی یہ فوج اس فاتحانہ انداز سے چل رہی تھی جیسے تمام بحر و بر پر اس کا قبضہ ہے۔ سامنے گھنے پیڑ کے پیچھے سے سورج ابھر رہا تھا۔ پل پر پہنچتے پہنچتے بطخوں کی یہ شفاف ٹولیاں پیڑ کی چوٹی سے چھنتی ہوئی کرنوں میں نہا رہی تھیں ـــــ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک ندی پل کے نیچے بہہ رہی ہے اور ایک ندی پل کے اوپر کہ اتنے میں ایک زناٹا تی ہوئی موٹر سائیکل نے اس ندی کی چادر کو دو مختلف حصّوں میں بانٹ دیا۔ قیں قیں قیں ـــــ اور یہ بہتا ہوا پانی منجمد ہو کر اڑتے ہوئے برف کے گالوں کی طرح ادھر اُدھر بکھر گیا۔ پل پر بہنے والی ندی پل بھر میں غائب ہو گئی اور پل کے نیچے بہنے والی ندی کی شانتی جیسے ڈولنے لگی۔ قیں قیں قیں قیں ـــــ پانی کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ہلکورے پیدا ہو گئے ـــــ کنارے پر کھڑے ہوئے درخت، ٹیلے، چٹانیں جو ندی کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر سنور رہے تھے جیسے غش کھا گئے کیوں کہ ان کا عکس پانی میں حل ہو رہا تھا اور ان سے اپنی ہی صورت پہچانی نہیں جا رہی تھی ـــــ لیکن ان تمام باتوں سے بے نیاز، منظر کو تہ و بالا کرتی ہوئی یہ بحری فوج اپنے کمالات کا مظاہرہ کرنے میں مگن تھی ـــــ

وہ دیر تک کنارے پر بیٹھے ہوئے منظر کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے رہے ـــــ سامنے کناروں پر بطخوں کی ٹولیاں مختلف سمتوں سے ندی کی طرف شور مچاتی بڑھ رہی تھیں ـــــ ان کے رکھوالے کوئی ہاتھ میں پتلی سی چھڑی پکڑے کوئی جوار کی ٹوکری تھامے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے ـــــ

پانی میں تیرتی ہوئی بطخیں کناروں پر آتی ہوئی بطخوں کو دیکھ کر اپنی گردنیں پانی میں ڈبولیتیں اور جلدی سے کیڑوں اور پرکلیوں کی تلاش میں مصروف ہو جاتیں جیسے دوسری بطخوں کے ندی میں اترنے سے پہلے ہی سارے کیڑوں اور پرکلیوں کو ہڑپ کرلیں گی ـــــ جو ذرا سنجیدہ سی تھیں، پر پھیلا پھیلا کر چونچ ڈبو ڈبو کر اپنے پنکھوں سے پیٹھ پر پانی اچھال اچھال کر نہا رہی تھیں ـــــ کنارے پر پھٹ پھٹ کرتی ہوئی ایک ٹولی چھوٹے چھوٹے پتھروں اور پودوں سے بچتی بچاتی پانی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی ـ ایک ٹکڑی اتھل پانی میں اتری کیچڑ میں چونچیں دھنسائے پچ پچ خچ خچ کرتی کیڑے اور گھونگھے چن رہی تھی ـــــ تیرتی ہوئی بطخوں میں ایک نر ایک مادہ کی گردن کو اپنی چونچ میں دبائے ٹھٹھول کر رہا تھا۔

اس نے پاس بیٹھی ہوئی اپنی جھینپتی بیوی کے چٹکی لی ـــــ ندی سے نظریں ہٹا کر اس کی بیوی نے اس کو دیکھا اور نظریں جھکالیں ـ

پل پر کھڑے ہوئے لڑکے کو اس نے اشارے سے بلایا جو کسی نہ کسی بہانے نظریں گھما گھما کر انھیں دیکھ رہا تھا ـ جب لڑکا پاس آگیا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو بٹھالیا ـ دیر تک جانے کیا کیا باتیں ہوتی رہیں ـ اپنی بطخوں کے ندی میں دور تک چلے جانے کا جب میراں کو احساس ہوا تو وہ بغیر کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا، اور آؤ آؤ کی آوازیں لگاتا، کنارے کنارے بھاگنے لگا ـــــ اس کی اپنی ٹولی کی بطخیں گردن گھما گھما کر آؤ آؤ کی آوازوں کی طرف دیکھنے لگیں ـ اور پھر جواب میں قیں قیں قیں قیں کا شور بلند ہوا، جیسے سب کی سب کہہ رہی ہوں کہ گھبراؤ نہیں ہم بچّہ تھوڑا ہی ہیں جو کہیں بھٹک جائیں ـــــ لیکن میراں اس تسلّی دینے والی قیں قیں سے مطمئن نہ تھا ـــــ

بھاگتے بھاگتے ہی اس نے پتھر اٹھا لیے اور تیرتی ہوئی بطخوں کے عین سامنے پھینکنے لگا ۔ ٹُبرق، ایک پتھر ڈوب گیا ۔ قیں قیں، مت پتھر نہ مارو ہم لوٹتے ہیں ۔

ٹُبرق، دوسرا پتھر پانی اچھالتا ہوا غائب ہو گیا ۔ قیں قیں، قیں قیں ۔ یہ کیا بد تمیزی ہے میاں ۔

ٹبرق، تیسرا پتھر اگلی دو بطخوں کے بالکل قریب گرا ۔

قینق ۔ جلدی جلدی پانی کاٹتے ہوئے بطخوں نے اپنا رخ بدل دیا اور مسلسل قیں قیں شروع ہو گئی ۔

قیں قیں قیں ۔ "اچھا ٹھہرو مالک سے تمھیں پٹوائیں گے ۔"

قیں قیں قیں ۔ آج رات کوئی انڈا نہیں دے گا ۔

لیکن میراں جیسے اس راز سے واقف تھا ۔ نہایت نرمی سے وہ آوازیں دے رہا تھا، آؤ آؤ جیسے پچکار رہا ہو کہ دیکھو انڈے کبھی مت بند کرنا ورنہ مالک تمھارے میراں کو نوکری سے جواب دے دے گا ۔ آؤ آؤ ۔ "اور پھر میراں تمھارا دوست ہی تو ہے ۔ ادھر بڑی بڑی چٹانوں میں کوئلے گھات لگائے چھپے رہتے ہیں کہ تم اس کنارے کا رخ کرو اور پھر اپنے میراں کو پکار بھی نہ سکو ۔"

قیں قیں ۔ "کوئلے کہیں اس ندی کی تہہ میں تو نہیں ہیں میراں ؟"

قیں قیں ۔ "تم یہیں ٹھہرو ہم آ رہے ہیں ۔" قیں قیں قیں ۔

وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تو میراں نے وہیں سے کھڑے کھڑے ہاتھ ہلایا ۔ جواباً اس نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا ۔ "چلو اتنا تو معلوم ہوا کہ،

پاشو میاں یہاں کے سب سے بڑے بیوپاری ہیں اور واجبی داموں سے بطخوں کا معاملہ انھیں سے ہو سکتا ہے۔"

دوسرے کنارے پر ٹین کے سائبانوں کے پاس کھڑے ہوئے ایک موٹے سے تہمد باندھے ہوئے آدمی کو بتلاتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا "ہو سکتا ہے پاشو میاں وہی ہوں — کتنا مالدار ہوگا یہ آدمی — ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بطخیں — دل لگی نہیں ہے — پل کے ادھر جتنی بطخیں ہیں غالباً سب کی سب اسی کی ہوں گی — روز کتنے ہی انڈے نکلتے ہوں گے۔ ٹوکریوں کی ٹوکریاں بھر جاتی ہوں گی تیرہ برس سے جب اس کی زندگی کا انحصار اسی دھندے پر ہے تو وہ بہت تجربہ کار ہوگا — کل ہی آپ اس سے مل لیجیے نا۔"

کھیت کی باڑھ میں الجھے ہوئے آنچل کو چھڑاتے ہوئے اس نے جواب دیا "آج ہی کیوں نہ مل لوں؟"

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور گھر کی طرف چل پڑے۔

ناشتے وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد دونوں گھر کی صفائی اور تزئین میں مصروف ہو گئے — بوا بستی کا چکر لگا کر ضروریات کی دکانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے چلی گئیں — مسٹر ٹامی بھی بوا کے پیچھے دم ہلاتے ہوئے چل پڑے جیسے ساری بستی سے بوا کو متعارف کرانے کا فرض ادا کریں گے۔

آج دن بھر وہ گھر ہی کے کام دھندوں میں الجھے رہے — تھوڑی تھوڑی دیر سے قیں قیں کی آوازیں آ آ کر انھیں یاد دلاتی رہیں کہ پاشو میاں سے ضرور ملنا۔ لیکن اس نے دوسرے دن پر اس کام کو اٹھا رکھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ پاشو میاں سے ملنے کے لیے چلا گیا تو اس کی بیوی بڑے چاؤ سے سب درختوں کو پانی دیتی رہی ـــــ منہ تک لبالب بھرا ہوا حوض آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا ـــــ اپنے پلّو کو اپنی کمر کے گرد لپیٹے وہ خوش خوش باغبانی میں مصروف ہو گئی۔

ہندوستان کے نقشے پر دریاؤں کی نشان دہی کرتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی مانند درختوں کی آبیاری کرنے والی نالیاں سارے باغیچے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ پھاوڑے سے مٹی کرید کر ایک نالی کا منہ بند کر دیتی اور بہتے ہوئے پانی کا رخ تیزی سے بدل جاتا اور درختوں سے چھنتی ہوئی سنہری دھوپ میں ایک روپہلی لکیر بہت ہی اطمینان سے بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح درختوں کے تنوں میں پہنچ جاتی اور پھر اس کے ہاتھوں کی ذرا سی جنبش سے یہ روپہلی بل کھاتی ہوئی ناگن دوسری جانب چل پڑتی ـــــ روپہلی ناگن کا یہ رقص کافی دیر تک چلتا رہا ـــــ یہاں تک کہ آدھے سے زیادہ حوض خالی ہو گیا اور تمام درخت ٹھنڈا میٹھا پانی پی چکے تو اس نے حوض کے نچلے سوراخ میں ڈاٹ ٹھونس کر پانی کی دھار کو روک دیا۔

کیلے کے پیڑوں کی بات جدا تھی۔ ان کے لیے ایک بھرپور حوض الگ تھا اور بلا شرکت غیرے وہ اس کی ایک ایک بوند کے مالک تھے ـــــ پلّو کی گرفت کو کمر میں اور مضبوط کرتے ہوئے وہ دوسرے حوض کی طرف بڑھی تو بڑے بڑے نرم پتوں نے اس کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے جیسے جھک کر رازدارانہ انداز میں اس کے کانوں میں کہا تم بہت اچھی ساتھی ہو۔ ہم اپنے تمام خزانے تمھارے لیے اگل دیں گے اور اس نے مسکرا کر بہت ہی پیار سے پتوں کو ٹہلاتے ہوئے جھک کر حوض کا ڈاٹ نکال لیا ـــــ

اُجلی پرچھائیاں

پانی کی تیز دھار نالیوں سے ہوکر ایک ایک پیڑ کو گدگدانی گئی ـــ بالکل اس طرح جیسے تازہ لہو شریانوں میں دوڑتا پھرتا ہے اور جو بالیدگی کے لیے ضروری ہے تازگی کے لیے ضروری ہے۔ زندگی کے لیے ضروری ہے۔

قیں قیں قیں، ندی سے آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے بطخیں کہہ رہی تھیں ـــ جالی دار محلسرا میں جو چھوٹا سا حوض ہے اس کی ہم ہی یکا و تنہا مالک ہیں ـــ اور وہ سوچنے لگی ـــ دُھنکی ہوئی روئی سے بنی ہوئی یہ رانیاں اپنے پیٹ میں بہت سے انڈے چھپائے جب اس محلسرا میں داخل ہوں گی تو باغیچے کی وہ نالی بھی اس طرح خشک نہ رہ سکے گی جو اس چھوٹے سے حوض سے ملی ہوئی ہے اور جس کا اب کوئی پرسان نہیں ہے۔

قیں قیں قیں ـــ ہم آرہی ہیں ـــ قیں قیں قیں ـــ اور اس کی نظریں ڈربے کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ پل پر سے ہوکر پاشومیاں کے پاس پہنچا تو وہ ہزاروں بطخوں میں گھرا ہوا مٹھی بھر بھر کر جوار بکھیر رہا تھا۔

قیں قیں قیں کرتی ہوئی بطخیں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہی تھیں ـــ دوسری بہت سی ٹولیاں ندی میں اتر گئی تھیں۔ بعض کناروں پر چخ چخ چخ میں مصروف تھیں۔ ٹین کے سائبانوں کے سامنے چبوترے پر انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں دھری ہوئی تھیں جن پر غالباً نظر نہ لگنے کے خیال سے پاشومیاں نے کپڑے اڑا رکھے تھے۔

بکھری ہوئی جوار کا ایک دانہ بھی زمین پر نہ بچا تو پاشومیاں نے ننیال کو پکار کر پوچھا کہ پختہ سائبان والی بطخیں نالے میں اتاری گئیں یا ندی میں۔

اُجلی پرچھائیاں

بیڑی کا دھواں اڑاتے ہوئے ایک دبلے پتلے نوجوان نے آواز دی "یہاں نالے میں ہیں جی، نالے میں"

"تو پھر صمدانی کہاں مرگیا ہے رے"

"اندر انڈے چن رہا ہوگا" اور منیال منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا دھواں اڑانے لگا۔

پاس کے سائبان سے آواز آئی "بیضے بٹور رہا ہوں بابو۔۔۔ بعضے بعضے ٹوٹ گئے ہیں"

پاشو میاں نے ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا "ابے وہ ہندوستانی بچّے دن بھر یہی کرتا رہے گا۔ اور جو تیری مائیں یہاں کھڑی قیں قیں لگا رہی ہیں یہ اگر نالے میں اتر پڑیں تب دوہری محنت کرنے کیا تیرا باپ آئے گا" پاشو میاں نے اس کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا تو وہ ٹہلتا ہوا نالے کی طرف بڑھ گیا۔

کل تک اس کو معلوم نہ تھا کہ ندی سے چالیس پچاس قدم پرہی اتنا بڑا پختہ نالہ بھی ایک ہی سمت ندی کے متوازی بہتا ہے ۔۔۔ نالے میں پاشو میاں کی بطخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں ۔۔۔ گردنیں پانی میں ڈبوئے دمیں اوپر اٹھا کر وہ بالکل سفید سفید اور رنگ برنگی اوندھی اوندھی صراحیوں کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں ۔۔۔ لیکن یہ اوندھی صراحیاں دیر تک اوندھی نہ رہ سکتی تھیں بلکہ دیکھتے کے دیکھتے قیں قیں کرتی ہوئی بطخیں بن جاتیں اور اچھی خاصی دوسری بطخیں اوندھی اوندھی صراحیوں کا روپ دھار لیتیں۔

وہ منٹ دو منٹ خاموش کھڑا ہوا منیال کی ماؤں کے کرتب دیکھتا رہا۔۔۔

پاشو میاں کی زبان میں جب وہ صمدانی کی مائیں تھیں تو یہ متیال کی مائیں ہوں گی، اور نہ وہ سوچنے لگا کہ آدمی تو بالکل بدتمیز اور جاہل مطلق معلوم ہوتا ہے ــــ

ہُش ہُش ہش ــــ صمدانی کی مائیں نالے کی طرف بڑھ رہی تھیں ــــ اور متیال اپنی ماؤں کے حقوق کی حفاظت کر رہا تھا ــــ اور صمدانی کی مائیں پکار رہی تھیں ــــ قیں قیں قیں قیں ــــ راستہ کیوں روکتے ہو متیال ــــ ہُش ہش ہوش ــــ قیں قیں قیں ــــ تو پھر ہمارے فرزند صمدانی کہاں ہیں ــــ اور ایک چُگی داڑھی والا آدمی نکر اور بنیان پہنے انڈوں کی ٹوکریاں لالا کر چبوترے پر جار رہا تھا، اور پاشو میاں موچھوں پر تاؤ دیتا ہوا چرٹ منہ میں دبائے سائیاں کے پاس کھڑی ہوئی ایک صفائی والی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا ــــ

صفائی والی اپنی لوہے کی ٹوکری میں ایک موٹی سی جھاڑو رکھے اپنے کولھوں پر ٹوکری کو ٹکائے کن انکھیوں سے انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کو دیکھ رہی تھی لیکن پاشو میاں اس لوہے کی ٹوکری کو نازک انڈوں سے بھر دینے کے لیے تیار نہ تھا کیوں کہ ٹوکری لوہے کی تھی اور انڈے بہت نازک تھے اور پاشو میاں بستی کا سب سے بڑا بیوپاری تھا اور نہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی عورت ایک صفائی والی تھی جو زیادہ جوان بھی نہ تھی۔

صمدو اپنے کام سے فراغت پا چکا تو اپنے انتظار میں ٹھہری ہوئی بطخوں کو ہانکتا ہوا ندی کی طرف چل پڑا ــــ قیں قیں جیسے کہہ رہی ہوں بہت دیر ہو گئی صمدانی اور پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی بے شمار بطخیں جلدی جلدی پھٹ پھٹ پھٹ کرتیں ــــ ہلتیں جھولتیں، ندی کی طرف چل پڑیں ــــ

اُجلی پرچھائیاں

سائبان کے پاس کھڑی ہوئی صفائی والی ایک ہاتھ میں جھاڑو اور دوسرے ہاتھ میں ٹوکری پکڑے ہوئے سائبان میں چلی گئی تاکہ بطخوں کی رات بھر کی بیٹ صاف کردے اور پاشو میاں لمبے لمبے کش بھرتا ہوا چبوترے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پاشو میاں کے قریب پہنچ کر بے وجہ مسکرا دیا۔

"غالباً سیٹھ پاشو میاں آپ ہی ہیں ــــ مجھے کچھ بطخوں کی ضرورت تھی۔ معلوم ہوا کہ بستی بھر میں واجبی داموں پر آپ ہی سے معاملہ ہو سکتا ہے ــ اسی لیے میں سیدھے آپ کے پاس چلا آیا ــــ

"نہیں صاحب آپ پہلے چار جگہ قیمتوں کا اطمینان کر لیجیے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ واقعی میرے دام واجبی ہیں یا نہیں" بہت ہی مسکراتے ہوئے پاشو میاں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"مگر آپ کے دام مجھے معلوم ہو جائیں اور پھر ویسے بھی ایک دوسرے پر اعتماد ہی سے دنیا چلتی ہے" اس نے جواب میں کہا۔

"کس لیے چاہئیں آپ کو بطخیں ــــ میرا مطلب ہے کیا آپ کو انڈے والے جانور کی ضرورت ہے یا پکوان کے لیے چاہئیے؟"

اور اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ــــ "دیکھئے پاشو سیٹھ مجھے کچھ ایسا بڑا دھندہ تو نہیں کرنا ہے۔ بس انڈے والی بطخیں چاہئیں جس سے میں آہستہ آہستہ کچھ پیدا کر سکوں"

"تو پھر میں آپ کو نالے ملیا کے تیار جانور دوں گا جو پھٹا پھٹ انڈے دیتے

رہیں۔ اور ابھی جو جانور ندی کی طرف گئے ہیں ان میں زیادہ نر پٹھے ہیں — کھانے کے لیے ان کا گوشت لذیذ ضرور ہوتا ہے لیکن انھیں انڈوں پر آنے کے لیے بہت دن چاہئیں — تو پھر فرمائیے کتنا جانور چاہیے آپ کو؟"

"لیکن آپ نے دام کا تعین نہیں کیا — دام معلوم ہو جائیں تو کل آ کر میں حسب ضرورت لے جاؤں گا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے بھی اب جانور شام تک ہاتھ نہیں آنے کا — پانی میں اترا اور بس سے باہر ہوا — لیکن ذات بڑی مُنڈ ہے۔ دیکھ بھار رہی ہے بالکل بری مرغیوں کی طرح نہیں کہ واپلی اور چٹ پٹ سے غائب — آپ کی خاطر ۳۶ روپے درجن کے حساب سے چھانٹ کر دے دوں گا — پہلے تو ان داموں میں آپ کو ایسا جانور ملے گا نہیں اور پھر کرسمس قریب ہونے سے اب دام بھی چڑھ جائیں گے — میری رائے میں یا تو آج کل ہی میں اٹھا لیجیے یا پھر مہینہ ڈیڑھ مہینہ توقف کیجیے۔ لیکن بعد میں بھی آپ کو ان داموں سے کم کیا ملے گا" پاشو میاں نے مسکراتے مسکراتے ایک ہی سانس میں اتنی سب باتیں کر دیں۔

"تو پھر یہ قطعی دام ہیں؟ کمی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔؟"

نہیں صاحب آپ چار جگہ اور اطمینان کر لیجیے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں — پوری طرح یقین ہو جائے تب تشریف لائیے اور درجن۔ دو درجن۔ دس درجن جتنا چاہیے اٹھا لیجیے — زور نہ ظلم — سودا مرضی سے ہونا چاہیے — ہے نا صاحب — دغا فریب تو ہے نہیں — روز روزہ زندگی ہے تو یہ سب کس کے لیے — آپ اطمینان سے آئیے اور جب چاہے آئیے۔

اُجلی پرچھائیاں

مصافحہ کر کے رخصت ہوتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ آدمی معاملے کی حد تک سیاہ معلوم ہوتا ہے ـــ

تیں تیں تیں ـــ اور اس کی نظریں نالے پر چہل کرتی ہوئی بطخوں پر جم گئیں ـــ پتہ نہیں ان میں کون کون میرے حصے میں آنے والی ہیں ـــ وہ چلتے چلتے گھڑی بھر کے لیے رک گیا اور غور سے دیکھتا ہوا اپنی پسندیدہ بطخیں ذہن میں محفوظ کرنے لگا۔

کافی سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد جب انھوں نے اپنی رقم پرس سے نکالی تو اس میں جملہ ۱۸۰ روپے تھے ـــ چار درجن بطخیں خرید لی جائیں، تو ایک سو چالیس روپے صرف ہوتے ہیں اور صرف تریالیس روپے باقی رہتے ہیں ـــ

ویسے گھر کی ضروریات کے لیے انھیں فی الوقت کچھ خریدنا نہ تھا البتہ اس کی بیوی کے لیے روزمرہ استعمال کی دو تین ساڑیوں اور بلوز کی شدید ضرورت تھی جس کے لیے کم از کم ساٹھ پینسٹھ روپے درکار تھے ـــ آخرش یہ طے پایا کہ دو ساڑیاں اور دو بلوز چالیس روپے کے اندر تیار کر لیے جائیں اور تین درجن بطخیں خرید لی جائیں۔ بطخوں کی جوار کے لیے تین چار روپے علیحدہ نکالنے ہوں گے اور اس طرح تیس بتیس روپے بچ رہیں گے جو دوسری اتفاقی ضروریات کے لیے کافی ہیں ـــ مہینہ بھر کے غلے کا صرفہ اس رقم کے علاوہ ان کے پاس محفوظ تھا۔

اس کے والد ایک بڑی جاگیر کے عہدیدار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے کو کوئی اچھی سی خدمت مل جائے جس سے وہ کھا پی کر زندگی بسر کر سکے۔

لیکن دفتر دفتر کی خاک چھاننے پر بھی ان کے بیٹے کو کوئی ایسی ویسی نوکری بھی

اُجلی پرچھائیاں

نہ مل سکی۔ آخرش پندرہ روپے ماہانہ کا ایک مکان کرائے پر لے کر اس کے والدین نے اپنی بہو بیٹے کو بلدہ ہی میں ٹھہرا دیا کہ وقتاً فوقتاً وہ تلاشِ روزگار میں مصروف رہ سکے کیوں کہ ان کا اپنا رہنا سہنا تو زیادہ تر گاؤں ہی پر رہتا تھا۔

گذر بسر کے لیے وہ اس کے اس حد تک کفیل ہو سکتے تھے کہ وہ اور اس کی بیوی خالی پیٹ نہ رہ سکیں ۔ سو انھوں نے اپنی طرف سے دریغ نہ کیا ۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے ۔ پیٹ بھر کر بچے تھے انھیں اور پھر ایک نہیں دو دو بیویاں ۔ تین کنبوں کی پرورش کی ذمہ داریاں ایک جان پر تھیں ۔ یہی سوچ سوچ کر اس کا جی مسوستا رہتا کہ کسی طرح اپنا بوجھ آپ اٹھا لینے کے قابل بن جائے اور پھر ایک بات اور بھی تھی ۔ اس کی ماں چاہتی تھیں کہ ان کی اپنی بہن کی لڑکی بہو بنا کر لائی جائے سو وہ نہ ہو سکا تھا ۔

والدین کی پہلی ہی خواہش کو رد کر دینے کے بعد اس کا یہ احساس اور شدید ہو گیا تھا کہ اپنے پیر پر کھڑا ہو جائے ۔ اپنا بوجھ آپ اٹھا لے ۔ احساسات کی شدت سے اس کے دماغ میں ایک گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی ۔ اور جب یہ احساس شدید تر ہو جاتا تو اس کو ایسا معلوم ہوتا جیسے سارے مخالفین اس کی کمزوریوں پر ہنس رہے ہوں گے اور اس کی یہ کنگالی خاندان بھر میں موضوعِ بحث بنی ہوئی ہوگی۔

شہر سے دور اس چھوٹی سی بستی میں آکر وہ اس لیے بھی مطمئن تھا کہ نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ چھوٹا موٹا دھندہ ہی کر دیکھے گا۔ ویسے ایک اچھے خاندان کا فرد ہونے کے باوجود اس نے کسی معمولی سے معمولی کام میں بھی شرم محسوس نہیں کی۔ بس اس کی ایک ہی خواہش تھی ، ایک ہی آرزو تھی اور وہ یہ کہ خود کچھ کرے ، خود

اُجلی پرچھائیاں

کو اس سلیقے سے سجایا ہے کہ محلہ کا کوئی آدمی اپنے پیسے بچا کر سامنے سے نہیں گذر سکتا۔

دوسرے دن سے اس نے محسوس کیا کہ اس کے لکڑی کے ڈبے میں محفوظ ہونے والے دو دو پیسے گرین ہوٹل کے خوبصورت سے کیش بکس میں جمع ہو رہے تھے۔

شام کو اس نے اپنی منگیتر سے کہا۔ میرے خیال میں کل قمیص اور کوٹ کا کپڑا مجھے نہیں خریدنا چاہیے۔ پتہ نہیں ہمیں اس سے اہم کوئی کام پڑ جائے کیوں کہ دو تین روز سے "گراہک" بالکل بیٹھ گیا ہے۔"

پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی منگیتر نے اس کو دیکھتے ہوئے جواب دیا یکایک ایسا کیوں ہو گیا ہو گا ــــ مگر آپ یقین کیجیے ــ چونے میں دہی میں نے اپنے ہاتھ سے ملایا تھا ــ کتھے میں دودھ، لونگ کے پھول اور الائچی کے چھلکوں کے سوا اب کے تو سالم الائچیاں بھی ملائی گئی تھیں ــــ اور جوش دے کر میں نے ہی اس کو چھانا تھا اور "مدی" تو بالکل پھینک دی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم سچ کہتی ہو۔ پان کے مزے کی بات نہیں ہے گرین ہوٹل میں ایک نیا پنواڑی آیا ہے جس نے پان کی لذتیں بھی دکان کے حسن میں لگا دی ہیں ــــ شو کیس کیا ہے ایک بولتا ہوا جادو ہے۔ پہلے جادو اثر کرتا ہے بعد میں گاہک پان چباتے ہیں اور ہمارے یہاں بات بالکل الٹی ہے ــــ گاہک پہلے پان چباتے ہیں تب کہیں کتھا اور چونا اثر کرتے ہیں لیکن چوں کہ پان چبانے سے پہلے ہی خوبصورت الماریاں گاہکوں کو چبا ڈالتی ہیں اس لیے ہم گھاٹے میں ہیں ــــ اور اس کی منگیتر کچھ سوچتے ہوئے داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی تھی۔

چوتھے دن صبح صبح وہ پورے ایک سو آٹھ روپے لے کر پاشو میاں کے پاس پہنچا

اُجلی پرچھائیاں

تو وہ ٹین کے سائبان کے سامنے کھڑے جوا ز لگوا رہے تھے۔ ساری کی ساری بطخیں سائبان میں بند قیں قیں قیں شور مچا رہی تھیں۔

اس کو دیکھ کر پاشو میاں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "تو پھر آپ آ گئے صاحب"۔ اور اس نے بغیر کسی تامل کے روپے ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا بہت پیاری پیاری اور خوبصورت بطخیں چُن دیجیے سیٹھ صاحب۔ سب کی سب بھک سفید ہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔

پاشو میاں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سب کی سب سفید بطخیں لے کر کیا کیجیے گا۔ مختلف رنگ کی ملیں گی لیکن اچھی اچھی چن دوں گا۔"

اور انھوں نے پکارا۔ مُنیال او مُنیال۔ ذرا یہ تالا کھولنا اور منیال نے پھٹ سے دروازہ کھولا اور غیں قیں کی آوازوں سے پوری فضا گونج گئی۔ اور چو کٹ پھلانگتی، گرتی سنبھلتی بے شمار بطخیں دیکھتے کے دیکھتے کھلے میدان میں جمع ہو گئیں جیسے وہ بہت بڑا لیڈر ہے اور سب کی سب اس کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہیں۔

پاشو میاں نے منیال سے کہا۔ "اس کا پیٹ بہت جھک گیا ہے۔ ذرا اس کو پکڑنا تو، او ر منیال نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ایک بطخ کو دبوچ لیا۔ قیں قینق قینق۔ سفید رنگ، پشت پر ہلکے سیاہ بے ترتیب دھبے۔ بہت حسین پیاری پیاری۔ وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

ہاتھ بڑھا کر پاشو میاں نے منیال سے لیتے ہوئے دوسری طرف اشارہ کیا۔ قینق۔ قیں قیں قیں قیں۔ بالکل سفید، دُھنکی ہوئی روئی کی طرح دھان پان۔ پیٹ بیٹ میں اٹا ہوا، جس میں بہت سے انڈے محفوظ ہوں گے۔

ان دونوں کو دبوچ لے شیرو ــــ قینوق، قینوق ــــ نرخروں پر منیال کی گرفت سے آوازیں حلق میں گھٹ گئی تھیں ــــ پیٹھ پر سُرمئی رنگ کا ایک بڑا سا دھبہ اور آدھی سے زیادہ چونچ سیاہ ــــ پکھووں پر کالے کالے دھبے اور پھر سفید ــــ پاؤں سکیڑے بالکل اس طرح لٹک رہی تھی جیسے بیا کے گھونسلے اُلٹے لٹک رہے ہوں ــــ کافی دیر تک یہ پکڑ دھکڑ چلتی رہی ــــ کسی کی گردن ــــ کسی کے پکھوے کسی کی ٹانگیں ــــ پاشو میاں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی پسند کی نشان دہی کرتا رہا۔ لیکن پاشو میاں نے بعضوں کو پکڑوا دیا۔ بعضوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ نر ہے اور یہ انڈوں والا جانور نہیں ــــ پاشو میاں تجربہ کار تھا ــــ اس نے عقیدتاً اس کی بات مان لی۔

گرفتار کی ہوئی بطخیں جیل میں ٹھونس دی گئیں اور ٹین کے سائبان کا دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔ ان میں تیس مادہ ہیں اور چھ نر ــــ

ایک برقی رو اس کے دماغ میں چکر کاٹ کر نکل گئی ــــ واقعی ہم نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا ــــ اگر وہ درجن بھر نر ہی دے دیتا تو ــــ لیکن وہ اپنی ناتجربہ کاری کو چھپاتے ہوئے بے تکلف بول اٹھا ــــ چھ نر تو بہت ہیں پاشو سیٹھ صرف چار ہی نر رہنے دیجئے اور بقیہ سب مادائیں۔

لیکن پاشو سیٹھ نے تجارت کے اصول اس کے سامنے رکھ دیئے ــــ ہر درجن میں دو نر ضرور ہوتے ہیں ــــ عام بات ہے۔ آپ اطمینان کر لیجئے اور پھر صاحب آپ کے اور ہمارے لیے چار نکاح جائز ہیں۔ ان کو ہم سے ایک ہی تو زیادہ ہے ــــ کیا آپ ہر نر کو پانچ دو مادیوں کی اجازت بھی نہ دیں گے ــــ

اُجلی پرچھائیاں

لیکن چھوٹتے ہی اس نے جواب دیا پاشو سیٹھ آپ سمجھے نہیں ـــــ میں تو صرف ایک نر کو پوری ۳۵ مادہ اؤں کی اجازت دینے کے لیے تیار ہوں۔

پاشو میاں بات سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے مجھ سے چوک ہوئی۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ پانچ مادہ اؤں سے زیادہ کسی نر کو اجازت نہ دیجئے اور انھوں نے بڑے رازدارانہ انداز سے کہا ـــــ ورنہ انڈے کیسے دیں گی مادیاں۔ ایک نر تو مر جائے گا بے چارہ ـــــ مستی کے انڈوں سے بچے تو نکلنے سے رہے۔

بات ختم کرتے ہی پاشو سیٹھ نے منیال اور صمدانی سے اس کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ٹانگیں باندھ کر، ٹوکروں میں صاحب کی بطخیں سامنے والے مکان میں پہنچا دو۔

بطخیں ٹوکروں میں رکھ دی گئیں تو پاشو میاں نے اس کو رخصت کرتے ہوئے کہا دو تین روز گھر ہی میں بند رکھیے ـــــ روزانہ دو وقت چار سیر جوار بہت کافی ہے دو تین روز میں گھر سے مانوس ہو جائیں گی تو ٹانگوں کے نچلے پردوں پر نشان لگا کر ندی کی سیر کرا لیجیے۔

پنجوں کے پردوں پر نشان لگانے کا گُر کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو پاشو میاں نے ٹوکرے سے ایک بطخ اٹھا لی اور دائیں پنجے کی انگلیوں کے درمیانی مہین پردے کو کچھ سوچ کر نہایت بے دردی سے چیر دیا اور خود اس کی اپنی انگلیاں بط کے خون سے بھیگ گئیں ـــــ دم سادھ کر بیٹھی ہوئی ریشم کی ننھی منی جان قیں قیں کرتی اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے لگی۔

قیں قیں کی آوازوں کو ساتھ لیے جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی آنے والے

ان مہمانوں کے سواگت کے لیے دروازے ہی میں کھڑی تھی جن کا مسلسل تین روز سے انتظار تھا ــ سروں پر دھرے ہوئے ٹوکروں کو دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گیئں اور اس کی آنکھیں ان نئے ساتھیوں کے دیدار کے لیے چمکنے لگیں ــ اندر پہنچ کر صمدانی اور منیال نے ٹوکرے زمین پر بے دردی سے اوندھا دیئے اور قیں قیں کی آواز نے گھر سر پر اٹھا لیا ــ

مسٹر ٹامی جو سپوٹے کے درخت کی چھاؤں میں ٹانگیں پھیلائے آرام سے سو رہے تھے اس اچانک ہنگامے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور قیں قیں میں اپنی بے سُری بھوں بھوں کا اضافہ کرتے ہوئے لپکے۔ صمدانی اور منیال کی اجنبی شخصیتوں نے ان کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرلی، اور وہ شور مچاتی ہوئی بطخوں کو نظر انداز کر کے انھیں دونوں پر غصّہ اتارنے لگے۔ جیسے وہ جانتے تھے کہ ان ہنگاموں کی جڑ یہی دو شخصیتیں ہیں۔

منیال اور صمدانی اپنا اپنا انعام لے کر چلے گئے تو اس کی بیوی نے بہت ہی چاؤ سے پچکارتے ہوئے ان گدمڈ بطخوں کو الگ کر دیا اور بندھی ہوئی ٹانگوں کی سُتلی کو کاٹ کاٹ کر انھیں صحن میں چھوڑتی گئی۔

قیں قیں قیں قیں ــ گویا کہہ رہی ہوں ــ تم بہت اچھی ہو ــ تم نے ہمارے پاؤں کی زنجیریں کاٹ دی ہیں ــ قیں قیں قیں ــ ہمارے بیٹوں صمدانی اور منیال نے غالباً ہمیں تمھارے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے ــ قیں قیں ــ لیکن ہم تم سے خفا نہیں ہیں ــــ اور مسٹر ٹامی اس ختم نہ ہونے والی قیں قیں سے جھنجلا کر ان پر لپکے۔

اُجلی پرچھائیاں

اپنے پیروں کو زور زور سے ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی یہ مخملی گول مول پریاں اپنے بھاری بھرکم بدن کو زمین سے بہت اونچا اٹھا لینے کی کوشش میں خود ٹامی ہی پر گر پڑیں۔ تو بوا نے ہوت ہات کہہ کے ٹامی کو بھگا دیا اور قیں قیں کا شور پھر ایک بار پورے زور شور سے بلند ہوا اور ٹامی کی درندگی کے خلاف شاندار مظاہرہ کیا گیا۔

اس کی بیوی ٹامی کی اس جسارت کو برداشت نہ کر سکی اور مسٹر ٹامی کھمبے سے باندھ دیئے گئے اور نہایت اطمینان سے درختوں کے تنوں میں بھیگی ہوئی نالیوں میں چیخ چیخ کر یہ مخملی پوٹلیاں سارے باغیچے میں لڑکھنے لگیں۔

اس کی بیوی کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر اس کی مسرتیں دوبالا ہو گئیں ——

سویرے میں جوار لیے آؤ آؤ کے نغمے بکھیرتی جب وہ شاداں و فرحاں صحن میں جوار کی بارش کرنے لگی تو قیں قیں کرتی ان ساری کی ساری مخملی پوٹلیوں نے کچھ ذرا سا پس و پیش کرنے کے بعد اس کو بے تکلف گھیر لیا اور وہ گلاب توڑ کر ٹوکری میں رکھتا ہوا اس منظر کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔

پانچویں دن صبح کو معمول سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ رضائی پھینک کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا — کہاں چلے آپ، اور تکیے کے نیچے سے سوئٹر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا — سوئٹر پہنتے ہوئے اس نے پوچھا۔

تم جاگ گئیں آخر ——

ابھی ابھی بطخوں کو دیکھ کر آئی ہوں — انڈا تو ایک بھی دکھائی نہ دیا — اس کے ساتھ ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جالی دار محل سرا کا دروازہ کھول دیا گیا تو چوزنیں جالی کے باہر نکال کر قیں قیں

اُجلی پرچھائیاں

کرتی ہوئی بطخوں کی قیادت میں سب کی سب نئی نئی دلہنوں کی طرح شرماتیں لجاتیں سہمی سہمی باہر نکل آئیں۔

قیں قیں قیں۔ جیسے انڈے نہ دینے کے لیے معافی مانگ رہی ہوں۔

اس کی بیوی نے آج وقت مقررہ سے پہلے ہی درختوں کو پانی دینا اس لیے مناسب سمجھا کہ کل دن بھر اس کی بطخوں نے چوں کہ ندی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی اس لیے کم از کم بہتی نالیوں ہی میں ان کے اشنان کا انتظام ہو سکے۔

کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں چھپے ہوئے حوض کا پانی چھوڑ کر اس نے مخمل کی پوٹلیوں کو اس طرف ہانک دیا اور خود گلاب توڑنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی رہی ــــ

"آج پھول والے کی دکان سے واپسی میں ــــ میں ذرا پاشومیاں کی طرف بھی ہو آتا ہوں تاکہ اس کے مشورے سے کسی نہ کسی طرح اپنی بطخوں کو ندی بھیجنے کا انتظام ہو سکے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ پانی ان کے لیے ضروری ہے ــــ دیکھیے نا اب کس قدر چہل میں ہیں ــــ" اس کی بیوی نے کیلے کے درختوں کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا اور اس نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے دو تین بڑے بڑے گلاب اس کے بالوں میں اڑس دیئے۔

قیں قیں کرتی نرم نرم ننھی منّی بطخوں کے بہت پاس کھڑی ہوئی اس کی بیوی بورے پر جوار بکھیر رہی تھی ــــ وہ انڈوں پر تاریخ درج کر کے انھیں ایک چھوٹی سی ٹوکری میں رکھ چکا تو اس کی بیوی نے اس سے کہا ــــ پاشومیاں نے جو بات کہی ہے اس میں صداقت ضرور ہوگی ــــ نیا مقام ہو تو واقعی نامانوس ہونے سے

اُجلی پرچھائیاں

جانور خائف ہو جاتا ہے ـــ ہو سکتا ہے کہ کل دو کی بجائے چھ انڈے نکل جائیں۔

مسٹر ٹامی دم ہلاتا بطخوں کے قریب سے گذرنے لگا تب بھی وہ اطمینان سے جوار کھاتی رہیں۔ نہ قیں قیں کا شور بلند ہوا اور نہ خود ٹامی نے بھوں بھوں کرنے کی زحمت گوارہ کی ـــ کیوں کہ ان میں سمجھوتہ ہو چکا تھا اور مسٹر ٹامی سمجھ چکے تھے کہ اب یہ بھی برابر کی حصہ دار ہیں۔

ساتویں دن اس کی بیوی کا اندازہ صحیح نکلا ـــ محل سرا کی شہزادیاں باہر نکل کر چہل قدمی کرنے لگیں ـــ اس نے جالی دار محل سرا میں داخل ہو کر پانچ انڈے چن لیے اور ان کو لگی ہوئی بیٹ احتیاط سے دھونے کی تاکید کرتے ہوئے بوا کو دے دیے۔

دھو دھلا کر پاک صاف انڈوں کو بوا نے اپنے پلّو سے خشک کر دیا تو وہ ان پر بدستور تاریخ ڈال کر ٹوکری میں رکھ آیا ـــ

اس کی بیوی حوض کی منڈیر پر کھڑی گلاب کی اونچی ٹہنی کا آخری پھول توڑ چکی تو اس کے گالوں کو پھولوں سے سہلا کر اس نے اس کے بالوں میں گلاب سجا دیئے ـــ ہلکی سردیوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی ـــ کل اس نے چھ آنے کے بجائے آٹھ آنے میں پھول بیچ لیے تھے اور آج آنہ دو آنے زیادہ ہی مل جانے کی امید تھی ـــ سائیکل کے ہینڈل پر ٹپّی ٹانگ کر وہ چل پڑا تو نظروں سے اوجھل ہونے تک اس کی بیوی اس کو کھڑکی میں سے دیکھتی رہی۔

شام کو جب وہ سب کی سب اپنے جالی دار محل میں بیٹھ کر گپ شپ لڑا رہی تھیں تو وہ بلیڈ ہاتھ میں لیے آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر گھس گیا اس ناگہانی آفت سے محفل میں ایک ہڑبونگ مچ گئی لیکن اس نے جی کڑا کر کے ان میں

اُجلی پرچھائیاں

سے ایک کو دبوچ لیا اور داہنے پنجے کے درمیانی ہتھیلی سے پردے کو بلیڈ سے تراش دیا۔ ایک کے بعد دوسری کی باری آئی اور دوسری کے بعد تیسری کی اور یہی عمل کوئی پندرہ بیس منٹ تک جاری رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کا ہاتھ لہولہان ہو گیا تھا۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ کل جب وہ انھیں ندی میں اتارے گا تو سب کی سب اسے معاف کر دیں گی۔

اس دن سے روزانہ انڈوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا —— آٹھویں دن سات —— نویں دن بارہ —— اور دسویں دن ایک دم اٹھارہ لیکن گیارھویں دن یہ تعداد یکایک گھٹ کر صرف تین ہو گئی۔

گیارھویں دن صرف تین انڈے نکلے تو اس کی بیوی نے اس بات پر یقین نہ کیا اور بوا سے بھاجی ترکاری کا حساب لینا چھوڑ کر وہ رسوئی گھر سے نکل آئی۔ اس کو تیز تیز اس طرف آتا ہوا دیکھ کر وہ ہنس پڑا —— اس کی ہنسی کا غلط مفہوم لیتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا "مجھ کو یقین تھا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں —— لیکن بہت جلد وہ جان گئی کہ وہ صرف اس لیے ہنس رہا تھا کہ وہ اُس کی بات کو مذاق سمجھ رہی تھی۔

حوض پر بیٹھا وہ انڈے دھونے لگا تو اس کی بیوی نے حوض کا پانی چھوڑ دیا اور دیکھتے کے دیکھتے ایک روپہلی ناگن ایک نالی میں بل کھانے لگی —— اور قیں قیں کرتی ساری بطخیں اس روپہلی ناگن پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کی بیوی نے اس کی دل کی کیفیات سے ناآشنا اپنے ہی حال میں مگن چنچل چنچل بطخوں کو رحم طلب نظروں سے کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم سب کی سب مسلسل تین روز سے ندی کی سیر کر رہی ہو اور وہ دن دن بھر دھوپ میں بیٹھے تمھاری رکھوالی کرتے ہیں اور میں یہاں بات

اُجلی پرچھائیاں

کرنے تک کو ترس جاتی ہوں ـــــ اتنے دن کے بعد کل جب شدید بارش ہوئی تو وہ سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے گھر آئے تھے، لیکن آج تم نے انڈے کم کر دیئے۔

شام کو جب وہ اپنی قیں قیں قیں قیں کا کورس گاتی ہوئی فوج لے کر گھر پہنچا تو زینو بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔ زینو بھائی کی غیر متوقع آمد پر وہ آداب وسلام کے اخلاقی فرائض تک بھول بیٹھی اور بھابی اور بچوں کی بجائے جھٹ سے اس نے زینو بھائی سے اپنی بطخوں سے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑے اور بہت ہی مشفقانہ انداز سے کہنے لگے "تم میاں بیوی نے یہ بہت اچھا کام کیا۔ یہ جانور بڑا منفعت بخش ہے۔ مجھے ان دو سالوں میں زراعت سے زیادہ اسی دھندے میں فائدہ ہوا۔ اب تو اپنے گاؤں کے قریبی تعلقوں اور ضلع میں بھی میں ہی انڈے سپلائی کرتا ہوں اور پھر یہاں ندی کی وجہ سے تمھیں تو آسانیاں ہیں ـــ باتیں کرتے کرتے وہ سامنے رکھی ہوئی بکٹ میں سے آستین چڑھا کر بھیگی ہوئی جوار نکال نکال کر بچھے ہوئے بورے پر پھینکنے لگے تو قیں قیں کرتی منتظر بطخیں جوار پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ چپکے سے ان کے پاس بیٹھ گئے اور پھر پکڑ پکڑ کر ایک ایک کو دیکھنے لگے۔ پنجوں کے نیچے ابھری ہوئی چمڑے کی گٹھلیوں کو دبا دبا کر وہ نہایت غور سے دیکھتے رہے اور آہستہ آہستہ ان کے چہرے کی بشاشت غائب ہوتی گئی۔

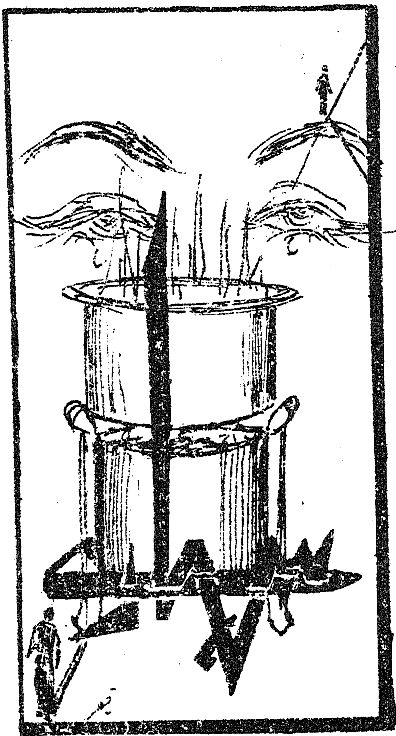
قیں قیں کی آوازوں کے سوا کسی نے کچھ دیر بات تک نہ کی ـــــ بہت ہی دبی ہوئی آواز میں زینو بھائی نے کہا چار چھ کو چھوڑ کر سب کی سب بوڑھی ہیں ـــــ طویل وقفے سے ایک دو جھول میں کچھ انڈے دے دیں گی ـــ کس سے خریدی ہیں تم نے یہ بطخیں ـــ بیچنے والا بڑا گھاگھ معلوم ہوتا ہے ـــ بے ایمانی کی حد کر دی لچے نے ـــ اور

اُجلی پرچھائیاں

اس کی بیوی سوچنے لگی کہ اپنی دل کی دنیا کو اس نے جس دھرتی پر رکھا تھا اس دھرتی کے نیچے بے شمار زلزلے چھپے ہوئے ہیں اور جن کو کسی انسان ہی نے چھپا رکھا ہے۔

صبح کو وہ اٹھے تو ایک انڈا بھی ہاتھ نہ لگا ـــــ پھول توڑتے ہوئے اس کی بیوی نے کہا ـــــ "کل دن میں آپ کے ندی پر جانے کے بعد مکان دار صاحب آئے تھے کہہ رہے تھے کہ دو چار دن میں آکر وہ کیلے کی پھنیاں لے جائیں گے ـ البتہ آئندہ سال آدھا میوہ ان کا ہوگا اور آدھا اپنا ـــــــ

ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے حسب معمول تین چار بڑے بڑے گلاب اپنی بیوی کے بالوں میں سجا دیئے تو اس کی بیوی نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انتہائی لجاجت سے کہا ـــــ ان کو بھی بیچ دیجیے نا ـــــ لیکن پھر کچھ سوچ کر ندامت سے اس نے گردن جھکا لی ـــــ اور وہ نظریں نیچی کیے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔



جب وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی تو چاولوں کی خوشبو نے پہلے اس کا سواگت کیا
بنسی داس ہری داس اگروال رات بھر اپنی بے ہنگم توند اس کو دکھاتا رہا۔ لیکن بیگم نو عمر ہونے
، باوجود مشّاق تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ بڑی توند والوں کو کس طرح رجھایا جا سکتا ہے
بیگم نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس لیے کہ سیٹھ بنسی داس، ہری داس اگروال شہر کا
ب سے بڑا غلّے اور گھی کا بیوپاری تھا پہلی بار جب بیگم نے سیٹھ کے ساتھ رات بسر کی تھی
ہ اس کو اتنا خوش نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ وہ اس بات سے واقف تھی کہ سیٹھ خوش ہو جائے تو وارے
ے ہو جائیں گے لیکن باوجود کوشش کے وہ سیٹھ پر التفات نہ کر سکی سیٹھ بنسی داس ہری داس جتنا جتنا
ے قریب تر ہو جاتا تو بیگم کو ابکائیاں سی آنے لگتیں۔ مرد کے جسم کی حدت سے
کی بو سے، اس کے سانسوں کی گرمی سے بیگم خوب واقف تھی لیکن سیٹھ بنسی داس
، داس اگروال سب سے مختلف تھا یا بیگم نے کچھ ایسا محسوس کیا تھا کہ وہ سب سے
ف ہے۔ نہ اس کی سانسوں میں وہ حدت تھی جو عورت کے جسم کو پگھلا سکے، نہ بدن
س میں وہ گرمی۔ ننگا ہو کر وہ بیگم کے سامنے کھڑا ہو گیا تو بیگم نے نفرت سے منہ پھیر لیا

سہارے
رات بھر میں صرف ایک بار بیگم بمشکل اس سے قریب ہو سکی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ رات بھر کی قیمت چکانی تھی۔ پو پھٹنے سے پہلے ہی سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے کہا:۔

"بیگم تم بہت سندر ہو۔ ہمارا من نہیں بھرا بیگم۔ بیگم تم ہم سے پریم کرو نا۔ ہم تمھیں بہت نواجیں گے۔"

اور ایک نہیں دو نہیں پانچ روپے کے ایک نئے نوٹ سے سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال نے بیگم کو نوازا۔ بخشش کے طور پر رقم بیگم کے لیے کچھ معمولی نہ تھی لیکن وہ صرف اتنا سوچ سکی کہ خوش نہ کرنے پر بھی سیٹھ جی نے پانچ روپے دیے ہیں لیکن اب بھی سیٹھ سے اس کی نفرت کم نہ ہوئی۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا تو بستر پر پڑ کر بیگم نے آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کچھوا، کبھی کیکڑا، کبھی لوہار کی دھونکنی اس کے تصوّر میں گھومنے لگی۔ اس وقت اس کا دماغ خالی خالی سا تھا۔ اس خالی خالی دماغ میں کہیں سے ایک پاؤں لگی پکھال گھس آئی۔ پھر ہانپتا ہوا کچھوا، کانپتا ہوا کیکڑا، لمبی سانسیں بھرتی ہوئی لوہار کی دھونکنی پاؤں لگی پکھال سب گڈمڈ ہو جاتے اور ننگا سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال بیگم کو رجھاتا۔ "بیگم ہم تم کو بہت نواجیں گے۔"

سیٹھ کی جیب سے بخشش کے طور پر پانچ روپوں کا نکل جانا بجائے خود ایک معجزہ تھا۔ بیگم کو یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی اس کو ایک رنگریز سیٹھ سے سابقہ پڑا تھا۔ رزیڈنسی میں ان کی کوٹھیاں تھیں لیکن چلتے وقت اس نے چوّنی بیگم کے ہاتھ پر رکھی تھی تو بیگم نے لوٹاتے ہوئے کہا تھا کہ اس چوّنی کو شہر کے سب سے زیادہ بخیل آدمی کو دے دو۔ اور سیٹھ نے چوّنی اپنے ہی جیب میں محفوظ کر لی تھی۔ جب سیٹھ دروازے سے باہر نکلا تو

سہارے

بدر بھائی نے اپنا انعام طلب کیا۔ سیٹھ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ بیگم نے اس کی جیب خالی کر لی ہے۔ بدر بھائی دروازے میں داخل ہوا تو بیگم نے کہا کہ بہت ڈینگیں مار رہے تھے بدر بھائی۔ بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں۔ دل کا غنی معلوم ہوتا ہے۔ انعام اکرام تمھیں اچھا ہی ملا ہوگا۔ بدر بھائی نے رنگریز کرماں کی گالی دی تھی لیکن گالی زبان سے ادا ہوتے ہوتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ بیگم سمجھ نہ سکی تھی کہ بدر بھائی جو سارے ملک کی سیاست پر ماں کی گالی شامل کر کے تبصرہ کر دیتا ہے آج اتنا دل گیر کیوں ہے۔ بیگم نے صرف اتنا پوچھا۔ کیا بات ہے بدر بھائی۔ لیکن بدر بھائی نے کچھ نہ کہا، جب بیگم نے بہت اصرار کیا تو وہ مسکرانے لگا اور اس انداز سے بات کہہ دی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ کہنے لگا "کل صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس سیٹھ کو لے آیا تھا۔ سالا کہنے لگا ادھر دہلیز میں پاؤں دھرا نہیں کہ انعام و اکرام کی بات شروع کر دی۔ اب پوچھتا ہوں تو صاف جُل دے گیا حرامی۔"

لیکن آج رات بیگم نے سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال کو بہت خوش کیا تھا۔ سیٹھ جا چکا تو وہ پچھلی باتیں سوچتی ہوئی بستر پر انگڑائیاں لیتی رہی۔ غنودگی کے عالم میں کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیدار ہو کر کروٹیں لیتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ سوچنے لگتی کہ نیند اسے پھر دبوچ لیتی۔

جاگتے رہنے اور سوتے رہنے کی یہ درمیانی کیفیت بس ختم ہی ہوئی تھی کہ خوشبودار چاولوں کے بھبکے نے بیگم کو مسحور کر دیا۔ بیگم سمجھ گئی کہ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال کے بھیجے ہوئے چاول اور گئی بوڑھی شہراتن باندی بڑی فراغ دلی اور بے دردی سے صرف کر رہی ہے۔ یہ چاول اس کے لیے سیٹھ نے تحفے میں بھیجے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ انھیں بہت حفاظت سے اپنے چھوٹے بھائی بہن تک پہنچا دے۔ جو ایک

غریب پرور حاجی صاحب کے پاس رو کھے سوکھے ٹکڑوں پر گذر بسر کر رہے ہیں لیکن سہارے
کھوسٹ شبراتن تو جیسے اس کی مالکن بنی بیٹھی تھی۔ بیگم کی آنکھوں میں آنسو امنڈنے لگے۔
چادر کو ایک طرف پھینک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کپڑے درست کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ شبراتن بائی سامنے دالان میں سانچے کوئلوں کی دہکتی ہوئی انگیٹھی کے پاس بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ بیگم نے انگیٹھی میں دہکتے ہوئے سانچے کوئلوں کو دیکھا تو اس کو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ کوئلے اس کے سینے کے اندر دہک رہے ہیں اور اس کا سینہ بھی ایک انگیٹھی ہے، جس میں اس کے جذبات اس کی خواہشیں جل جل کر دم توڑ رہی ہیں۔ بیگم باہر نکلی تو اس کی سہیلی خورشید نے اس کو چھیڑا۔

لو جی سُہانی اب بیدار ہوئی ہیں۔ رات بھر سیٹھ جی کا توند سہلا سہلا کر تھک گئی ہوں گی بے چاری۔"

بیگم نے بھویں چڑھا کر کن انکھیوں سے خورشید کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ آج مہارانی کا پارہ صبح صبح ہی چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے وہ چپکے سے کھسک گئی۔

بیت الخلاء سے باہر آ کر دروازہ بھیڑتے ہوئے وادھا نے کہا "رات ایک کلموہے سے سابقہ پڑتے پڑتے رہ گیا۔ یوں ناک بھوں چڑھا رہا تھا جیسے حوروں کے ساتھ ہی سو سکتا ہے حرامی۔ میں نے آنکھ ماری تو کہنے لگا اتنی بے تکلفی پسند نہیں مجھے۔ جیسے سور کی اولاد مجھ سے نکاح کرنے ہی آیا تھا۔ میں نے کہہ دیا سرکار میں آنکھ ماروں یا ٹانگ ماروں اپنی قیمت وصول کر لیجیے اور بس پوچھنے لگا وہ بیگم کہاں ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ تجھ پر فریفتہ ہیں صاحبزادے۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں سب بیگمیں ہی ہیں "وہ" نام کی کوئی بیگم یہاں نہیں رہتی ـــــ کہنے لگا جی میری بیگم یہیں رہتی ہے۔ میں بھی جلی ہوئی تو تھی ہی

کہہ دیا۔ حضور آج آپ کی بیگم بنسی داس ہری داس اگروال کی گود گرم کر رہی ہیں۔ یقین نہ ہو تو اوپر جا کر دیکھ لیجیے۔ بے چارہ چپ چاپ لوٹ گیا۔ کوئی سچا عاشق معلوم ہوتا ہے تیرا۔"

بیگم کے سینے میں دہکتے ہوئے سانپ کوئلوں کو رادھا نے جیسے ہوا دی۔ کھوسٹ شبراتن انگیٹھی پر سُلپی جھل رہی تھی۔ چھوٹتے ہی بیگم نے کہا کہ جھوٹے ہوں یا سچے ہوں عاشق بہرحال میرے ہی آتے ہیں ــــ تجھے پوچھتا ہی کون ہے۔ کماتی میں ہوں اور کھاتے تم سب ہو۔ میرا جسم تو بس او کھلی ہے۔ دن رات موسلوں سے کوٹا پیٹا جاتا ہے ــــ دونوں ہاتھ جوڑتی ہوں، تھو ہے ان ہاتھوں پر کہ انھیں ہاتھوں سے سمیٹوں لیکن یہی ہاتھ پھر خالی کے خالی رہیں۔ سوچتی ہوں میں بھی اپنا ٹھکانہ بدل دوں۔

"کیا کرے گی ٹھکانہ بدل کر اور پھر جائے گی بھی کہاں۔ کیا لوگوں نے دروازے صرف اسی لیے لگا رکھے ہیں کہ ایک دن تو ان میں داخل ہو گی۔" شبراتن نے شہ دی۔

"آخر کملا، شانتا اور رشیدہ بھی تو اسی گھر سے کماتے ہیں کمیشن کٹوا دیا اور اپنے اِم گرہ ہیں۔ میں بھی کمیشن ہی پر کاروبار کیوں نہ کرلوں۔ ابھی دھوپ ہے جو لوگ بدن سینکنے کے لیے آ بھی جاتے ہیں۔ یہ دھوپ ڈھلنے لگے گی تو بھیک مانگتی پھروں گی۔ تم لوگوں کا لیجہ تب ہی ٹھنڈا ہوگا۔ سٹھانی ہوں تو میں ہوں، عاشق آتے ہیں تو میرے ہی آتے ہیں اُن دام ہی میری گرہ میں نہیں رہتے۔ یہ سب کچھ تو تھا ہی۔ اب جو مجھے "بخشش" ملتی ہے اس پر بھی لوگ ہاتھ صاف کرتے ہیں اور میں آنکھیں بند کر کے ہر تھوخیرے کے پاس سوتی پھرتی ہوں۔"

شبراتن بائی گھاگھ تھیں۔ سمجھ گئیں کہ جو تیر رادھا اور خورشید پر برس رہے ہیں

وہ ہر پھر کر انھیں کے سینے پر لگ رہے ہیں۔ اس سے انکار تو شبراتن بائی نہ کر سکتی تھیں سہارے
کہ لونڈیا پر مرنے والوں کا ایک انبوہ ہے۔ عمر کے ساتھ اللہ صاحب نے صورت شکل بھی
دی ہے مزاج کی تندی ہے سو نخروں کے پیچھے اس طرح چھپ جاتی ہے کہ آنے والے
اُلّو کے پٹھے ہی ہی کرتے اور ہاتھ جوڑتے رہتے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن پہلے
ہی داؤں نہ لگایا تو لونڈیا ہاتھ سے نکل ہی تو جائے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ بازار
میں لینے کے لیے کلموہے مسٹنڈوں کا میلہ سا لگ جائے گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود
شبراتن بائی نے ہتیار ڈال دینا مصلحتاً نامناسب سمجھا۔

"کہنے لگی۔ بیگم یہ مزاج کی تانا شاہی چھوڑ بھی چکو اب۔ بہت سہہ چکی ہوں۔
ناز نخرے تو تھے ہی، سمجھتی تھی کہ مجھ سے نہیں تو کس سے لاڈ ہوں گے۔ لیکن یہ لعن طعن
یہ غصّے، یہ بیر بھی، یہ سب سہہ نہ سکوں گی۔ نوک جھونک کرنی ہو تو اپنے ہوتے سوتوں سے
کر دیکھو۔ میں نگوڑی کوئی باندی بچّی نہیں ہوں جس نے پتّہ کچل کر پھینک دیا ہو۔ میری
ماں سوتن بائی یوپی بھر میں مشہور تھیں۔ اکیس رنڈیاں تھیں اس کے کوٹھے پر اور وہ بھی
ایسی جن کے پاس شہر بھر کے نواب زادے اور رئیس آتے تھے۔ قسمت پھوٹے ہیں جو یہاں
دو دمڑی کے دھندے کے لیے آن مری ہوں۔

بیگم کا پارہ بھی چڑھ چکا تھا۔ ویسے بھی اس کے تلوّن سے اس کی ساتھ
والیاں جلتی تھیں۔ دو چار مقبولِ عام لڑکیاں اور بھی شبراتن بائی کے کوٹھے سے دھندے
پر جاتی تھیں لیکن ان کے انداز دوسرے تھے۔ دلال کسی کو لے آتا اور اپنا کمیشن کاٹ لیتا
بائی جی مشاطگی کرتیں اور اپنا کمیشن دھر لیتیں۔ جو کچھ بچ رہتا وہ تو کم از کم ہر سونے والی کی
گرہ میں محفوظ ہو جاتا۔ بات جتنے پر طے ہوتی اس کے نصف کے لیے تو کوئی جوکھم نہ ہوتا

سہارے
پھر انعام و اکرام بخشش یا دین الگ ہوتی۔ بیگم کا معاملہ دوسرا تھا۔ گھر بار تو اس کا تھا نہیں جو وقت پر دوسروں کی طرح بن سنور کر چلی آتی۔ شبراتن بائی ہی کے کوٹھے سے کام شروع کیا تھا۔ شبراتن بائی ہی کے کوٹھے پر اس کی نتھ اتری تھی۔ ایک فوجی کرنل کے آوارہ لونڈے نے اس کی نتھ اتاری تھی۔ صبح وہ جانے لگا تھا تو بیگم کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو اپنے رومال سے پونچھتے ہوئے اس نے یقین دلایا تھا کہ میں بہت جلد آؤں گا۔ جب وہ جا چکا تو بیگم نے دل کے قریب کسی نشتر کو محسوس کیا جو کبھی کسک بن جاتا، کبھی درد اور کبھی درد کی دوا اور جب وہ سو کر اٹھی تھی تو غسل خانے لے جانے تک بائی جی اس پر سو سو بار تصدق ہو ہو گئیں ــــ نیا فراک، نئی شلوار، ٹائیلٹ کا بکس اور بیس روپے بیگم کے حصے میں آئے۔ اس نے اپنی ساتھ والیوں سے سنا تھا کہ بائی جی نے پورے چار سو روپے اینٹھ لیے ہیں۔ لیکن بیگم کو ان باتوں کی پرواہ نہ تھی۔ رکشا میں سوار ہو کر بدر بھائی کے ساتھ سوقین سے وہ حاجی صاحب کے مکان پر اس طرح پہنچی کہ راہ چلتوں نے اس کی انگلیوں کی پوروں کو تک نہ دیکھا۔ کسی پیشہ ور عورت کا حاجی صاحب کے گھر میں جانا کوئی مذاق نہ تھا، وہ تو حاجی صاحب جانتے نہ تھے کہ بیگم کوئی پیشہ ور عورت ہو گئی ہے ــــ دس روپے اس نے اپنے بہن اور بھائی کو دے دیئے۔ پانچ روپے بدر بھائی کے حصے میں آئے۔ پانچ کا ایک نوٹ خود اپنی پرس میں رکھ کر وہ خوش خوش اپنے گھر لوٹ گئی ــــ شبراتن بائی کا گھر اس کا اپنا گھر ہی تو تھا۔

لیکن آج پھر دنیا بھر کی سنسناتی ہوائیں اس کے دماغ میں گھس آئی تھیں جس اُمید پر اس نے شبراتن بائی کی دہلیز کو پکڑ رکھا تھا جس آس میں اپنی تنک مزاجی کے باوجود شبراتن بائی کا سرد و گرم سہتی رہتی تھی۔ وہ امید وہ آس آہستہ آہستہ ایک حسرت

بن کر اس کے دل میں آباد ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا اب دھرا ہی کیا ہے یہاں جھوٹی آشاؤں کے سوا۔ ہمت کر کے اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ نکل ہی چلو بیگم یہاں سے۔ اس کے ذہن نے آن واحد میں فیصلہ کر دیا تو وہ بائی جی پر برس پڑی۔

"چھوڑ کر ہی رہوں گی آج تمھارا گھر۔ ساری اکڑ نہ نکل جائے بائی جی تو ڈبل چونے اور کتھے کا پان کھا کر تھوک دینا میرے منہ پر۔ کماتی میں ہوں، کھاتے سب ہیں اور نزلہ اتارتی ہو تو الٹے مجھ ہی پر ـــــ غصہ میں تمھارا سہتی ہوں، گالیاں میں تمھاری سنتی ہوں، یہاں تک کہ مارنے کے لیے تم نے ہاتھ تک اٹھایا۔ یہ بھائی بیچ میں نہ آتے تو شاید مار بھی دیتیں۔" بیگم کی آواز بھر آئی اور وہ رو رو کر بین کرنے لگی ـــــ

"دل میں جو بھی ہے پورا کر ہی کیوں نہ لو ـــــ مجھے تاؤ میں لا کر چاہتی ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔ اس لیے کہ لوگ تم پر انگلی نہ اٹھائیں قصور میرا ہی ٹھہرے کہ میں خود بھاگ نکلی ـــــ صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ لیکن سن رکھو چلی جاؤں گی تو دو دو دن ہانڈی نہیں چڑھے گی اس گھر میں۔"

ہانڈی کی بات سن کر بائی جی نے کہا "اس طرح بہت مت اتراؤ بیگم۔ اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا۔ تم چلی جاؤ گی تو ہم سب کی قسمت اپنے پلو میں باندھ کر نہیں لے جاؤ گی جو ہم بھوکوں مرنے لگیں۔ تم کیا مارو گی ہمیں۔ جلانے والے کی قدرت بھی تو کچھ ہے، اور پھر میں کب تمھیں گھر سے نکالنے بیٹھی ہوں، جوانی کے بھرے پر تم ہی تو چھوڑ جانے کی دھمکی دیتی ہو۔"

بیگم نے بائی جی کو بیچ ہی میں ٹوک دیا۔ کہنے لگی "اس گھمنڈ میں نہ رہنا بائی جی کہ لونڈیا دھمکی دے کر ٹل جائے گی ـــــ جوانی ہی کو سب کچھ سمجھتی، بل بوتے ہی کا

غرہ ہوتا تو اب تک ایک ایک کو ٹھا بساتی پھرتی۔ یوں تمہاری چوکھٹ سے چپک کر نہ رہ جاتی۔“
بائی جی نے خیریت اسی میں سمجھی کہ تھوڑی سی نرمی لہجے میں پیدا کر لی جائے۔ بیگم نے جتنی بار غصہ کیا اتنی ہی بار غصے میں ایسے جملے بھی کہتی رہی کہ منا پھسلا کر اس کو روک لینے کے مواقع بھی بائی جی کے لیے پیدا ہوتے رہیں۔ سو بائی جی نے پچکارا۔ جھٹ اپنے پلو کو آنکھوں پر رکھتے ہوئے بولیں ”وہ بات بے بات کے بگڑ جاتی ہے۔ آگ خود لگاتی ہے، کہتی ہے میں ہوا دیتی ہوں۔ خود دکڑھتی ہے مجھے کڑھاتی ہے جس کو چاہتے ہیں اسی کی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے نا بٹیا۔ تجھے دکھ اسی بات کا ہوا نا کہ تجھ سے پوچھے بغیر مجھ نصیبوں جلی نے تیرے چاول اور گھی پر ہاتھ صاف کیا۔ محبت کی بھوکی ہوں تجھے اپنا سمجھتی ہوں۔ تیرا کھاتے ہوئے بھی غیرت نہیں محسوس ہوتی لیکن میں ہوتی کون ہوں تیری۔ غلطی میری اپنی ہے۔ تو نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی تو ہے“
بائی جی آنسو بہانے لگیں تو بیگم کا دل پسیج گیا۔ اور پھر اندھا کیا چاہے دو آنکھیں بیگم کب اس گھر کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے دماغ میں سائیں سائیں کرنے والی ہوائیں اب صبا رفتار ہو گئی ہیں۔ دل کے اطراف کچھ روشنیاں سی پھیل گئی ہیں۔ لیکن ان احساسات کو چھپائے رکھنا بھی تو تھا۔ سو کچھ کہے بغیر وہ چپ چاپ کمرے میں جا گھسی۔
بدر بھائی نہ تھا کہیں پی کر کہیں پڑ رہا ہوگا۔ ایسے مواقع پر وہ جب کبھی موجود رہتا بیگم کو سمجھا منا کر روک لیتا۔ اس کی موجودگی میں بیگم اس طرح فوری ہتھیار نہیں ڈالتی تھی۔ جتنا ہنگامہ کر سکتی تھی کرتی۔ اپنا ٹرنک چادر اور تکیے اٹھا کر بار بار دروازے کی طرف بڑھتی اور بدر بھائی بار بار آڑے آ کر راستہ روک لیتا لیکن آج وہ دروازے

تک پہنچ جاتی تو بڑھ کر راستہ روکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ شبراتن بائی چاہتی ضرور تھی کہ بیگم اسی گھر کی رونق بنی رہے لیکن اس کے جاتے وقت راستہ روک لینے سے تو سارا بھرم کھل جاتا۔ ادھر خود بیگم بھی سوچتی کہ اس کی زندگی کا کوئی بہت پیارا جذبہ اسی گھر کے در و دیوار سے وابستہ ہے۔ وہ جیتے جی تو اس گھر کو نہ چھوڑ سکے گی لیکن اس بات کا اظہار کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اس کمزوری کا علم بائی جی کو ہو جاتا تو تگنی کا ناچ نہ نچا دیتیں؟ اس راز سے صرف بدر بھائی واقف تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نہ شبراتن بائی بیگم کو گھر سے نکال سکتی ہے اور نہ بیگم گھر چھوڑ سکتی ہے اور یہ بھی کہ ایک دوسرے کی کمزوریوں سے دونوں ہی واقف ہیں۔

بیگم کمرے میں جا گھسی تو بدر بھائی اس کو بے اختیار یاد آ رہا تھا۔ آج وہ نہ تھا تو وہ خود کو کس قدر مجبور پا رہی تھی۔ بائی جی اس طرح چوکڑی نہ بھولتیں تو ــــ؟ اور وہ کانپ کانپ گئی۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال چپکے سے اس کے ذہن میں گھس آیا۔ نہ جانے کیوں اس کو اس بات سے تسکین ہوئی کہ کوئی اس کا خیال کرنے والا تو ہے ــــ اس تسکین کے پیچھے پیچھے پاؤں لگی ہوئی پکھال، ہانپتا ہوا کچھوا اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں اس کے تصور میں ابھرنے لگیں تو اس نے اپنے خیالات کے اڑن کھٹولے کو دوسری سمت میں موڑ لیا۔ اس لیے بھی کہ وہ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال کے خلاف اس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

کھچڑی دم ہو چکی تھی۔ چاول اور گھی کی خوشبو نے اس کو پھر جھنجوڑا۔ اس نے سوچا کہ رات کو بھی اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ سیٹھ بنسی داس ہری داس اگروال نے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کوٹ کے اندرونی جیب سے چکناہٹ سے اٹی ہوئی ایک پڑیا نکالی تھی اور

حلوہ سوہن کا ایک بڑا سا ٹکڑا اپنی آغوش میں اس کو بھینچتے ہوئے اس کے منہ میں رکھ دیا تھا۔ اس نے سوہن ٹپی کاٹنے کے بہانے سیٹھ کی انگلی کو کاٹ لیا تھا تو وہ اس مذاق پر بہت خوش ہوا تھا اور اس کو گدگدانے لگا تھا۔ سیٹھ کے منہ میں سوہن ٹپی کا ایک ٹکڑا ٹھونسنے کی جب خود اس نے کوشش کی تھی تو سیٹھ نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔

"بیغم ہم کو وہ مٹھائی کھلاؤ جس میں چینی ڈبل ڈبل ہے۔" بیگم سمجھ نہ سکی تو سیٹھ نے اس کو پھر ایک بار کھینچا اور اس کے منہ کی طرف اپنا منہ بڑھا کر کہا "منہ سے منہ ملا کر اپنا جھوٹا کھلا دو جی بیغم" لیکن بیگم کو اُبکائی سی آ گئی۔ اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے سیٹھ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر منہ پھیر لیا، اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل کر سوہن ٹپی تھوک آئی۔ گو اس کیفیت کو اس نے سیٹھ پر ظاہر ہونے نہ دیا۔ لیکن اس کو کھانے کی ہر چیز سے اس وقت گھن آنے لگی سیٹھ کے تصوّر سے اس کی طبیعت پھر مکدر ہو رہی تھی۔ جانے کیوں اس کو یہ احساس بار بار ہو رہا تھا کہ ایسی باتیں جس میں سیٹھ سے بیزارگی شامل ہو نہ سوچنی چاہئیں۔

یکایک اس کو بدر بھائی کا خیال آیا۔ مسلسل دو دن غائب رہ کر ایک بار وہ اسی طرح جب واپس آیا تھا تو وہ بہت خوش تھا اس نے چپکے سے بیگم کے کان میں کہا تھا۔ "پگلی تیرا وہ آ رہا ہے ـــ تجھ کو پوچھ رہا تھا۔ میں نے رات اس کا کام بنا دیا۔ لونڈا دل کا بُرا نہیں ہے۔ ایک بڑھیا مال پھانس کر لے گیا ہے ـــ کہہ رہا تھا بس آ دھمکوں گا بدر بھائی جلد ہی ـــ بیگم کو ہمارا سلام کہہ دینا"

وہ کہیں کھو سی گئی تھی۔

"بدر بھائی نے چپت لگا کر کہا تھا۔ کہاں کھو گئی ہے۔ اب وہ آنے کا نہیں ـــ

سہارے۔
یہاں کی کوئی چیز اس کو پسند نہیں ہے۔ آنا تو اب تک تیرے لیے ہی آجاتا۔ اس کی اٹرا بہت اونچی ہے بیگم۔"

"اب بھی میرے لیے تو آسکتا ہے نا بدر بھائی۔"

"اب کیا خاک تیرے لیے آئے گا۔ پیشہ شروع کرکے قریب قریب چھ ماہ تو بیت ہو ہی گئے ہوں گے۔ آنے والا ہوتا تو اب تک کئی بار آچکا ہوتا۔ تیری قدر اس سے بڑھ کر او کون کرسکتا تھا پگلی جس نے تجھے لڑکی سے عورت بنایا۔"

وہ سوچنے لگی۔ بدر بھائی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ آخر وہ نہ آیا۔ لیکن آج بدر بھائی اس کو ساتھ لے آئے تو ـــــ میں اس سے نہیں بولوں گی ـــــ لیکن وہ لوٹ جائے گا۔ میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر خوب رو لوں گی ـــــ آہستہ آہستہ وہ اس سے قریب ہوتا گیا ـــــ آہستہ آہستہ لاتعداد بوسے اس نے اس کے لبوں، گالوں، آنکھوں اور پیشانی پر جڑ دیئے محبت اور پیار کی بہت ملائم اور لطیف فضا نے اس کی ہستی کو اپنی وسعت میں سمیٹ لیا۔ وہ اپنے لبوں پر اس کے بوسوں کی حدت آج بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیگم نے دوشیزگی کے حدود کو پیچھے چھوڑ دیا تھا، اور زندگی کے نئے تجربوں میں اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے کے خواب دیکھنے لگی تھی ـــــ اس خوش فہمی میں بیگم کی معصومیت کو دخل نہ تھا جب اس نے اس کے پاؤں پکڑ کر کہا تھا کہ مجھے اس گندگی سے نکال لیجیے نا ـــــ تو اس نے بیگم کو یقین دلایا۔ اس اعتماد اور یقین پر کہ وہ پہلا شخص ہے جو بیگم کی زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے بیگم کی معصومیت اور پاکیزگی کی قسمیں کھائی تھیں۔ رات بھر میں جتنی ہی باتیں بیگم نے اس سے کی تھیں اتنی ہی گرمجوشی سے اس کی باتوں کا اس نے جواب دیا تھا۔

وہ بار بار یہی جملے دھراتا۔ بہت معصوم ہے ـــــ قسمت نے کہاں لا پھینکا ہے۔

یہ جملے دھراتے ہوئے اس کی باتوں اور حرکتوں پر وہ بار بار ہنستا ہنستے ہنستے

اس کو کھینچ کر بے اختیار چوم لیتا۔ کہتا تمھیں بھول جانا بس کی بات نہ ہوگی۔ تمھیں سہارے دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔

رات بھر اس کی آنکھ تک نہ جھپکی۔ بیگم کو بھی اس نے پلک جھپکانے نہ دیا۔ کیسی کیسی نرم نرم سی میٹھی میٹھی سی باتیں کرتا رہا۔

یکایک پوچھ بیٹھا "مجھے سونے سے پہلے پیر دبوانے کی بری لت ہے بیگم۔ تم روز پیر داب دوگی نا"

بیگم نے کہا تھا "اب آپ آرام کیجئے میں پیر داب دیتی ہوں" اور وہ پاؤں دابنے لگی تھی۔ وہ کس قدر فاتحانہ انداز سے بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کس قدر پیار تھا۔ پھر یکایک وہ اٹھا اور اس نے یہ کہہ کر بیگم کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا کہ آج کی رات تمھیں چھٹی ہے کل سے تمھیں یہ کام کرنا ہوگا۔ آج میں سونا بھی نہیں چاہتا ہوں"

پھر بیگم کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"کچھ سناؤ نا"

"تم اس دلدل میں پھنس کیسے گئیں"

بیگم پس و پیش کرتی رہی۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو اس نے سب کچھ بتا دیا یہاں تک کہ اپنے ماں باپ کا نام بھی۔ جب وہ کہہ رہی تھی کہ انڈین آرمی نے جس وقت اس کے باپ کو گرفتار کیا تو وہ بھی وردی ہی میں تھا۔ لیکن جب اس کو گولی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اس وقت اس کی وردی تار تار ہو چکی تھی۔ اس کی پیشانی اور گھٹنوں سے لہو رس رہا تھا۔

"اور جب ایک فوجی نے بندوق اٹھائی تو فیر ہونے سے پہلے میری ماں چیختی

چلاتی میرے ابا کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس وقت میں چھوٹی تھی۔ مجھے اپنا چھوٹا پن اس وقت بہت کھل رہا تھا مجھے پاکر فوجیوں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں — انھوں نے مجھے کلائیوں سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر یہ کہہ کر ہاتھ جھٹک دیا تھا کہ ابھی چھوٹی ہے۔ اُن کی اس شرارت کو میں اس وقت سمجھ نہ سکی تھی۔ آج سوچتی ہوں کہ اگر میں اس وقت بڑی ہوتی تو شاید میرے ماں باپ بچ جاتے — بالآخر بندوق کی آواز کے ساتھ میرے ماں اور باپ دونوں کی دل دوز چیخیں سیکئیں تھیں بلند ہوئیں اس کے بعد کچھ اندھیرے میری طرف بڑھے اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔"

اتنا کہتے کہتے بیگم کا گلا رندھ گیا۔ بیگم نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں چار کیں تو اس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ بیگم جھکی تو اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپک پڑا، اور اس کے گال پر گر کر پھسلنے لگا۔ عین اسی وقت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک قطرہ اس کے گال پر پھسل کر بیگم کے آنسو سے جا ملا۔ بیگم کے زانو سے سر اٹھا کر اس نے بیگم کے اور اپنے آنسو خشک کیے اور اس کو ہنسانے کے لیے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتا رہا۔

بیگم سوچنے لگی۔ میں کس طرح اس منظر کو بھلا سکتی ہوں کہ اس کی آنکھیں میرے لیے بھیگی تھیں — ان آنسوؤں کے سہارے تو میں ساری زندگی بتا سکتی تھی۔ لیکن وہ پھر کبھی نہ آیا۔ یہ سب کچھ اس دنیا میں کس طرح ممکن ہو جاتا ہے۔

ساری باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے اس کے سینے میں کیسی ہل چل ہوئی۔ ایک سمندر تھا جو امڈ امڈ کر آنکھوں سے ٹکراتا تھا، ایک سیخ تھی جو کسی نے آنچ دے کر سینے میں کھڑی کر دی تھی اس کو یکایک خیال آیا۔ خورشید کہہ رہی تھی تیرے لیے کوئی آیا

تھا۔ پوچھتا تھا بیگم کہاں ہے۔ لیکن اس نے پھر خود ہی تردید کی ــــ وہ نہیں ہو سکتا ــــ وہ اس طرح چُپ چاپ لوٹ جانے والا کب تھا۔ میں سات پردوں میں بھی ہوتی تو وہ مجھ سے مل کر ہی جاتا ــــ اور پھر اس کے آگے خورشید کی چرب زبانی کہاں چل سکتی تھی بھلا۔ لیکن اس وقت خورشید سے پوچھ لینے کی بھی اس میں تاب نہ تھی۔ وہ بالکل بھول گئی تھی کہ خورشید نے اس آدمی کا تذکرہ کرتے وقت کلموہا کہا تھا۔ لیکن وہ تو سُرخ و سفید تھا ــــ سینے کے اندر موجیں مارتا ہوا سمندر آنکھوں کے بند توڑ کر جیسے بہنے لگا۔ اس نے نڈھال ہو کر تکیوں میں منہ چھُپا لیا اور دیر تک روتی رہی۔ روتے روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اس کو پتہ تک نہ چلا۔ جب بیدار ہوئی تو خالی پیٹ اس کے پندار کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بائی جی نے جھوٹے منہ اس کو ناشتے پر تک نہیں بلایا۔ حالانکہ اس نے سوچا تھا کہ بائی جی منا سمجھا کر اس کو دو نوالے ضرور کھلوائیں گی لیکن بدر بھائی کی غیر موجودگی اس کو کس حد تک بے سہارا کر دیتی ہے۔ اس بات کا احساس اسے رہ رہ کر ہو رہا تھا۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ اس وقت تک باہر نہ نکلے گی جب تک کہ بائی جی یا پھر خورشید یا رادھا اس کو منانے کے لیے نہ آئیں کہ پٹاخ سے دروازہ کھول کر بدر بھائی کمرے میں داخل ہوا۔ اوندھی پڑے پڑے بیگم نے گردن اٹھا کر بدر بھائی کو دیکھا تو ایک چمک سی اس کے چہرے پر آتے آتے رہ گئی۔ وہ اس لیے گئی کہ بیگم نے کوشش کر کے چہرے کی چمک کو اداسیوں اور آنسوؤں کے پیچھے چھُپا دیا ورنہ بدر بھائی کی ہمدردی کیسے حاصل ہوتی۔ لیکن اس پر بھی بدر بھائی نے ہمدردی نہ کی تو بیگم نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا ــــ بدر بھائی بڑے جوش میں اندر داخل ہوا تھا۔ لیکن بیگم کی سوجی ہوئی

سہارے
آنکھوں اور بھاری پپوٹوں کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے بے حس سا کھڑا رہا پھر کچھ سوچے بغیر آگے بڑھ کر اس نے بیگم کو اٹھا کر کھڑا کر دیا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ چل ذرا جلدی سے تیار ہو جا۔

"کیوں۔ میں اب کہیں نہیں چلوں گی۔"

"چلنا کہیں نہیں ہے "ایک ٹائم" کے لیے اپنے گھر ہی پر آیا ہے۔"

بیگم کو برا معلوم ہوا۔ وہ بدر بھائی جس کو بیگم نے دل دکھنے پر ہمیشہ اپنا سہارا سمجھا۔ آج اس نے بیگم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو اس قدر اداس کیوں ہے۔ کمرہ بند کیے اندھیروں کی کیوں ہو گئی ہے، آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں تیری۔

"میں منٹ بھر کے لیے بھی کسی کے ساتھ اس وقت نہیں رہ سکتی بدر بھائی۔"

بدر بھائی نے پچکارا "چلو بھئی اب چلو بھی۔ بڑی مشکل سے آیا ہے۔"

بیگم برس پڑی۔ "مشکل سے آیا ہے تو آسانی سے واپس کر دو۔ ہر شخص کو بس اپنی ہی پڑی ہے۔ کسی پر کچھ بیتے۔ کوئی جل کر اندر راکھ ہوتا رہے لیکن پوڈر چہرے پر مل کر روشن ہو جائے۔ آنسو امڈ امڈ کر آئیں تو مسکرا مسکرا کر بائیں کرے۔ یہ سب زندگی بھر تو ہوتا ہی ہے بدر بھائی لیکن آج نہ ہوگا۔"

بدر بھائی بہت تھکا ہوا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ خود بھی جل کر اندر راکھ ہو رہا ہو، صورت تو کچھ ایسی ہی بنا رکھی تھی اس نے۔

اس نے پھر منت سماجت کی "چلو بھئی اتنی اچھی سی ہو۔ مجھ سے اب حجت نہ کرو۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ لونڈا اچھا نویلا ہے۔ کچھ زیادہ پر ہی راضی ہو گیا ہے۔ رقم بائی جی کو دلوا بھی دی ہے۔ بس اب غصہ تھوک دو۔"

سہارے

"بائی جی نے رقم اینٹھ لی ہے؟"۔ بیگم کا پارہ بہت تیزی سے چڑھ گیا۔ بدر بھائی کو پرے ڈھکیل کر وہ کمرے سے نکل گئی۔ کہنے لگی۔ اچھا تو بائی جی کے وکیل بن کر آئے ہو تم بدر بھائی ۔ سولے میری کوئی ہوتی سوتی۔ میں تو منٹ بھر کے لیے بھی تیار نہیں ہوں میں نے سارے گھر کا گنہ نہیں لیا ہے۔ ٹھیکہ تو تم نے لے رکھا ہے بائی جی کا ۔ کوٹھے بھر میں کیا میں ایک ہی عورت رہ گئی ہوں جو گودگرم کرنا جانتی ہے اور بھی تو ہیں نا۔ جو آتا ہے میرے لیے ہی کیوں آتا ہے۔ زیادہ دام ملتے ہیں تو کچھ کم لے کر کسی اور کو بھجوا دو نا۔

بدر بھائی نے ڈانٹا۔ "بیگم تیرا دماغ روز بروز خراب ہوتا جارہا ہے۔ اب تو میرے منہ بھی آنے لگی ہے۔ کسی کو لے آتا ہوں تو خود مالا مال نہیں ہو جاتا ہوں۔ احسان نہیں کرتی ہے تو مجھ پر جو تیرا ٹمپر سہہ لوں۔"

بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ سیدھی رسوئی میں پہنچ کر سارے چہرے پر راکھ اور کالک پوت آئی اور بیچ صحن میں کھڑی ہو کر چلانے لگی "بلاؤ کون ہے وہ مجھ سے منہ کالا کرنے والا۔ مجھے دیکھے بغیر پیشگی رقم چکانے والا۔ دل بھر کر سولے میرے ساتھ" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بدر بھائی ہکا بکا کھڑا اس کو بغور دیکھتا رہا۔ مزید ڈانٹنے یا جھگڑنے کی اس نے جرات نہ کی۔ چپکے سے اس کے پہلو سے نکل کر باہر کے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے وہ بڑبڑانے لگا۔

"کہہ دوں گا جس شخص نے بیگم کی تعریف کے پل تمہارے سامنے باندھے ہیں اس سے کہہ دو کہ بیگم اپنے غصے کے سبب پاگل ہو گئی ہے۔"

بیگم کے کانوں پر سے جیسے شوکتی ہوئی گولی گذر گئی۔ بدر بھائی دروازے کے

سہارے

قریب پہنچا تھا کہ اس نے آواز دی۔ بدر بھائی کے لیے جیسے یہ آواز متوقع تھی۔ اس نے پلٹ کر بیگم کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں علانیہ التجا سی تھی۔

بیگم چاہتی تھی کہ بدر بھائی آگے بڑھ کر اس کو گلے سے لگا لے۔ پچکار کر منا لے۔ اس لیے کہ اس طویل و عریض دنیا میں ایک بدر بھائی ہی ایسا تھا جس کو وہ اپنا سہارا سمجھتی تھی۔ لیکن آج وہ اس کو بھی پیچھے چھوڑ کر جیسے اتنی دور نکل گئی تھی کہ بدر بھائی بھی اتنی دور آ کر سہارا دینے تیار نہ تھا، اور اب جب کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی تو اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے آگے بدر بھائی کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے نقوش واضح نہ تھے اس کے خد و خال ظاہر نہ تھے۔

"پہیلیاں کیوں بجھوا تے ہو بدر بھائی۔ صاف صاف کہتے کیوں نہیں۔ کون ہے تُو۔ لوٹ جائے گا تو کیا لے جائے گا میرا۔"

بدر بھائی نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا "وہ اسی کرنل کے لونڈے کا دوست ہے۔ تمھاری تعریفیں کر کے اس نے تم سے ملانے کے لیے اس کو میرے ساتھ بھجوایا ہے۔"

جواب دیتے دیتے جب بدر بھائی بیگم سے قریب ہو گیا تو بیگم نے آنچل سے اپنی آنکھیں خشک کر لیں اور اس کا آنچل کاجل کی نمی سے گندہ ہو گیا۔۔۔ دونوں آنکھوں پر دو سفید سفید دھبے نمودار ہوئے۔۔۔ بدر بھائی بڑے پیار سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم رات کو اسی کے ساتھ تھے؟ وہ خود کیوں نہیں آیا۔"

"رات گئے مجھے چند شرابی حرامیوں نے تھوڑی سی تکرار پر شہر سے دور موٹر روک کر اتار دیا اور مس کالی کو لے کر چلتے بنے میں رات بھر اس وقت سے اب تک پیدل چلتا رہا ہوں۔ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہوں۔ وہ تو سہیں اپنے گھر کے

قریب ملا تھا۔ موٹر روک کر میری ہی تلاش میں تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ منٹ دو منٹ کے لیے چلا آئے۔ لیکن وہ مجھ سے کہنے لگا مجھ میں بیگم کے سامنے آنے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کو میرا سلام کہنا۔ اور کہنا کبھی آجاؤں گا۔"

جب اس کا دوست نیچے اترا تو موٹر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"یہ وہی بیگم ہے نا جس کی تم تعریفیں کرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا "ہاں وہی بیگم ہے۔ اسی کے پاس تو بھجوا رہا ہوں تمھیں — بڑی پیاری سی، بڑی معصوم۔"

بیگم نے دالان کی طرف نظر اٹھائی تو رادھا کھچڑی سے بھری ہوئی پلیٹ ہاتھ میں تھامے شبراتن بائی کو دو نوالے کھا لینے کے لیے راضی کر رہی تھی۔

بیگم بدر بھائی سے مخاطب ہوئی تو وہ شبراتن بائی کو کچھ اس طرح تک رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو بیگم اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی میں نے اس کو پھر قید کر دیا ہے۔ لیکن بیگم کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ بدر بھائی کی آنکھیں شبراتن بائی سے کیا کہہ رہی ہیں۔

اس نے بدر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کا سہارا لیا۔ ذرا کی ذرا چکر آجانے سے آنکھیں موند کر لمحے بھر کو اونگھ گئی۔ اور پھر آنکھیں ملتے ہوئی بولی۔

"بدر بھائی میرے حصّے کی کھچڑی رکھی ہوگی۔ تم ناشتہ کر لو، اور — وہ کون ہے اس کو ٹھیرالو۔ میں ابھی تیار —" اور اس کا گلا پھر رندھ گیا۔ آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔ بدر بھائی کے نقوش پھر غیر واضح ہو گئے۔ اور وہ غسل خانے میں گھس گئی۔



سمجھوتہ

سات سال کی ننھی منی جان نے دور تک چمکتی ہوئی ریل کی پٹریوں کو دیکھا تو اس کو یہ خیال نہ آیا کہ پٹریوں پر ادھر ادھر دوڑتی ہوئی ٹرینوں میں بیٹھ کر دور دور کا سفر کرے، بلکہ اس نے پہلی بار یہی سوچا کہ اس پٹری پر یا تو آہستہ خود لیٹ جانا چاہیئے یا گورے جانی کو چپکے سے سلا کر کہیں دور بھاگ جانا چاہیئے۔

لیکن وہ روز چمکدار پٹریوں کو دیکھتا رہا، دوڑتی ہوئی ٹرینوں کے ڈرائیوروں کو ٹھینگے بتاتا رہا۔ زبان چڑاتا رہا یا پھر سلوٹ کرتا رہا۔ پٹری پر لیٹ جانے یا گورے جانی ہی کو چپکے سے سُلا دینے کی خواہش کے باوجود اس نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ گورے جانی بدستور یا تو اس کی گود میں جما رہا یا پھر پھسل کر اس کی کمر اور کولہوں پر لٹکتا رہا۔ بھاگتی ہوئی ٹرین کے ڈرائیور کو سلوٹ کرنے پر کبھی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو میاں جانی کے دوسرے ساتھی تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے لیکن میاں جانی کو کبھی یہ آزادی نصیب نہ ہوئی کہ وہ بھی تالیاں بجا بجا کر ناچ سکے۔ ڈیڑھ سال کے گورے جانی کے بوجھ کو وہ ہمیشہ ہاتھ اور کولہوں کے سہارے سنبھالے رہتا، اور حسرت سے

تالیاں بجا بجا کر ناچتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو تکا کرنا، اور روندناتی ہوئی ٹرین اس کے سامنے سے گذر جاتی۔

اس کی زندگی میں اگر کچھ رس تھا تو صرف اس تصور سے کہ گورے جانی جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو وہ خوب کھیلے گا۔ دن دن بھر تتلیوں کے پیچھے بھاگتا پھرے گا اپنی غلیل سے اتنی چڑیاں مارے گا کہ چڑیاں اس کے خوف سے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ کب ہو سکے گا۔ وہ دن کب آئے گا جس کے انتظار میں وہ اپنی بے رس زندگی سے ناتا جوڑے ہوئے ہے۔ اس کا اس کو کچھ بھی علم نہ تھا۔

ابھی تک وہ اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور دکھتے ہوئے بدن کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے گورے جانی کی پرورش کر رہا تھا صرف اس لیے کہ اگر اس کے آنسوؤں سے گورے جانی کی پیشانی تر نہیں ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کی آنکھوں میں مرچ لگا دیتی ہے۔ صرف اس لیے کہ گورے جانی اس کے دکھتے ہوئے ہاتھ اور کولہے کے سہارے لٹکتا نہیں رہتا ہے تو اس کا باپ امرود کے درخت سے پتلی سی لچکتی ہوئی ٹہنی توڑ کر اس سے چھڑی کا کام لیتا ہے۔ اور وہ اس ٹہنی کے سامنے جس پر چہکتی ہوئی چڑیوں کو غلیل کا نشانہ بنانے کے لیے وہ بے تاب رہا ہے، مکڑی کی طرح ناچنے لگتا ہے اور کولہوں پر اُول آجانے کے بعد بھی گورے جانی کا بوجھ اس پر لاد دیا جاتا ہے۔

ایک دن اس نے اپنی ماں سے بہت سنجیدگی سے کہا "ماں۔ اگر میں گورے جانی کو ریل کی پٹری پر سلا دوں تو ——؟" ماں نے ڈانٹ بتائی —— پولیس میں پکڑے جانے کا خوف دلایا۔

اس نے کہا "ماں، اور جو میں خود پٹریوں پہ سو رہوں تو پولیس تمھیں، آبا کو

اور گورے جانی کو پکڑ نہ لے گی؟"

ماں نے جواب دیا۔" تو پٹریوں پر سو رہ۔ ریل کے نیچے کچلا جائے گا تو تیری بوٹی بوٹی چیلیں اور کوّے کھائیں گے۔ ہمیں پولیس کیوں پکڑنے لگی۔ ہم تھوڑا ہی تجھے ریل کے نیچے پھینک دیں گے۔"

میاں جانی نے کچھ سوچ کر کہا۔ تو پھر تم مجھے دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے پھینک دو۔ ماں ۔۔۔۔ پھر وہ مسکرایا۔ لیکن تم ایسا کرو گی تو گورے جانی کو کون سنبھالے گا۔۔۔ اور وہ قہقہہ مار مار کر تالیاں بجانے لگا۔

اس کی ماں نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو پیار کیا اور چپکے سے گورے جانی کو اپنی گود سے اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے گورے جانی کو اپنی کمر کے سہارے سنبھال لیا، اور اسے پیار کر کے گدگدانے لگا۔

جس گھر میں وہ رہتا تھا اس کی ماں وہاں باورچن کی خدمت انجام دیتی تھی سورج کی پہلی کرن سے پہلے ہی اس کے ماں باپ کی مصروفیت شروع ہو جاتی تو ماں کے سینے سے چمٹا ہوا گورے جانی چیخنا چلّانا شروع کر دیتا، اور اس کی ماں میاں جانی کو جھنجوڑتی نیند سے بوجھل آنکھوں کو ملتا ہوا میاں جانی اٹھ کھڑا ہوتا اور بادل ناخواستہ گورے جانی کا بوجھ اٹھا لیتا۔ اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نیند جیسے گورے جانی کے خوف سے کہیں بھاگ جاتی، اور چپکے سے چمکتے ہوئے آنسو اس کی جگہ لے لیتے اور میاں جانی کسی سے کچھ کہے بغیر اپنی ماں اور باپ کے ساتھ زندگی کی دوڑ دھوپ میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

گھٹنوں کے اوپر سے پھٹے ہوئے پاجامے کی دھجیاں لٹک کر زمین کو چومتی رہتیں اور میاں جانی گورے جانی کو کولھوں پر لٹکائے اس قدر احتیاط سے قدم اُٹھانے لگتا جیسے اس کی ماں آٹھویں مہینے میں گورے جانی کو پیٹ میں چھپائے ہوئے اٹھایا کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جن دنوں ماں نے بوجھ اٹھا رکھا تھا ان دنوں گورے جانی بھی جیسے اس سے سمجھوتہ کیے ہوئے بالکل خاموش کسی تاریک گوشے میں پڑا رہتا تھا، اور آج جب کہ میاں جانی نے اس کا بوجھ اٹھالیا تھا تو وہ باوجود اس روشن اور وسیع دنیا میں سانس لینے کے۔ روتا چیختا، چلّاتا اور مچل مچل کر ضد کیا کرتا۔ اس سے میاں جانی کی مصیبتیں بہت بڑھ جاتیں۔ وہ طرح طرح سے گورے جانی کو سنبھالتا، مناتا، بہلاتا۔

آ ری چوں چوں آ ــــــ اور چوں چوں کبھی پھدک پھدک کر امرود کے درخت کی ٹہنی پر آجاتی، کبھی وہ خود چوں چوں کی آوازیں نکالنے لگتا۔

آ ری منّو آ ــــ منّو اطراف میں کہیں بھی نہ ہوتی۔ اور میاں جانی میاؤں میاؤں کرتا منّو بن جاتا۔

کوئی گلہری پھاؤ بتاتا کر سامنے ناچنے لگتی تو میاں جانی گورے جانی کو اس طرف متوجہ کرتا لیکن اس سے پہلے کہ گورے جانی توجہ کرے گلہری کہیں چلی جاتی۔

ایسے مواقع پر میاں جانی کو اکثر اپنی غلیل کا خیال نہ آتا، اور اگر کبھی آجاتا تو گورے جانی کے بوجھ کے نیچے اس کے سارے جذبے اس کی ساری دلچسپیاں، اس کی مختصر سی زندگی کا سارا حُسن، ساری خوبصورتی دب کر سسکنے لگتی، اور وہ گورے جانی کو اپنے کولھے کے سہارے لٹکائے ہوئے سسکیاں لینے لگتا۔

میں نے کئی بار اس کو گورے جانی کو زمین پر لٹا کر اپنی غلیل اٹھا لینے کے لیے اکسایا۔

میں نے اس کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ گورے جانی کو تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا کرے اور کوئی پروا کیے بغیر میرے بچوں سے کھیلے۔ لیکن اس کو میرے خلوص پر پوری طرح اعتماد نہ تھا۔ اس نے کبھی میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا۔

گورے جانی جب تک خاموشی سے بیٹھا کھیلتا رہتا، وہ بھی اس کے سامنے کچھ دیر کھیل لیتا اور اس وقت بھی کسی نہ کسی طرح اس کو بہلاتا رہتا۔ اور اس کی دلچسپی کے سامان فراہم کرتا کہ مبادا اس کی بے رخی پر گورے جانی برہم نہ ہو جائے اور اس کی یہ بہت مختصر سی آزادی سلب نہ ہو جائے۔ لیکن بہت جلد یہی ہوتا۔ گورے جانی بہت نرم سروں میں رونا شروع کر دیتا، اور وہ ایک بے جان کنجی کے پتلے کی طرح آگے بڑھ کر گورے جانی کو اٹھا لیتا۔

میاں جانی کو میں اپنے بچوں کی طرح کھیلتا ہوا دیکھنے کے لیے ترس جاتا۔ وہ کبھی ان کے ساتھ کھیلنے لگتا، تو بھی اس کے چہرے پر کسی نامعلوم خوف کی پرچھائیاں سی نظر آتیں ـــــ میرے بچے فرید کی ٹرائیسکل کے پیچھے وہ بھاگتا رہتا تو اس کے پاجامے کی دھجیوں سے الجھتے ہوئے پیروں کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس طرح بھاگتے بھاگتے ایک دم ساکت ہو جائے گا۔ اس کے قدم آنِ واحد میں زمین میں دھنس کر رہ جائیں گے۔ کوئی بجلی اس پر دیکھتے ہی دیکھتے گرے گی۔ گورے جانی رونا شروع کر دے گا اور میاں جانی کا جسم حرکت نہیں کرے گا۔ اس کا اٹھا ہوا قدم ٹھہر جائے گا۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل ٹھہر جائے گا۔

میاں جانی کے ۳۰ سالہ، لیکن بوڑھے کوڑھی باپ کو میں اس زمانے سے

جانتا تھا جب اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں پر ایک دو کوڑھ کے دھبے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے ضلع کا بہت مشہور اور کھاتا پیتا درزی تھا۔ تین چار مشینیں، دو تین ملازم۔ سیٹھ صاحب کا ان دنوں صرف اتنا کام تھا کہ ٹیپ لے کر آنے والوں کا ناپ لے لیتے، نوٹ بک میں لکھ لیتے، اور کپڑوں کی کٹنگ کر کے ملازمین کو سینے کے لیے دے دیتے۔ میں بھی اس کے پاس نائلون قمیصیں اور شیروانیاں سلوا چکا تھا، اور اس کی ہنرمندی و فنکاری کا قائل تھا۔

ضلع کی زندگی چھوٹی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس معمولی درزی کو یاد رکھتا جس کے فن کی سارے ضلع میں دھوم تھی چنانچہ وہ میرے ذہن سے حرف غلط کی طرح محو ہو گیا

عید سے کچھ دن پہلے محلے کے ایک درزی کو بچوں کے کپڑے سینے کے لیے دیئے گئے تو درزی صاحب نے دکان میں تالا ڈال دیا۔ عید سے ایک دن قبل میرے ملازم نے درزی کے گھر کا پتہ اٹھا کر اسے پکڑا اور تنبیہ کی تو وہ اپنے ساتھ ایک اور نحیف و ناتوان شخص کو لے کر میرے گھر آیا، اور اس زندہ مردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا اس شخص نے جو اس کی دکان پر ملازم ہے بہت سے کپڑے کہیں رہن کر دیتے ہیں جس میں میرے بچوں کے کپڑے بھی شامل ہیں۔

میں نے گردن جھکائے سامنے کھڑے ہوئے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کو دیکھا جس کے چہرے پر پھیلے ہوئے کوڑھ کے سفید دھبے اس کی ڈاڑھی کے سفید سفید بالوں سے زیادہ نمایاں تھے۔

میں نے اس مجرم کو ڈانٹا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ سرخ ٹوئیڈ کی شیروانی پہنے ہوئے کوئی جانی پہچانی صورت میرے دماغ کے گوشوں میں بھٹکنے لگی ۔۔۔ کوئی

مانوس سا چہرہ ذہن میں ابھرا، پھر کہیں جا چھپا۔ کوئی دیکھی بھالی صورت نظروں کے سامنے دھندلائی، اور پھر چمک اٹھی ـــــ پھر کوئی بے تحاشہ میری طرف بھاگتا ہوا آیا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹکا، اور پھر ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کے روپ میں میرے سامنے گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ہائیں۔ کرامت علی ـــ ؟

او رنئے درزی نے کہا۔ یہ پولیس ایکشن کا ستایا ہوا کوڑی کوڑی کو محتاج ہے

اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ عیدگاہ میں سارے مسلمان ننگے ہو کر اللہ میاں کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں، اور کرامت علی عیدگاہ کے باہر ہاتھ میں ٹیپ لیے کھڑا ہے کہ فوری ان کی ستر پوشی کا انتظام کرے۔

میں نے رہن کے پیسے دے کر سارے کپڑے چھڑوائے اور کرامت علی نے میرے گھر پر سلائی کر کے اپنا قرض ادا کر دیا۔

اس کے بعد کرامت علی میرے پاس آتا رہا۔ ایک دن میں نے اس سے کہا کہ میری بیوی کو بہت تکلیف ہو رہی ہے، وہ کسی ماما کو تلاش کرے۔

بہت مشکل سے کرامت علی مجھ سے کہہ سکا "میری بیوی کو ملازم رکھ لیجئے صاحب" اس نے آج تک کہیں نوکری نہیں کی۔ میں اس کو کہیں رکھوانا بھی نہیں چاہتا تھا ـــ لیکن اس گھر کی بات اور ہے وہ یہاں رہ سکتی ہے۔

ہاں کرامت علی نے یہ بھی کہا تھا کہ سودا لانے کے لیے اس کی بیوی کو باہر نہ بھیجا جائے۔ کیوں کہ وہ ایک شریف گھرانے کی عورت ہے، اور سڑک پر مارے مارے پھرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی، اور وہ اپنے دونوں بچوں اور

بیوی کے ساتھ میرے گھر آگیا۔

اپنی بیوی کے بجائے خود کرامت علی سودا سلف لادیا کرتا۔

لیکن جب پڑوس میں سفارش کرکے میں نے اس کو بھی نوکر رکھادیا تو وہ اپنی بیوی کا ہاتھ بٹانے سے معذور ہوگیا۔

ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا ــــــ "اجی تم خود ہی سودا لے آیا کرونا۔ اس میں کیا حرج ہے۔ پسینہ بہاکر روزی کمانا تو عین شرافت ہے، اس طرح کرامت علی اور اس کی بیوی نے شریفانہ کمائی شروع کی تو میاں جانی نے گورے جانی کا بوجھ اٹھالیا۔

ایک دن میاں جانی باورچی خانے میں بیٹھا ہوا گورے جانی کو بہلا رہا تھا، اس کی ماں کچھ سامان لانے کے لیے بازار گئی ہوئی تھی ــــــ گورے جانی نے باورچی خانہ کی دہلیز پر اجابت کردی، تو میاں جانی سوچنے لگا کہ مالکن دیکھیں گی تو بہت برہم ہوں گی اس سے پہلے بھی ایک بار یہی حادثہ پیش آیا تھا تو مالکن نے اس کی ماں سے اس غلاظت کی شکایت کی تھی اور اس کی ماں نے اپنا غصّہ میاں جانی پر اتارا تھا۔ میاں جانی کو وقت کم تھا۔ اس کو بہت جلد کوئی قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ بازار سے اپنی ماں کی واپسی کا انتظار کرنے میں اس کا احتمال تھا کہ یہ بات مالکن کو معلوم ہوجائے۔ کچھ سوچ کر اس نے فوراً ایک کاغذ اٹھایا اور ساری غلاظت کاغذ سے صاف کرکے بہت احتیاط سے ڈرتا ڈرتا صحن میں پہنچا۔ تاکہ مالکن کی نظر بچا کر غلاظت باہر پھینک آئے۔ وہ جب آنگن میں پہنچا تو میری نظر اس پر پڑی۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ کسی چیز کو چھپانے کی کوشش کررہا تھا اور میری موجودگی سے بالکل ناواقف تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ رسوئی گھر سے یقیناً کوئی چیز چراکر باہر لیے جارہا ہے، تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر کھاسکے۔ ٹماٹو، کیری یا

املی یا اسی قسم کی کوئی چیز اس کے ہاتھ میں ہونا یقینی تھا۔ میں نے ذرا تیز آواز سے کہا۔

"ٹھہرو۔ چوروں کی طرح کیا چیز چھپا کر لے جا رہے ہو؟"

میری آواز بجلی بن کر میاں جانی پر گری۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لیکن میرے اصرار پر بھی اس نے اپنا وہ ہاتھ میری طرف نہیں بڑھایا جس میں اس نے کاغذ چھپا رکھا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا تو میاں جانی نے ڈرتے ڈرتے اپنا وہ ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس میں چھپی ہوئی کیری، ٹماٹو یا املی کے دیکھنے کے لیے میں باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ غلاظت میں اٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ فوری چھوڑ دیا۔ مجھے اس وقت اس پر بڑا پیار آ گیا لیکن میں نے اپنے غصّے کو قائم رکھتے ہوئے پوچھا کہ:

"گورے جانی کہاں ہے؟"

میاں جانی نے رسوئی گھر کی طرف اشارہ کیا۔

ساری باتیں میرے ذہن میں جمع ہو گئیں۔ میں نے اس سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "بھاگ جاؤ اور فوراً ہاتھ صاف کر لو۔ بی بی سو رہی ہیں۔ لیکن آئندہ سے اگر تم نے رسوئی گھر کو گندہ کیا تو پھر میں بی بی سے کہہ دوں گا۔"

میاں جانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اتنی ملتجی نظریں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس پر احسان کیا ہے، اور وہ میرا احسان عمر بھر نہیں بھولے گا۔

زمین پر رگڑ رگڑ کر اس نے اپنے ہاتھ کو خوب خوب دھویا۔ اس کے چہرے کو

دیکھ کر میرے لیے یہ معلوم کر لینا بہت آسان تھا کہ کراہت کی وجہ سے وہ بڑے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ تین تین چار چار بار ہاتھ دھونے کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ میاں جانی اپنے اس ہاتھ کو اپنے بدن سے اس طرح دور رکھے ہوئے تھا جیسے غلاظت ابھی تک اس کے ہاتھ کو لگی ہوئی ہے۔ اس دن میاں جانی نے اپنے اس نجس ہاتھ سے کوئی کام نہیں لیا۔

میاں جانی سگریٹ کی خالی ڈبیاں جمع کرتا رہتا۔ لیکن کبھی اطمینان اور فرصت سے بیٹھ کر ان ڈبیوں سے کھیلتے ہوئے میں نے میاں جانی کو نہیں دیکھا۔ کبھی کبھار جب گورے جانی سو جاتا تو وہ ان ڈبیوں سے کھیل لیتا۔ لیکن سگریٹ کی ڈبیوں سے بنی ہوئی اس کی ریل گاڑی دو چار سیٹیاں بجا کر دو چار اسٹیشن ہی چل پاتی کہ گورے جانی جاگ جاتا۔ میاں جانی اپنی ریل گاڑی کے سارے ڈبوں کو الگ کر دیتا اور ریل کے یہ ڈبے سگریٹ کی خالی ڈبیوں کی صورت میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں محفوظ ہو جاتے اور روتا ہوا گورے جانی اس پر سوار ہو جاتا لیکن کئی منٹ تک میاں جانی کے دل و دماغ پر ریل گاڑی قابض رہتی۔ وہ کچھ سوچ کر گورے جانی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتا اور ریل کی سیٹی کی آواز نکالتا، چھک چھک کرتا، پاؤں گھسیٹتا ہوا گورے جانی کو اٹھائے باہر نکل جاتا۔ اس کے باوجود سگریٹ کی خالی ڈبیاں وہ بڑے انہماک سے جمع کرتا رہتا۔

مجھے میاں جانی پر ترس آتا۔ جو چیزیں اس کو حاصل نہ تھیں ان کا تو خیر ذکر ہی کیا لیکن جو چیزیں اس کو حاصل تھیں ان پر بھی اس کو اختیار نہ تھا۔ اس کی غلیل کھونٹی سے ٹنگی رہتی۔ اس کی سگریٹ کی خالی ڈبیاں ٹوکری میں پڑی رہتیں، اور وہ صرف ان کی حفاظت کر کے خوش ہو لیتا۔ صرف اس امید میں رہتا کہ گورے جانی سے جب اسے

نجات ملے گی تو وہ ان سے نہایت اطمینان سے کھیلے گا اور جی بھر کر کھیلے گا۔

یہاں میاں جانی مجھے بالکل اپنی تصویر نظر آتا اور میں سوچنے لگتا کہ میاں جانی میں اور مجھ میں کیا فرق ہے۔ میں جس دفتر میں ہوں وہاں کام کی اس قدر کثرت ہے کہ مجھے دفتر کے اوقات سے ہٹ کر گھر پر بھی فائلیں لانا ہوتا ہے۔ میں جب کبھی نئی کتابیں خریدتا ہوں انھیں الماری میں جما دیتا ہوں یا اپنی میز پر قرینے سے رکھ دیتا ہوں اور ایک لفظ بھی پڑھ نہیں پاتا۔ لیکن کتابوں کو صرف دیکھتے رہنے سے بھی مجھے تسکین ہوتی ہے۔ سوچتا ہوں کہ دفتر سے کبھی فرصت ملے گی تو بڑے اطمینان سے ساری کتابیں پڑھ لوں گا اور اسی امید میں جیتا ہوں۔ اس طرح میرے معاشرے نے مجھ پر بھی ایک گورے جانی کو لاد رکھا ہے لیکن اس کے باوجود میاں جانی کا دکھ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے زخم میرے زخموں سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس لیے کہ میں زندہ رہوں گا تو کبھی نہ کبھی ان کتابوں کو پڑھ ہی لوں گا لیکن میاں جانی زندہ رہے گا بھی تو گورے جانی سے نجات حاصل کرنے تک اس کی عمر زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکے گی جہاں اس کے لیے خالی سگریٹ کی ڈبیوں اور غلیل میں کوئی دلکشی نہ رہے گی اور وہ اپنے ان پسندیدہ کھلونوں سے لطف اٹھائے بغیر زندگی کی موجودہ منزل سے محروم ہی گذر جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کھلونوں سے گورے جانی ہی کھیلے۔

میاں جانی کا کوڑھی باپ قریب قریب روز ہی نشہ کرتا۔ ایک آنے کی خشخاش کی کلیاں خرید کر پانی میں بھیگنے کے لیے چھوڑ دیتا اور رات کو اس پانی کو چھان کر غٹار لیتا۔ بڑی رات کو جب وہ اپنے کام دھندے سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا تو آتے ہی بستر پر پڑ رہنے کی بجائے بیچ آنگن میں کھڑے ہو کر اونگھنے لگتا۔ اس وقت اس کو

دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے جوار کا کوئی سوکھا ڈنٹھل فصل کٹ جانے کے بعد کھیت میں اکیلا بچ گیا ہو، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہا ہو، لیکن طوفان میں اس ایک ڈنٹھل کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔ بڑی رات کو اس کے گھر واپس لوٹنے تک میاں جانی اور گورے جانی سو چکے ہوتے۔ وہ اپنے حصّے کا رات کا کھانا لے کر پہنچتا تو وہ اور اس کی بیوی میاں جانی کو جھنجوڑتے کہ کچھ کھلا پلا کر سلائیں لیکن میاں جانی آنکھیں بند کیے ہوئے ہی چیخنے لگتا کہ "مجھے نیند آرہی ہے۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا۔ میں گورے جانی کو نہیں اٹھاؤں گا"

میرے بچے کی امتحان میں کامیابی پر میں نے اس کو کچھ کھلونے لا دیئے تو اس نے اپنا پرانا لٹو میاں جانی کو دے دیا۔ میاں جانی کے لیے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی باچھیں کھل گئیں لیکن فوراً ہی میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے جگنو بجھنے لگے اور وہ گورے جانی کو اپنے ہاتھ اور کولہے کے سہارے لٹکائے ہوئے لٹو کو بڑی حسرت سے گھورنے لگا۔ اس دن میاں جانی کو اس کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ دل بھر کر اپنے لٹو سے کھیل سکتا۔ میرے بچے کے لٹو سے اپنے لٹو کا مقابلہ کر سکتا۔

دوسرے دن صبح کو جب اس کی ماں بازار گئی ہوئی تھی تو میاں جانی، گورے جانی کو لے کر کہیں غائب ہو گیا۔ دوپہر تک سبھوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا ہے لیکن جب وہ دوپہر کو بھی نہ آیا تو اس کی ماں اس کے باپ سے پوچھ آئی۔ جب اس نے لاعلمی ظاہر کی تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میاں جانی محلے ہی میں کہیں گورے جانی کے رونے اور چلّانے سے بے نیاز ہو کر اپنا لٹو گھما رہا ہو گا اور گورے جانی اس کے پاس ہی کہیں بیٹھا چیخ چیخ کر احتجاج کر رہا ہو گا۔ مجھے میاں جانی کی اس باغیانہ حرکت سے

ایک حد تک سکون ہوا، اور میں نے طے کر لیا کہ شام کو وہ گھر لوٹے گا تو میں پوری طرح اس کی حمایت کروں گا اور اس کو پٹائی سے بچا لوں گا۔

میاں جانی نے چوں کہ زندگی میں پہلی بار اس قسم کی بغاوت کی تھی، اس لیے اس کی ماں کچھ متفکر سی رہی اور اس کا باپ بھی اس کو آس پاس ہی دیکھ آیا۔

شام ہوئی تو میاں جانی اپنے کولہے پر گورے جانی کو لٹکائے دبے پاؤں اپنے گھر میں چلا آیا۔ میں نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی، اور آئندہ ایسی حرکت سے باز رہنے کی تاکید کی، اور اس کی ماں نے بھی میری نظر بچا کر اس کی گوشمالی کی۔ اس پر ان ساری باتوں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ کچھ دیر منہ پھلائے وہ کھڑا رہا، اور گورے جانی کو ماں کی گود میں دودھ پیتا ہوا دیکھ کر اپنے کھانے کا مطالبہ کرنے لگا۔ بھوکا ہونے کے باوجود میں نے دیکھا وہ بہت مطمئن تھا۔

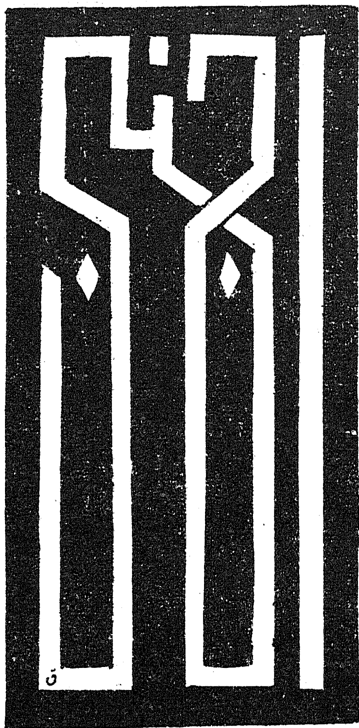
دوسرے دن میاں جانی اپنا لٹو اور غلیل لے کر پھر غائب ہو گیا اور اب کی بار گورے جانی کو بھی اس نے اپنے ساتھ نہیں لیا۔ دن بھر گورے جانی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھاتا رہا۔ اس کی ماں منٹ دو منٹ اس کو پچکار کر پھر اپنے کام دھندے میں مصروف ہو جاتی ــــ ماں کو سامنے چلتا پھرتا دیکھ کر گورے جانی کی نظریں اس کا احاطہ کیے رہتیں۔ لیکن جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تو گورے جانی زور زور سے رونے لگتا ــــ گود میں آنے کی غرض سے اس کے ہاتھ اٹھتے تو بے سہارا ہی رہ جاتے۔ آج میاں جانی کا دامن گورے جانی کے آنسوؤں کو خشک کرنے کے لیے نہ رہا تو کسی دامن نے بھی اس کے آنسو جذب نہ کیے۔ وہ جس قدر رو سکتا تھا روتا رہا۔ میاں جانی کو تلاش کرتی ہوئی اس کی منتظر نظریں جب تھک گئیں تو نیند نے اس کو سہارا دیا۔ لیکن وہ تھوڑی دیر بعد

پھر تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھا، اور نہایت اطمینان سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ اس نے ریاض شروع کر دیا۔ اس کی ماں میاں جانی کو بددعائیں دیتی رہی۔

اس بار میاں جانی دن ڈھلنے کے بعد ذرا تاخیر سے گھر لوٹا ــــ مجھے اطلاع ملی تو میں سمجھ گیا کہ آج اس کی بہت پٹائی ہوگی۔ کیوں کہ میں کسی کام سے باہر جا رہا تھا اور میری عدم موجودگی میں اس کے ماں باپ بہت فراخدلی سے اس کو پیٹ سکتے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب میں گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ میاں جانی کی جلتی ہوئی لکڑی سے تواضع کی گئی ہے اور اس کو رات کا کھانا بھی نہیں دیا گیا۔

صبح ہوئی تو اسے ناشتہ بھی نہیں دیا گیا ــــ مجھے بھی اس کا خیال نہ آیا۔ دن ڈھلے مجھے معلوم ہوا کہ میاں جانی کی ماں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی شکایت مجھ سے کیے بغیر اپنا لٹو اور غلیل چپ چاپ جلا دے تو وہ اس کو کھانا دے گی، ورنہ نہیں ــــ اور میاں جانی نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی۔

میں لپک کر باورچی خانے میں پہنچا تو دہکتے ہوئے چولہے میں میاں جانی کا لٹو اور غلیل جل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے تھے اور وہ دہکتے ہوئے شعلوں کو چپ چاپ تکتا ہوا تیز تیز نوالے اٹھا رہا تھا



کیسا عجیب تھا نیا ماسٹر۔ ابّا کے سامنے آتا تو بالکل اس طرح اینٹھتا جیسے خشک کباب کو آگ پر رکھ دیا گیا ہو۔ شام ہوتی تو لان پر کرسیاں بچھ جاتیں۔ بیچوں بیچ ابّا کی ڈِک چیر ہوتی۔ ملاقاتیوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈائی بھیجی جاتی۔ عین اسی وقت سبز و شاداب ترلشتے ہوئے پودوں کی باڑ کے پاس نیا ماسٹر کچھ اس عالم میں کھڑا ملتا جیسے اس کا دوسرا قدم اس کو سیدھے دار تک لے جائے گا۔

ابّا کی نظر پڑتی اور وہ اپنی بارعب آواز میں اس کو بلا لیتے ــــــ "آیئے ماسٹر صاحب آیئے۔"

ماسٹر صاحب اس طرح ابّا کی طرف بڑھتے جیسے ان پر "ہپناٹیزم" کا عمل کیا گیا ہو۔ بالکل بے جان سے جیسے دل و دماغ سے عاری ہوں، اور پھر۔ ابّا کے قریب پہنچتے پہنچتے تک جیسے مڑ تڑ کر ٹوٹتے رہتے۔ شیروانی کے دامن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اپنی رانوں میں دبائے ہوئے، ایک ہاتھ سے پھٹے ہوئے کالر کے ہک لگانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اوپر اٹھائے ہوئے

زبان کو کبھی دانتوں میں دبائے، کبھی جبڑوں میں اس طرح ٹھونسنے ہوئے جیسے کسی نے گلوری دبا رکھی ہو اور باہر سے گال پھولے پھولے نظر آئیں۔

"بیٹھے بیٹھے پان تھوک کر شربت تو پی لیجیے۔ بانس کے بدون کا بنا ہوا کوئی پُتلا قسم کا آدمی۔ بے یار و مددگار، مسحور و خائف اس طرح کرسی پر بیٹھ جانا جیسے کسی نے سر پہ ہاتھ رکھ کر اتنی قوت سے دبایا ہو کہ پاؤں جواب دے گئے۔ گلاس پر انگلیوں کی گرفت کچھ اس طرح رہتی جیسے گلاس توڑ کر انگلیاں لال لال شربت خود پی جانا چاہتی ہوں شربت کچھ اس طرح پیتا جیسے جنم جنم کا پیاسا پانی پی رہا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ آپا پان... لینے کے لیے کہیں۔ ان سے نظریں ملائے بغیر دوہرا ہو کر کورنش بجا لاتا۔ پتلی پتلی اکڑی ہوئی انگلیاں جوار کے سوکھے ڈنٹھ کی طرح جیسے ہوا میں جھولتیں۔

منی نے پہلی بار اس کو آپا کے سامنے کھڑا ہوا دیکھا تو دل ہی دل میں اس نے طے کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اس نئے ماسٹر کے پاس بہرحال نہیں پڑھے گی۔ وہ ہنسی ہو کر امی سے کہنے لگی۔ "امی اسکوفٹس آتے ہیں۔ اپنی نوربی کا کلّو ہے نا امی بس بالکل اس کی طرح نیا ماسٹر کھڑا کھڑا اینٹھتا ہے۔"

"لو جی، یہ کہاں سے ٹرا جھبرا اٹھا لائے تمھارے آپا۔" امی کچھ اس طرح کہتیں جیسے نیا ماسٹر کسی پرانے سامان کی دکان سے دستیاب ہو گیا ہو۔ سبھی منی کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ لیکن جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو جیسے وہ آدمی کوئی اور تھا جو نئے ماسٹر کے ساتھ ساتھ اس کو کمرے تک پہنچانے آیا تھا۔ بالکل اطمینان سے ہم بچوں میں بیٹھا ہوا ہنس بول رہا ہے، نہایت تمکنت سے کتابیں اُلٹ پھیر کر دیکھ رہا ہے۔ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے۔ "دیکھو بھئی، ہم تمھارے ماسٹر نہیں ہیں، ہم تو دوست ہیں تمھارے۔

"لو جی،" مشو میاں سوچنے لگے۔ "یہ تو دوست بننے آئے ہیں۔ بنا ہی لیں گے دوست، تب پتہ چلے گا۔" اور انھوں نے اپنے ذہن میں دوست بنانے کے پروگرام پہلے بنانے شروع کیے۔

"لو جی، کس کھلنڈرے لڑکے کو پکڑ لائے ہو۔ بچّوں سے کہہ رہا تھا کہ ہم تمھارے ماسٹر نہیں دوست ہیں۔" امی نے ابّا سے شکایت کی۔

"صدر مدرس صاحب نے بہت تعریف کی۔ کہتے تھے کہ اس کے تفویض جتنی جماعتیں کی گئی ہیں سب کے نتائج اچھّے رہتے ہیں۔ بڑا محنتی اور ذہین نوجوان ہے۔

"بھئی خوب نوجوان پسند کیا آپ نے، بوڑھوں کو منہ چڑھاتا ہے موا۔ ذہانت بھی ایسی کہ دیکھتے ہی آدمی ذہن کا اندازہ لگا لے اور مارے خوف کے چیخ اٹھے۔ پتہ ہے آپ کو منی مجھ سے چمٹ گئی تھی۔ دھائیں دھائیں رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ کلّو کی طرح نئے ماسٹر کو فنٹس آتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے بچوں کے بیچ میں لمبا ہو کر لگے گا خیں خیں کرنے۔

ابّا بے اختیار ہنس پڑے۔ منی کو پکڑ کر گود میں اٹھا لیا، جو امی کے پیچھے کھڑی ٹکر ٹکر ابّا کی صورت دیکھے جا رہی تھی۔ وہ منی کا منہ چومتے رہے اور ہنستے رہے۔ "منّی نے اُن کو مجھ سے ملتے آتے وقت دیکھا ہو گا۔"

"ہاں مشو کہہ رہا تھا کھڑی چپ چاپ تکتی رہی اس کو پھر بغیر کچھ کہے سنے ایک دم وہاں سے بھاگی تو مجھ سے چمٹ کر دم لیا۔

ابّا پھر ہنسے۔ "بھئی اس کو چلتے ہوئے دیکھ لیا ہے نا بٹیا نے۔"

امی بھی ذرا سا مسکرا دیں۔ "آپ نے کہہ کیوں نہ دیا کہ نیا ماسٹر آنے لگے تو بچوں کی آنکھوں پر کس کر پٹیاں باندھ دی جائیں۔ بھئی خوب پسند ہے آپ کی۔" اور امی کو تو نیا ماسٹر

ایک آنکھ نہ بھایا۔

لیکن پہلے ہی دن نئے ماسٹر نے ہم سب کو رجھا لیا۔ منی البتہ اس روز نہ آنا تھی نہ آئی جب وہ جانے لگا تو ٹوپی سر پر اوڑھتے ہوئے اس نے کہا۔ بابا ذرا دیکھو تو لینا۔ آبا باہر ہیں یا اندر چلے گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اتنا جلد اندر نہیں جاتے اور پھر بات کرنے میں ان کی آوازیں بھی تو صاف سنائی دے رہی تھیں۔ چنانچہ میں نے جھٹ سے اپنی آگہی کا ثبوت دیا۔

ہاں بھئی۔ آواز تو آرہی ہے۔ لیکن اچھے بچے اپنے ماسٹر کی بات فوری مان لیتے ہیں۔" یہ پہلے دن بہت ہی نرم قسم کی تنبیہ تھی۔ میں نے محسوس کیا اور فوری کمرے کے دروازے تک بڑھ کر آبا کو دیکھ آیا۔

"ہیں ماسٹر صاحب"

"اکیلے ہیں یا دوسرے بھی کچھ لوگ ___"

اور میں نے بات کاٹ دی۔" جی ہاں اور لوگ بھی ہیں۔"

"اچھا بابا، آبا دیکھ کس طرف رہے ہیں؟ ان کا چہرہ اس طرف ہے یا پیٹھ۔"

میں نے آبا کو زندگی میں لاکھ بار دیکھا تھا۔ ان کو چھوا تھا، ان کو پیار دیئے تھے پیار کیا تھا، جب ذرا اور چھوٹا تھا تب باہیں گلے میں ڈال کر اپنے پیر زمین سے اٹھا لیے تھے اور جھولتا رہا تھا۔ لیکن اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی پیٹھ اس طرف ہے تو چہرہ اس طرف ہونا چاہیئے۔ لوگ بات کر رہے ہوں تو ان کو اونگھنا چاہیئے ماسٹر جا رہا ہو تو ان کو باہر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ماسٹر صاحب کے جانے سے ان کے ادھر ادھر دیکھنے کا کیا تعلق ہے۔ میں یہی سب کچھ سوچتا رہ گیا تو اس نے پھر مجھ سے کہا۔

"باباذرادیکھ تولیناکہ آباکس طرف......"

میں نے دیکھ کر کہا کہ ان کا چہرہ اُس طرف کو ہے اور وہ مہتمم صاحب پولیس سے باتیں کر رہے ہیں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ جیسے یہ سن کر کھل اٹھا۔

ٹوپی اوڑھی، سہمے ہوئے سے، ڈرے ہوئے سے، سیڑھیوں تک پہنچے۔ پلٹ پلٹ کر دو تین بار آبا کی طرف دیکھا۔ اچھی خاصی ٹوپی کو پھر سے درست کیا۔ شیروانی کے دامن کو پتلی پتلی انگلیوں کی گرفت میں لے کر اپنی رانوں میں اڑس لیا۔ زبان دانتوں میں دبالی پھر فوری جیسے گلوری گال میں دبا کر گال پھلا لیے، پھر مڑ تڑ کر کن کھاتی ہوئی پتنگ کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بارہ کی طرف لپکے جیسے اب گر پڑیں گے اب گر پڑیں گے اور ابا کے سامنے ہی دیکھتے کے دیکھتے ایڑیاں رگڑ کر مر جائیں گے۔ کیسا عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہم کو پڑھانے کے بعد ہمارا ماسٹر... دروازے تک گیا۔ اور وہاں سے کسی دوسرے ہی آدمی کو ابا کے آگے ڈھکیل کر خود بڑے اطمینان سے جیسے پیچھے ہٹ آیا۔ بالکل نیا اور اجنبی سا کوئی شخص ہمیں باہر نظر آتا، جو دروازے تک ہمارا ماسٹر ہی تھا۔ لیکن اب جانے کون ہو ہم تو نہیں جانتے تھے اس کو۔

منی پر نہ امی نے جبر کیا نہ ابا نے۔ ہاں ہم سب سے جب اس نے نئے ماسٹر کی تعریف سنی تو اس کی ہمت بندھی، آپا کی انگلی تھامے دروازے تک آ کر تانک جھانک کرنے لگی پھر آہستہ آہستہ دروازے کی دراز سے نئے ماسٹر کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی۔ دونوں میں اسی طرح مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا، اور ہم سب کے سب منی کو نئے ماسٹر سے قریب کرنے کے لیے گویا اس کی مدد کرتے اور کچھ دیر پڑھنے لکھنے کی بوجھل بوجھل سی فضا منی کی آمد سے مسکراہٹوں اور تفریح کی نظر ہو جاتی، جو ہمارے لیے ایک وقتی نعمت سے

کم نہ ہوتی۔

ماسٹر پسند آ بھی جائے تو ساری کی ساری کتابیں کیسے پسند آجائیں گی، اور پھر حساب میں تو میں ٹھس تھا۔ سو منی کی آمد ہم سب کے لیے اہمیت کی حامل ہوتی۔

منی اب اکیلی بھی دروازے تک آنے لگی پھر کمرے میں بھی اس نے قدم رکھا۔ پھر نئے ماسٹر کی گود تک آ پہنچی۔ پھر روزانہ ہمارے ساتھ بولتا قاعدہ اور رنگ برائمر بغل میں دابے وہ ماسٹر صاحب کے پاس آنے لگی۔ اب ظاہر ہے کہ منی میں ہمارے لیے کوئی دلکشی باقی نہ رہی۔ لیکن ہم کبھی نئے ماسٹر سے بور بھی نہیں ہوتے۔ اس میں پتہ نہیں کہ کون ایسی خوبی تھی ـــ نئی نئی دلچسپیاں ہمارے لیے پیدا کر دیتا۔ اس نے کوئی بات نصیحت کرنے کے انداز سے کی ہی نہیں۔ شرارت کی بھی تو مارنا تو رہا ایک طرف ڈانٹ تک اس نے نہ بتائی۔ کچھ عجیب سی آنکھوں سے منٹ بھر تکتا رہتا۔ پھر بہت نرمی سے کہتا "جاؤ اب پڑھنے سے جی اچاٹ ہو چکا ہے تو تھوڑی دیر کھیل لو، اور ہاں تم دن میں شاید بہت کم کھیلتے ہو اور پڑھنے میں بہت وقت لگا دیتے ہو۔ دن میں جی بھر کر کھیلنا چاہیے تاکہ میری موجودگی میں دل لگا کر پڑھ سکو۔ جاؤ تھوڑی دیر کھیل لو۔" لیکن میں جانے سے انکار کرتا۔

مشو میاں نے کتاب کا ورق ورق الگ کر رکھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے مشو میاں کو کچھ نہیں کہا۔ لگے کتاب ہی کی برائی کرنے۔ کہنے لگے اتنی بری جلد ہو تو بھلا ورق ورق الگ نہ ہوگا۔ وہ تو مشو میاں نے اس قدر احتیاط سے رکھا ورنہ ساری کتاب تل سنکرات کے کٹے ہوئے پتنگ بن کر ہواؤں میں بکھرتی رہتی۔ جھٹ سے انھوں نے کتاب کو سی سلا کر کور اس پر چڑھایا۔ الٹی سیدھی تصویر اس پر بنائی، شوخ و شنگ رنگ بھرے

اور مشومیاں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں ماسٹر صاحب کی بنائی ہوئی تصویروں کی مشومیاں کتنی قدر کرتے ہیں۔ مشومیاں نے نئی جماعت میں ترقی کی تو بھی کتاب جوں کی توں رہی۔

دل ہی دل میں ہم سب نئے ماسٹر کو چاہنے لگے اور نئے ماسٹر نے ہماری محبت کا خوب خوب فائدہ اٹھایا کوئی دن ایسا نہ گذرتا جو ہم سارے کا سارا ہوم ورک خوشی خوشی نہ کر دیتے۔ "غنچہ" "پھول۔ پیام تعلیم۔ سب ہی رسالے ابا کے پاس عریضہ لکھ کر ماسٹر صاحب نے جاری کروا دیئے۔ کتنے شوق سے ہم یہ رسالے پڑھتے۔ ماسٹر صاحب کبھی کوئی کہانی کبھی کوئی نظم پر نشان کر دیتے کہتے کہ ہم غور سے پڑھ کر اپنی رائے لکھ رکھیں۔ مشومیاں اور میں اپنی اپنی رائیں ایک دوسرے سے چھپا کر لکھ رکھتے۔ اپنے ہوم ورک میں یہ اضافہ ہمیں بہت بھلا لگتا۔ ابا نے منگوانے کو تو سارے پرچے منگوا لیے لیکن ہمیں انہماک سے پڑھتا ہوا دیکھ کر وہ کچھ زیادہ خوش نہ ہوتے۔ ایک دن کہنے لگے کہ بھئی تم لوگ اپنی کورس کی کتابوں پر زیادہ وقت دیا کرو۔ ہم دبی زبان سے انھیں سمجھاتے کہ ہم نے سارے کا سارا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ رہ گئے یہ رسالے سو وہ لفظ لفظ چاٹ لینے تک ہمیں چین نہ پڑتا۔ لیکن یہ بات ابا سے کس طرح کہی جا سکتی تھی۔

بلّی کو دودھ سے بھری ہوئی پیالی تک پہنچانے کے لیے جن بھول بھلیوں سے گذارنا تھا وہ نہ مجھ سے ہوا اور نہ مشومیاں سے۔ "پیام تعلیم" کے آخری صفحے پر بنے ہوئے اس خاکے کو تکتے تکتے ہماری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ انگلی کو کاغذ پر گھما کر کچھ دور تک ہم بلی کو لے جاتے کہ راستہ آگے کے لیے نہ ملتا۔ اور ہماری پوسی رانی گویا دودھ کے لیے تڑپ کر رہ جاتی اب ماسٹر صاحب آئیں تب ہی دودھ ملے اور پیٹ بھرے پوسی رانی کا۔ ماسٹر صاحب پوسی رانی کی دودھ کی پیالی تک پہنچنے میں مدد کر ہی رہے تھے کہ منی کی آپا نے آکر کہا۔

"ابّا نے کہا ہے کہ ماسٹر صاحب جانے سے پہلے ضرور ملتے جائیں۔"

ماسٹر صاحب جیسے دودھ کی پیالی تک پہنچنے کا راستہ خود بھول گئے تھے۔ آپا کہہ کر چلی گئی۔ لیکن ادھ کھلے دروازے کی دراز کو وہ اس طرح گھور رہے تھے جیسے آپا کا چہرہ اب تک تک رہے ہوں۔ ان کا جی دیکھتے کے دیکھتے اچاٹ ہو گیا۔ کدھر میٹھی میٹھی باتیں کرتے۔ ہنستے بولتے پوسی رانی کو دودھ کے پیالے تک پہنچانے کی فکر میں تھے کدھر "ابّا" کا پیام سن کر جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ایسا احساس ہوا جیسے آپا کے ساتھ ماسٹر صاحب بھی کہیں چلے گئے ہیں اور ہمیں اس آدمی کے حوالے کر گئے ہیں جو روز شام کو دو وقت آتے اور جاتے ابّا کے آگے سے گذرتا ہے۔ جو ہمارا ماسٹر نہیں ہے بلکہ کوئی اجنبی ہے جس کو ہم صرف آتے اور جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

مشّو میاں نے کہا "ماٹ صاحب وہ جو "پھول" میں ایک نظم ہے نا ——— وہ ——— وہ جس کا عنوان ہے:"

لیکن ماسٹر صاحب کن کھائے پتنگ کے مانند خلاؤں میں کہیں ڈول رہے تھے۔ مشّو میاں کی بات جیسے ان کے اپنے کانوں ہی میں رس ٹپکا کر رہ گئی تھی۔

"ماٹ صاحب ——— وہ جو ——"

لیکن جیسے ابّا کے سامنے سے گذرنے والے اجنبی نے پوچھا، "بابا" ابّا نے کیوں ملنے کو کہا ہوگا؟"

"امّی کہہ رہی تھیں کہ کل جن لوگوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے، ان میں ماسٹر صاحب بھی شامل ہیں۔" میں نے امّی سے سنی ہوئی بات دہرا دی لیکن ماسٹر صاحب مطمئن نہ تھے۔

اجنبی

"آج کچھ کہا تھا کیا ابّا نے ؟"

"ہاں ماسٹر صاحب ـــــ" مشو میاں جھٹ سے بولنے لگے۔ لیکن میں نے انکشافات کا سہرہ اپنے سر لینے کے لیے کہا۔ "ابّا کہہ رہے تھے کہ ہم کورس کی کتابیں چھوڑ کر کہانیوں اور نظموں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

کٹ کھایا ہوا پتنگ جیسے غوطہ کھا کر زمین پر سکڑ کر بل بیٹھ گیا۔

"بابا، کیا ابّا نے رسالے پڑھنے سے منع کیا تھا؟"

"نہیں ماسٹر صاحب ـــــ" میں نے اور مشو میاں نے بیک آواز کہا۔

"پھر کیا کہا تھا آخر؟"

ہم نے وہی باتیں دہرائیں۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ماسٹر صاحب کچھ بھی نہ سن سکے تھے۔ اس لیے کہ وہ پھر اس اجنبی کو ہمارے نرغے میں چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے پڑھائی ختم کر کے وہ اٹھنے لگے تو مجھ سے کہا۔ "بابا، ذرا دیکھنا تو ابّا اکیلے ہیں یا اور بھی کوئی ہے"۔

میں نے سیڑھیوں پر پہنچ کر دیکھا تو دو ایک آدمی اور بھی تھے ـــــ جو میں نے ماسٹر صاحب کو بتا دیا۔ انھوں نے بالکل ایک بے جان لکڑی کے پتلے کی طرح کمرے سے باہر قدم نکالا، بالکل اس طرح ابّا کی جانب بڑھے جیسے دبے پاؤں ان تک پہنچ کر ان پر حملہ کر دیں گے۔ نہیں میں نے غلط کہہ دیا۔ حملہ کرنے کے ارادے کے پیچھے کس قدر خود اعتمادی رہتی ہے۔ یہاں تو ماسٹر صاحب ابّا کے حملے سے بچنے کی فکر میں تھے۔

بانس کے بدوں کا بنا ہوا کوئی پتلا قسم کا آدمی بے یار و مددگار مسحور و خائف آٹھ دس گز کا فاصلہ طے کرنے تک مڑ تڑ کر ٹوٹتا رہا۔ شیروانی کے دامن کو چٹکی میں پکڑ کر رانوں میں دبائے پھٹے ہوئے کالر کا ہک لگانے کی ناکام کوشش میں جوار کے سوکھے

سہمے ہوئے ہیں پچانے وہ ابّا کے آگے مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا، پھر ان کے اشارے پر اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے مداری کے اشارے پر بندر یا چھوٹی سی ٹپائی پر ٹک جاتی ہے۔

آبانے یقیناً انھیں دوسرے دن دعوت میں آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں برآمدے میں کھڑا ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔ سب کچھ تو میرے پلے نہ پڑا۔ ہاں اتنا ضرور سمجھ سکا کہ ابّا رسالوں میں ہماری غیر معمولی دلچسپی کے تعلق سے ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں میں چاہتا تھا کہ ہمارا ماسٹر دل کھول کر ابّا سے باتیں کرے۔ انھیں وہ ساری باتیں سمجھائے جو ہمیں سمجھاتا ہے۔ وہ صاف صاف کہہ دے کہ ابّا ان معاملات میں دخل نہ دیں جیسے وہ کئی بار ہمارے سامنے کہہ چکا تھا کہ صدر مدرس صاحب کے بچّوں کو اس نے صرف اس لیے پڑھانا چھوڑ دیا کہ وہ بے سبب دخل درمعقولات کرتے تھے لیکن اس نے ابّا سے کچھ نہ کہا۔ یہ تک نہ کہا کہ ہم لوگ اپنا ہوم ورک برابر کر لیتے ہیں۔ کبھی ادھورا نہیں چھوڑتے اور صرف ان رسالوں ہی کے ہو کر نہیں رہ جاتے، اور پھر ان رسالوں کی مدد سے اس نے ہم میں نہ صرف پڑھنے کا شوق پیدا کیا تھا بلکہ اتنی بصیرت پیدا کی تھی جو ہماری عمر کے بچّوں میں نہیں ہو سکتی۔

مجھے ماسٹر صاحب کی اس خاموشی اور بزدلی پر جہاں غصّہ آیا وہیں بے پناہ ہمدردی بھی ہوئی۔ ہمدردی اس لیے کہ ابّا کے آگے ہمارا ماسٹر موجود ہی نہ تھا۔ وہاں تو وہی اجنبی تھا۔ جو روز شام کو در و دیوار للن کے آگے سے سہما سہما سا گذرتا ہے

دوسرے دن سارے کے سارے پرچے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اور منّو میاں اور کچھ دور روز بالکل اداس رہے، پڑھنے میں جی ہی نہ لگتا۔ اب یہ رسالے ہمیں

اُجلی پرچھائیاں

اجنبی

ہفتے میں صرف ایک دن ملنے لگے۔ نیا ہفتہ شروع ہوتا تو ہم نئے شمارے کی آمد کے منتظر رہتے۔ لیکن اگلی بار نیا شمارہ بھی غائب تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب آئے تو معمول سے کچھ زیادہ ہی خوش خوش تھے۔ غنچے کا نیا شمارہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں اور مشو میاں جھپٹے تو انھوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر رسالے کو ہماری پہنچ سے دور کر دیا۔ کہنے لگے کہ آج تو ہم دونوں ہی سے مٹھائی کھائیں گے۔ لیکن یہ بات انھوں نے کچھ اتنے دھیمے سر میں کہی جیسے خوشی کی نہیں غم کی خبر سنا رہے ہوں۔ ان کے چہرے پر جیسے نامعلوم خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے ان دنوں تو کم کم ہی محسوس ہوئیں۔ لیکن آج خیال کرتا ہوں تو اس کرب کی شدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اس خوف نے ہمیں بھی سمجھا دیا کہ چیخ چیخ کر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ذرا سی خیال کہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا مژدہ سنانے والے ہیں۔ اور اسی لیے بہت بے چین تھا۔

میں نے اچھل کر ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے نیا رسالہ چھین لینا چاہا تو انھوں نے مجھے جھک کر سینے سے لگا لیا۔ پھر خود ہی کچھ ورق الٹ کر رسالہ میری طرف بڑھا دیا۔ علانیہ میرا نام جیسے چمک رہا تھا۔ میری کہانی چھپ چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ رسالہ اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ ناچتا، اچھلتا بھاگتا بھاگتا ابا کے پاس جاؤں، امی سے چمٹوں، انھیں بتاؤں کہ میرا نام چھپ کر آیا ہے۔

مشو میاں الگ اچھل پڑے ان کی پہیلی بھی چھپ چکی تھی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو پرچہ انھوں نے ہمیں دے دیا۔ کہنے لگے "ابا اور امی سے چھپا کر پڑھنا اور ابھی انھیں بتلانا مت۔

اس قسم کی مجبوری خدا نہ دے کسی کو۔ اپنا کارنامہ کسی مذموم فعل کی طرح چھپاتے پھرنا وہ بھی اس عمر میں جو بجائے خود کارنامہ ہی کارنامہ ہو۔

دل پر وہ بیتی ہے کہ آج اس شدت احساس کا اعادہ مشکل ہے۔ رسالہ بند کرنا تو مشو میاں جھپٹ پڑتے۔ مشو میاں جھپٹ پڑتے تو جھٹ سے بند کیے ہوئے رسالے کو کھول کر جہاں میری اپنی انگلی پہلے ہی سے بطور تبرک محفوظ رہتی میں اپنا نام پھر ایک بار دیکھ لیتا جو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے روشنائی سے نہیں روشنیوں سے لکھا گیا ہے۔

کتنی بار دل پر سیج پائی ہے۔ وہ تو جیسے قسم کھائے بیٹھا تھا کہ ماسٹر صاحب خواہ بُرا مانیں یا روٹھ جائیں لیکن اس قسم کی مہمل پابندیوں کو اپنے پر عائد نہیں کریگا دل ہی تو تھا وہ بھی ننھا منا سا۔ ابا بھلا بُرا کیوں مانیں گے۔ کلاس میں تو سب ہی پاس ہوتے ہیں۔ اس طرح کہانی تو ہر ایک کی نہیں چھپتی نا ۔۔۔ لیکن میں کچھ بھی تو نہ کر سکا۔ کوئی چپکے سے کانوں میں کہتا ۔۔۔ ابا اور امی سے چھپا کر پڑھنا۔ ابھی انھیں بتلانا مت ۔۔۔ ابا اور امی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی انھیں بتلانا مت۔

دل میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں تو اس کی جوت کم سے کم چہرے پر تو دیکھی جا سکتی ہے نا۔ لیکن یہ جوت کسی نے نہیں دیکھی۔ میں نے ہمت کی۔ پرچہ اپنے ہاتھ میں تھامے بے وجہ امی اور ابا کے آگے سے سو بار گذرا ہوں۔ کن انکھیوں سے میرے ہاتھ میں پرچے کو دیکھ کر انھوں نے دانستہ ہی اس ضمن میں کچھ پوچھنے سے گریز کیا۔ جی کس کس طرح چاہا ہے کہ امی جھوٹ موٹ پوچھ لیں کہ ہاتھ میں کیا ہے اور میں انھیں جھٹ کر بتلاؤں کہ ہاتھ میں پرچہ ہے اور پرچے میں میرا نام ہے۔ لیکن ابا یا امی نے ایسی کوئی بات ہی نہ کی۔

ابا اٹھ کر سونے کے لیے جب اپنے سونے کے کمرے میں جانے لگے تو میں

بھی کچھ اس طرح اپنے بستر تک پہنچا جیسے کسی غمخوار کے سینے پر سر رکھنے کی خواہش کے آگے مجبور ہو گیا ہوں۔ چپکے سے لیٹ گیا تو پتہ نہیں کیوں میرا تکیہ میرے آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ لیکن میں نے دوسرے دن یہ بات ماسٹر صاحب سے نہیں کہی حالانکہ اب دل یہ چاہنے لگا تھا کہ تکیے میں سر دے کر اپنے کار نامے پر سسکنے کا حال ماسٹر صاحب کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے۔ دل بیک وقت کتنا چالاک اور مورکھ ہے۔ آج سوچتا ہوں تو صرف اس عمر پر پیار نہیں آتا ساری انسانی فطرت پر پیار آتا ہے۔

دوسرے دن جب ماسٹر صاحب نے پرچہ واپس لے جانے کے لیے مانگا تو میرا جی چاہا کہ ان سے لپٹ کر پھر رو پڑوں اس طرح گئی رات کا راز بھی ان پر افشا ہو جائے گا اور پھر ان کی ساری ہمدردیاں اگ۔ سمیٹ لوں گا۔ لیکن یہ آنسو بھی عجیب سی شئے ہیں۔ بعض وقت اس طرح جُل دے جاتے ہیں جیسے ہم سے آشنا ہی نہ تھے۔ لیکن ماسٹر صاحب نے خود ہی کچھ محسوس کیا اور کہا کہ ایک دن اور میں پرچہ اپنے پاس رکھوں۔

اسکول میں سالانہ امتحانات قریب میں ہونے والے تھے۔ ہمیں اس امتحان سے کچھ لینا دینا نہ تھا کیوں کہ ابّا ہمیں آئندہ سال اسکول میں شریک کروانے والے تھے۔ بیٹھے بٹھائے ماسٹر صاحب نے میری نوٹ بک سے ایک کاغذ نکالا اور لگے عرضی گھسیٹنے۔ لکھ چکے تو جاتے ہوئے میرے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ ابّا کو دے دینا ابّا باہر لان ہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ پانی کا چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ ہوا میں مٹی کی کچھ سوندھی سوندھی سی بو تھی۔ ماسٹر صاحب کے جاتے ہی خوب خوب کھیلنے پر طبیعت مائل تھی۔ مجھے ایک لمحہ بھی ضائع کرنا پسند نہ تھا۔ اچانک ماسٹر صاحب کی

عرضی پہنچانا۔ ان کے پڑھنے تک ادب سے کھڑے رہنا پھر ان کا جواب ماسٹر صاحب تک پہنچانا۔ میں نے سوچا، صاف صاف کہہ دوں کہ ماسٹر صاحب آپ خود ابّا سے مل لیجیے نا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں۔ سیڑھیوں تک آتے آتے ہمارے ماسٹر صاحب غائب ہو چکے تھے اور ابّا کے آگے گن کھائے ہوئے پتنگ کی طرح کوئی اجنبی ڈول رہا تھا۔ بالکل بے جان سا۔ جیسے دل و دماغ سے عاری ہو۔ سُڑ سُڑ کر ٹوٹتا ہوا۔ دائیں کندھے کو نیچے جھکا کر بائیں کندھے کو اوپر اٹھائے ہوئے۔ اف یہ کیسی عجیب سی بات تھی۔ وہ یقیناً ہمارا ماسٹر نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں آج بھی نظروں سے اوجھل ہونے تک اس اجنبی کو دیکھتا رہا۔

میں نے ماسٹر صاحب کی عرضی امی کے حوالے کی کہ ابّا اندر آئیں تو وہ انھیں دے دیں، اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھیلنے چلا گیا۔

رات کو ابّا اندر آئے تو میں ساری باتیں بھول بھال کر اپنا ہوم ورک کر رہا تھا اور اس بات سے بالکل ناواقف تھا کہ ابّا اور امی مسکرا مسکرا کر بڑی محبت سے میری طرف دیکھ دیکھ کر میرے ہی تعلق سے باتیں کر رہے تھے۔ ابّا نے مجھے پکارا تو میں چونکا جب میں قریب گیا تو وہ کہنے لگے "تمھیں کچھ پتہ ہے کہ تمھارے ماسٹر صاحب نے کیا لکھا ہے؟"

ظاہر ہے کہ میں نفی میں سر ہلا سکتا تھا۔ اس لیے کہ ماسٹر صاحب نے اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابّا کہنے لگے کہ "وہ تمھیں چھٹی جماعت کے امتحان میں بٹھانا چاہتے ہیں تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ تو اسکول میں مڈل کلاس میں تمھیں داخل کر سکیں۔ تم دے سکو گے چھٹی جماعت کا امتحان؟"

میرا گھبرا جانا ضروری تھا۔ اس لیے کہ میں نے آج تک نہ کسی اسکول میں تعلیم پائی

تھی اور نہ کہیں دیکھا ہی تھا کہ امتحان کس طرح دیا جاتا ہے ابّا نے مکرر پوچھا تو میں نے صرف اس قدر کہہ دیا کہ ماسٹر صاحب کہتے ہیں تو میں دے سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا ابّا میرے جواب سے کچھ مطمئن ہی تھے۔ لیکن امی کہنے لگیں کہ "وہ اُن کا ماسٹر خود ناتجربہ کار ہے۔ ذرا آپ ہیڈ ماسٹر صاحب سے بھی تو مشورہ کر دیکھئے نا۔ وہ تو آپ کے مداحوں میں سے ہیں۔"

ابّا نے صرف اتنا کہا کہ میں ماسٹر صاحب کو یہی جواب دے دوں کہ وہ اس ضمن میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے مشورہ کر کے انھیں جواب دیں گے۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب آئے تو انھوں نے نشست سنبھالنے سے پہلے ہی مجھ سے پوچھا کہ ابّا نے کچھ جواب دیا ــــ میں نے جواب کہہ سنایا۔ تو وہ بڑے مغموم سے بیٹھے ہوئے کچھ دیر خلاؤں میں گھورتے رہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ بیٹھے نہیں ہیں بلکہ کھڑے کھڑے ہی اس اجنبی سے گلے مل رہے ہیں جو روز شام کو ابّا کے سامنے سے گذرتا ہے۔ اس دن ماسٹر صاحب نے نہ ہمارا ہوم ورک ہی ٹھیک سے دیکھا نہ پڑھانے میں دلچسپی لی۔

ماسٹر صاحب جانے لگے تو دروازے تک پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے، کہنے لگے "بابا "ذرا دیکھنا ابّا کے پاس کون کون ہیں"۔ میں نے دیکھا تو ابّا اور ہیڈ ماسٹر صرف دونوں ہی تھے۔ میں نے جب ماسٹر صاحب سے کہا تو ان کے قدم جیسے زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ہمارے سلام کا جواب دیا اور سیڑھیوں پر پہنچتے پہنچتے جیسے کہیں غائب ہو گئے اور میں نے دیکھا کہ آج وہ اجنبی کچھ زیادہ ہی بوکھلایا ہوا ہے جو ابّا کے سامنے سے گذر جانے کے لیے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ چلتا چلتا بالکل اس طرح رکا جیسے قدموں میں اس کا خون منجمد ہو گیا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب نے وہیں سے پکارا "ماسٹر صاحب ذرا

ادھر آنا تو" اور اجنبی مجرموں کی طرح سہما سہما ان کی طرف بڑھنے لگا۔ کسی غیبی قوت نے اس کو دہرا کیا پھر سر پر اتنا بوجھ پڑا کہ اس کے پیر جواب دے گئے۔ اور وہ سیدھا تنا ہوا مٹی کے گڈے کی طرح کرسی پر ٹک گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اس سے مخاطب ہوئے "صاحب کا خیال ہے کہ اگر آپ کو اس بات کا پوری طرح یقین ہے کہ بابا کامیاب ہو جائیں گے تو انھیں امتحان میں شریک کر دیجئے۔ کامیاب نہ ہوں تو آئندہ سال ساتویں جماعت میں داخلے کا امکان اس لیے ختم ہو جائے گا کہ صاب اس کو مناسب نہیں سمجھتے۔

اور ہاں" ابا کہنے لگے۔ "پہلی بار ناکام ہو تو بچہ امتحان سے ہمیشہ کے لیے خائف ہو جاتا ہے۔"

"ہاں صاحب یہ بچوں کی نفسیات ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب نے ایمان لانے کے انداز میں تائید کی۔

میرا جی کس قدر چاہا کہ ہمارا ماسٹر اس خود آگہی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ ان لوگوں میں کرے جو وہ پڑھاتے وقت کیا کرتا ہے۔ لیکن جیسے یہ ناممکن تھا۔ اس لیے کہ وہاں تو ہمارا ماسٹر تھا ہی نہیں۔ وہ کم آمیز اجنبی تھا جو شاید اپنے وجود سے بھی ڈرتا ہے۔

جوتے کی ٹو سے قدموں تلے بچھی ہوئی لان کو کریدتے ہوئے اور جھکی جھکی نظروں کو ابا سے ملانے کی کوشش کرتے ہوئے جب وہ مبہوت بیٹھا رہا تو ابا نے اس کو پھر سوتے سے جگایا۔

"آخر آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے اس لجاجت سے درخواست کی کہ جیسے ابّا کے انکار پر ان کے قدم ہی ٹوٹ پکڑلے گا۔ جیسے میرا امتحان میں نہ بیٹھنا اس کے لیے باعث تعزیر ہو۔

میری امتحان میں شرکت طے ہوگئی تو وہ دوسرے دن سے غائب تھا۔ تین دن ہوگئے لیکن اس نے ہمارے گھر کا رخ نہ کیا۔ مجھے ہمارے ماسٹر صاحب کے چھوٹے بھائی سے جو میرا دوست تھا اور کبھی کبھی ملنے آتا تھا معلوم ہوا کہ وہ بالکل اچھے خاصے ہیں اور بلاناغہ اسکول جاتے ہیں۔

ابّا نے منشی جی کو بھجوا کر انھیں بلوایا اور نہ آنے کا سبب دریافت کروایا تو ماسٹر جی نے کہلا بھیجا کہ انھیں شدید بخار تھا۔ مجھے یہ جھوٹ اچھا نہیں معلوم ہوا لیکن ماسٹر صاحب تو ہمارے چہیتے تھے نا۔ میں نے پردہ پوشی کی جیسے ان کا محسن ہوں۔ وہ پھر آنے لگے اور مجھ سے تین دن نہ آنے کا کوئی سبب بھی نہ بتایا۔

امتحان ختم ہوا تو اپنی کلاس کے ضلع بھر کے سارے بچّوں میں میرے نمبر زیادہ تھے ہیڈ ماسٹر صاحب ابّا کو مبارک باد دینے آئے تو ابّا نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمارے ماسٹر صاحب کی بہت تعریف کی اور اتنے اچھے ماسٹر کے مقرر کرنے پر ہیڈ ماسٹر صاحب کا نھوں نے پھر ایک بار شکریہ ادا کیا، ہمارے ماسٹر صاحب ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ باتیں مجھے کچھ زیادہ بھلی بھی نہ لگیں۔ اس لیے کہ میری اپنی اہمیت میری نمایاں کامیابی کے باوجود جزوی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری پیٹھ ٹھونک کر مجھے چمٹا کر یری تعریف کی اور اپنے پاس ہی کرسی پر بٹھا لیا تو پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہا کہ اب وہ مارے ماسٹر صاحب کی اتنی تعریفیں کریں کہ ابّا ان کے قائل ہو جائیں۔ چنانچہ پھر ماسٹر صاحب ں کی باتیں شروع ہو گئیں ـــــ خود ابّا کہنے لگے کہ اس مبارک و مسعود موقع پر ماسٹر صاحب

کے اب تک نہ آنے کا انھیں ٹرا دکھ ہے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ انھیں اس کی اطلاع ہے کہ ماسٹر صاحب ان سے کچھ خفا بھی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو ابّا کا یہ سنجیدہ ردِّ عمل، میں نے محسوس کیا کہ کچھ ٹھیک نہ معلوم ہوا، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ابّا ایک معمولی ماسٹر کو اتنی اہمیت دیں کہ اس کے حوصلے ان سے خفگی تک ٹرھ سکیں ــــ چنانچہ انھوں نے کہا۔ "یہ آپ کیا فرماتے ہیں صاحب۔ وہ بھلا آپ سے کیا خفا ہوسکے گا جس قدر ایماندار آدمی ہے اتنا ہی سنکی بھی ہے۔ بالکل موڈی ــــ لیکن ابّا کی نظر میں جیسے ان باتوں سے بھی ہمارے ماسٹر صاحب کی اہمیت کم نہ ہوئی۔

وہ کہنے لگے "میں بابا کو منشی جی کے ساتھ ان کے گھر بھجوا رہا ہوں۔ وہ اس پر بھی نہ آئیں تو سوچا ہے خود ان سے ملنے چلا جاؤں۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہیڈ ماسٹر صاحب مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ بابا تمھارے ابّا چونکہ ضلع کے سب سے ٹرے عہدیدار ہیں اس لیے ذرا سے سنک بھی ہیں۔ بالکل موڈی ــ لیکن جیسے ان کی گھگھی بندھ گئی تھی۔

میں منشی جی کے ساتھ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے مجھے آتا ہوا دیکھ کر ایک ہی جست میں اپنی چوکھٹ اور سیڑھیاں پھلانگ لیں۔ جھپٹ کر مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میری آنکھیں، میرے گال، میری پیشانی چٹاچٹ چومنے لگے۔ مجھے شرم آتی رہی اور منشی جی کھڑے اپنی محدب شیشے والی عینک سے اپنی آنکھوں کی جوت ٹرے پیار سے ہم پر پھینکتے رہے ــــ ماسٹر صاحب مجھے چوم کر سیدھے ہوئے تو فوری انھوں نے منہ پھیر لیا۔ لیکن ان کا آنسو پہلے ہی میری پیشانی سے ڈھلک کر میری ناک پر پہنچ چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انھوں نے جس عتر سے مجھے لپٹایا تھا۔ اسی

سرعت سے مجھے چھوڑ کر وہ الگ کیوں ہو گئے ــــــ مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اپنے سینے میں بھی آنسوؤں کا ایک سمندر ہے اور وہ آنکھوں کی طرف بڑھ رہا ہے ــــــ اور میں بے طرح سسکنے لگا ــــــ یہ سب کچھ دیکھتے دیکھتے ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ مجھے تھام کر اپنے برآمدے تک لے آئے، اپنے آنسو چھپا کر میرے آنسو پونچھے۔ سامنے دھری ہوئی لکڑی کی معمولی سی کرسی کھینچ کر مجھے بٹھایا۔ اسٹول منشی جی کی طرف بڑھایا اور خود دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ کیوں کہ ان کے اپنے بیٹھنے کے لیے صرف مٹی کا فرش باقی تھا۔ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کیں۔ ان کو کھڑا دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تو وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے برابر بٹھا لیا۔

میں لوٹنے لگا تو انھوں نے میری پیشانی چومنی چاہی، جیسے بہت بزرگ آدمی ہوں۔ ذرا ٹھٹھکے کیا امی تو انھیں صرف اس لیے خاطر میں نہیں لاتی تھیں کہ ان کی نظر میں نیا ماسٹر بالکل ناتجربہ کار لڑکا تھا۔

میں نے لوٹتے لوٹتے ان سے پوچھا کہ وہ سارے پرچے میرے حوالے کر دیں تاکہ میں کم سے کم اپنی چھپی ہوئی چیزیں اس موقع پر ابا اور امی کو بتلا سکوں۔ ماسٹر صاحب کا چہرہ ایک دم کھل کر گلزار ہی گلزار بن گیا۔ کہنے لگے "بابا میں تو بھول ہی گیا تھا۔ پیامِ تعلیم میں تمھاری تازہ کہانی چھپ چکی ہے۔" اور وہ اس طرح اندر جھپٹے جیسے ایک منٹ کی تاخیر بھی کسی بنے بنائے کام کو بگاڑ دے گی۔ جیسے تھوڑی سی دیر ہو جائے تو میری کہانی کے صفحات بالکل سادھا سادھا سے لگنے لگیں گے اور ان کے سارے کے سارے حروف مٹ جائیں گے۔

سہ رنگی ٹائیٹل کا خوبصورت سا رسالہ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں جب اوراق

الٹ پھیر کر دیکھ چکا تو انھوں نے مجھ سے یہ کہہ کر واپس مانگ لیا کہ آج شام " میں خود اپنے ساتھ وہ پرچے بھی لے آؤں گا جن میں تمھاری کہانیاں چھپی ہیں. میں چاہتا ہوں کہ ابّا کو ساری چیزیں خود ہی بتلاؤں ۔"

شام تک ماسٹر صاحب کا منتظر رہنا میرے لیے معمولی بات نہ تھی. میں نے صرف ایک ہی بار تو اپنا نام "پیام تعلیم" میں دیکھا تھا۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس دل ہی دل میں رہ گئی تھی جس کے لیے شام تک انتظار کرنا تھا۔

شام کو لان پر کرسیاں بچھ گئیں تو ابّا کی آمد سے پہلے ہی میں کھیل کود میں حصّہ لیے بغیر بہت ہی مقطع بنا ماسٹر صاحب کا منتظر تھا۔ وہ دیر تک نہیں آئے تو میری بے چینی بڑھنے لگی، ابّا نے دو ایک بار کہا بھی کہ وہ جاؤ کھیل لو، آج اس طرح یہاں کیوں بیٹھے ہو؟" میں نے کہا "ماسٹر صاحب آنے والے ہیں نا" ابّا مسکرائے۔ کہنے لگے وہ مجھے معلوم ہے بھئی وہ آجائیں تو میں تمھیں بلالوں گا۔"

لیکن اس غیر معمولی تاخیر سے میں مشتبہ ہو چلا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ گھبرا کر نہ آئیں اور مجھ سے جھوٹ موٹ ہی کہہ دیا ہو۔ میں گیٹ تک جا کر ان کا انتظار کرنے کے لیے اٹھا تو ترشی ہوئی شاداب باڑھ کے پیچھے سے وہ بہت ہی مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے. میں نے دبی زبان میں ابّا سے کہا بھی کہ وہ آگئے ہیں لیکن وہ کسی صاحب سے باتیں کرنے میں منہمک تھے جنھیں میں نہیں جانتا تھا۔

ماسٹر صاحب آج پتہ نہیں اس آدمی کو کہاں چھوڑ آئے تھے جو ابّا کے آگے ہمیشہ ان کی نمائندگی کرتا آیا تھا۔ ابّا کو باتوں میں منہمک دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون ہوا کہ چلو ماسٹر صاحب کو یہ احساس تو ہے کہ ابّا ان کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن

ماسٹر صاحب آج ابّا کے وجود اور عدم وجود ہی سے جیسے بے نیاز تھے میں نے پہلی بار ماسٹر صاحب کو ابّا کے سامنے اس طرح دیکھا جیسے وہ کمرے میں بیٹھے ہم بچوں کے نرغے میں مطمئن ہوں ــــ اس اثناء میں ابّا کی نظر ان پر پڑی تو انھیں دور ہی سے دیکھ کر ابّا تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے غالباً اس تکریم کے پیچھے پچھلی ساری شکر رنجیوں کا ازالہ بھی ابّا کا مقصود ہو۔

آج ماسٹر صاحب میری سمجھ سے باہر تھے۔ ابّا کو کھڑا دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھتے رہے ــــ مجھے یقین ہو گیا کہ اب وہ آدمی سچ سچ زندہ نہیں ہو سکتا جو ہمارے ماسٹر کو باڑھ تک لا کر پیچھے ڈھکیل دیتا تھا، اور خود ابّا کے آگے اس طرح کی حرکتیں کرتا جیسے بقول منی کے۔ کلو کے فٹس آ رہے ہوں۔

ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں 'پیام تعلیم' اور 'غنچہ' کے رسالے دیکھ کر میری توجہ ان کی شخصیت سے ہٹ کر اپنی شخصیت میں مرکوز ہو گئی کہ ابھی ابھی دیکھتے کے دیکھتے ابّا کے آگے میری ادبی حیثیت مسلّم ہو جائے گی۔

ماسٹر صاحب ابّا کے قریب آئے تو انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور میری کامیابی پر انھیں مبارک باد دی۔ میں نے اس درجہ خود اعتمادی اپنے ماسٹر میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے ابّا سے ان کا اس طرح ملنا ایک عجوبہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس آدمی کی موت پر مجھے غائت درجہ خوشی ہونی چاہیئے تھی جو ماسٹر صاحب کو بے طرح اپنے شکنجے میں جکڑے رہتا تھا اور جس کے ہاتھوں ماسٹر صاحب کی زندگی ہی میں کئی بار موت واقع ہو چکی تھی لیکن میرا ذہن یہ ساری باتیں سوچنے کے لیے اس وقت تیار نہ تھا۔ میری اوّلین خواہش تو صرف یہ تھی کہ ماسٹر صاحب کی بغل میں دبے ہوئے سارے رسالے پلک جھپکنے تک ابّا کے سامنے کھل جائیں اور ان کے صفحات پر میرا نام چمکتا، دمکتا ہوا انھیں نظر آئے۔

ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے میری تعریفیں کر رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے ہمارے کمرے میں بیٹھے ہم سے باتیں کر رہے ہوں۔ کئی بار تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ابّا موجود نہیں ہیں ورنہ ابّا کی موجودگی میں ماسٹر صاحب کا اس آدمی میں پناہ لینا بالکل یقینی تھا جو اپنے اندر ماسٹر صاحب کے سارے وجود کو چھپا لیتا تھا لیکن پتہ نہیں آج وہ ذلیل اور بزدل آدمی کہاں فرار ہو چکا تھا۔ میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ میرے پیر تو زمین پر نہ تھے۔ جیسے اوپر ہی اوپر اٹھتا جا رہا ہوں۔

جب ماسٹر صاحب نے ابّا سے کہا کہ آپ بابا کو رسالے اور دوسری کتابیں بھی پڑھنے کی اجازت دے دیجیے۔ وہ جو بھی پڑھتے ہیں اس میں میری مرضی کو دخل رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے کورس کی کتابوں کے سوا کچھ اور پڑھنے سے انھیں منع کیا ہے۔" تو ابّا نے دبی زبان میں صرف اتنا کہا کہ "میں نے بالکل منع تو نہیں کیا تھا۔"

ماسٹر صاحب نے رسالے ان کی طرف بڑھا کر کہا "دیکھیے ان کی کہانیاں اور مضامین ان رسالوں میں چھپتے ہیں — اسکول بھر میں کوئی لڑکا اول تو آ بھی سکتا ہے۔ لیکن یہ صلاحیتیں ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتیں۔"

ابّا مسکراتے رہے، اور رسالوں کے ورق الٹ الٹ کر میرا نام دیکھتے رہے مجھے اتنی خوشی زندگی میں کبھی حاصل نہ ہوئی تھی جو ماسٹر صاحب کی زبانی اپنی تعریف سُن کر اس وقت حاصل ہوئی تھی۔ ابّا نے رسالے امّی کو بتانے کے لیے رکھ لیے۔

اس کے بعد ماسٹر صاحب برابر آتے رہے۔ تعطیلات ہی میں نئی جماعت کی نئی کتابیں شروع کر دی گئیں اور پڑھنے لکھنے میں مجھے بڑی لذت سی محسوس ہونے لگی۔ کبھی کورس کی کتابیں، کبھی رسالے یا دوسری کتابیں پڑھتا رہتا۔ رسالے

رھتے وقت بھی کبھی امی آجائیں تو مجھے ان کی آمد کی پرواہ نہ ہوتی۔ بعضے تو ایسا بھی
ہوتا کہ امی میری بانہہ پکڑ کر مجھے ٹیبل سے اٹھا دیتیں کہ بھری شام کو پڑھتے رہنے
سے آنکھیں اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کھیل کود کے وقت کھیلنا بھی تو چاہیئے
غرض اس طرح اٹھاتے وقت انھوں نے نصاب یا غیر نصاب کی کتاب کی کبھی بھی
تفریق نہ کی اور یہی بات مجھے بڑھاوا دینے کے لیے بہت کافی تھی۔

مشو میاں کہنے لگے کہ "امی اب ماسٹر صاحب بالکل اچھے ہو گئے ہیں۔ انھیں
پاس بھی نہیں آتے، اور منی ان کی بہت دوست ہو گئی ہے ـــــــــــ مجھے
مشو میاں کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں نے انھیں وہیں ڈانٹا ــ فٹس کب آتے تھے بھلا
ماسٹر صاحب کو۔ وہ تو منی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی تھی۔ لیکن تم تو سیانے
ہو نا، تمھیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے ـــ" مشو میاں تو خیر چپ ہو گئے لیکن امی نے مجھے
ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ سچی بات کڑوی لگتی ہے ہمیشہ۔

آہستہ آہستہ ہم اس شخص کو بھول گئے جو ہاڑھے کے پاس سے ماسٹر صاحب کو
پیچھے دھکیل کر اباّ کے آگے سے گذرتا ہوا ہمارے کمرے کی سیڑھیوں تک پہنچ کر کہیں
غائب ہو جاتا تھا۔ . . . .

میں تو اپنے کمرے میں ہمیشہ ماسٹر صاحب ہی ملتے۔ کبھی کبھی وہ دبے پاؤں ہمارے کمرے
میں داخل ہونے کی کوشش کرتا بھی تو جیسے ماسٹر صاحب سے خائف ہو کر فرار ہو جاتا۔ لیکن
ابا کے آگے تو وہ ماسٹر صاحب کو اس طرح دبوچ لیتا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو ــ لیکن
یہ باتیں قریب قریب سب کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں یہاں تک کہ خود میرے اپنے ذہن سے بھی۔

ماسٹر صاحب بڑے اطمینان سے کتابیں بغل میں دبائے چلے آتے ــ آبا ہوتے
تو نہایت بردباری سے گردن ذرا سا خم کر کے ان کو سلام کرتے وہ بھی

اپنی کرسی سے نیم استادہ ہوکر جواب دیتے۔

ہم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں اپنے پرچے، اپنے رسالے بغیر کسی پس و پیش کے جب چاہے پڑھتا، اور اب کبھی بھی ابّا اور امی کو دیکھ کر نصاب اور غیر نصاب کی تفریق کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اپنی ہر حرکت اور ہر عمل پر ایک بھرپور اعتماد کا عالم زندگی کو کس قدر وسیع بنا دیتا ہے۔ غیر شعوری طور پر میں کچھ اسی عالم سے گذر رہا تھا۔

امی اب ماسٹر صاحب کا نام لیتیں تو اس میں عزت و توقیر شامل رہتی۔ وہ اگلا سا انداز نہ ہوتا جس سے کبھی کبھی مجھے دکھ ہوتا تھا۔

ایک دن ماسٹر صاحب تین دن تک نہیں آئے معلوم ہوا کہ ان کی ترقی کا مسئلہ درپیش ہے اور وہ اسی لیے کوشاں ہیں مجھے معلوم تھا کہ ماسٹر صاحب کو ان کے اسکول میں ترقی دے دی گئی ہے لیکن کچھ روز سے یہ افواہیں بھی تھیں کہ ان کے کسی ساتھی نے اس ترقی کے خلاف اپیل کی ہے۔ اسکول میں جب وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے صرف اتنا کہا کہ "بابا! اپیل ابّا کے پاس ہی کی گئی ہے اور ان کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔ اس لیے کہ اور آگے جانے کی ہمت میرے مخالف میں نہیں ہے ــــ

میں نے اتنے دن سے نہ آنے کا سبب پوچھا تو جواباً انھوں نے شب کو آنے کا وعدہ کیا اور کچھ کہے سنے بغیر چلے گئے۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے بھی بہت متاثر ہوا۔ پتہ نہیں میرے ذہن نے کیوں اس طرح سوچا کہ وہ ان دنوں دانستہ ہمارے گھر آنے سے گریز کر رہے ہیں تاکہ ابّا بغیر کسی جانبداری کے اپیل کا فیصلہ کر سکیں۔ چاہے وہ ماسٹر صاحب کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

شام کو ماسٹر صاحب آئے تو ابّا لان پر پڑی ہوئی ڈک چیئر پر نیم دراز حالت میں سگار پی رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہاتھ میں نیا رسالہ دیکھ کر میں جھپٹا تو ترشی ہوئی شاداب بادڑھ

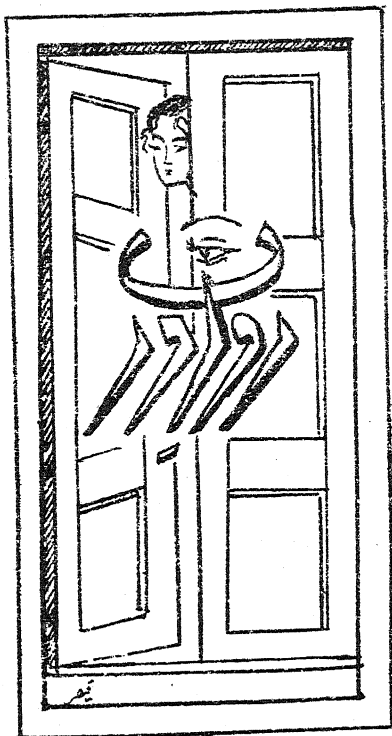
سے آگے بڑھتے ہی ان کی آنکھیں ابّا سے چار ہوئیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ ماسٹر صاحب جیسے کہیں غائب تھے ـــــ

اسی بزدل آدمی نے بڑھ کر ان کو آج پھر دبوچ لیا تھا اور وہ ابّا کے آگے اس طرح مضمحل اور نڈھال قدم اٹھا رہے تھے جیسے اب دم توڑ دیں گے اب دم توڑ دیں گے۔

سہمے سہمے سے ابّا کی طرف کن انکھیوں دیکھتے ہوئے ٹوپی کو درست کرتے ہوئے شیروانی کے دامن کو چٹکی میں لے کر اپنی رانوں میں اڑستے ہوئے۔ ٹرٹرکر کن کھائے ہوئے پتنگ کی طرح۔ اف میرے اللہ ـــــ

ابّا نے مجھے پکارا تو جیسے میں سہم گیا۔

ان کے قریب پہنچتے پہنچتے جانے کیوں ہاتھ پیچھے کر کے میں نے اپنا رسالہ چھپانے کی کوشش کی، پھر گھبرا کر باڑھ میں پھینک دیا جس میں میری کہانی تھی ـــ جس میں میرا نام روشنائی سے نہیں روشنی سے لکھا ہوا ہوگا۔



ذکیہ آج پھر تمھاری گھنی پلکوں پر موتی چمک رہے ہیں۔ میں نے ان موتیوں کو کبھی ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی۔ صرف اس لیے کہ میں ان کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موتی انمول ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان موتیوں کی آب نے کسی کے دامنِ دل کو جھلس دیا ہو لیکن تم بُرا نہ مانو تو تم سے ایک بات کہوں میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ تم جب کبھی روئی ہو اس وقت روئی ہو جب کہ تمھیں ہنسنا چاہیے تھا، کم از کم مسکرانا تو ضرور چاہیے تھا تمھیں۔ نرم مسکراہٹ، شیریں مسکراہٹ مسکراہٹ جو ستارہ صبح گاہی کی کومل کرن کی طرح گداز ہو۔ مسکراہٹ جس کی سرخی کھلتی ہوئی گلاب کی کلی کے سینے میں تمھارے روتے ہوئے خون کے آنسوؤں سے ڈھل کر منجمد ہو گئی ہو ور مجھے تمھاری یہ مسکراہٹ بہت پسند ہے ذکیہ۔ میں اس مسکراہٹ کا احترام کرتا ہوں یں چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مسکراتی رہو۔ کرنیں ہی کرنیں بکھیرتی رہو۔ کلیاں ہی کلیاں چٹکاتی رہو۔ لیکن نہیں مجھے معاف کرنا۔ میں نے تم سے کوئی ایسی بات ضرور چھپائی ہے جس کا میں تم سے اظہار کرتا تو شاید تم رو پڑتیں۔ درآنحالیکہ اس بات کے

اظہار کے باوجود بھی تم مسکرا سکتی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ تمھارے بس کی بات نہیں ہے اور مجھے تمھاری پلکوں پر جھلملاتے ہوئے ستاروں سے وحشت ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی انجام سے بے خبر ہو کر میں تمھیں صرف اتنا بتا دوں کہ میں نے ایک بات تم سے غلط کہی میں نے کبھی بھی تمھاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کیا۔ کوئی مرد کسی عورت کی مسکراہٹ کا احترام نہیں کر سکتا۔ یا پھر کر سکتا ہو گا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔ میں اپنی بات کہے جاؤں تو ٹھیک ہے۔ باوجودیکہ تم میرے بہت عزیز ترین دوست کی بیوی ہو لیکن میں اس کو کیا کروں ذکیہ کہ زندگی کی ساری رعنائی، زندگی کی ساری شادابی صرف تمھارے ہونٹوں کے مقدر میں آگئی ہے۔

دنیا کے سارے اجالوں کو تم نے اپنے ہونٹوں کے محراب میں محصور کر رکھا ہے اور جب تم مسکراتی ہو تو میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہوں کہ تمھارے ہونٹوں سے پھوٹتی ہوئی اُجلی کرنوں کے تانے بانے میں بے طرح جکڑا جا رہا ہوں۔ لیکن اسی لمحہ مجھے اپنی دیانت داری خود کو فریب دینا سکھلا دیتی ہے اور میں احترام کا لفظ استعمال کر کے خود کو فریب دیتا ہوں۔ تم کو فریب دیتا ہوں اور اپنے عزیز ترین دوست کو فریب دیتا ہوں جس کی تم بیوی ہو۔ اس لیے کہ میں تمھاری مسکراہٹ کا احترام نہیں کرتا بلکہ تمھاری مسکراہٹ مجھے پسند ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مجھے کسی کی گوری باہیں پسند ہیں، کسی کی مخروطی انگلیاں پسند ہیں۔ کسی کی ناک کا تل پسند ہے۔ یہاں تک کہ کسی کا طرزِ گفتگو پسند ہے۔ کسی کا اندازِ سپردگی پسند ہے۔ اسی طرح ذکیہ مجھے تمھاری مسکراہٹ پسند ہے۔ میں نے گوری باہوں سے لے کر عالم سپردگی تک کسی کا احترام نہیں کیا ہے تو میں تمھاری مسکراہٹ کا کیسے احترام کر سکتا ہوں ـــ لیکن یہ سب باتیں میں تم

سے کہہ نہیں سکتا کیوں کہ تم میرے بہت عزیز دوست کی بیوی ہو، اور میرا دوست
مجھ پر بہت اعتماد کرتا ہے۔ اتنا اعتماد کہ تمھیں خود پر اتنا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اور نہ
خود مجھے اپنے آپ پر اتنا اعتماد ہے ـــــ میرا دوست غالباً تمھیں بے اندازہ چاہتا
ہے لیکن اس کے باوجود تم نہیں مسکراتیں ـــــ تم نہیں مسکرا سکتیں، اور نہ میں تم سے مسکرانے
کی خواہش کر سکتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کا
تمھیں بھی علم ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر تم اس بات کو سمجھ چکی ہو کہ تمھارے
شرابی لبوں میں گھٹ کر جس اُجالے نے دم توڑ دیا ہے، جس اندھیرے نے جنم لیا ہے
اس اندھیرے پر تم اب فتح نہیں پا سکو گی۔ لیکن اس میں میرے دوست کا کوئی قصور
نہیں ہے۔ تمھارے دونوں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے، اور نہ خود میرا اپنا اس میں کوئی
دخل ہے کہ میں ایک عزیز دوست کی بیوی کی مسکراہٹ کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ لیکن میرے
سوچنے کا انداز بالکل وہی ہے جو گوری باہوں کے میری گردن میں حائل نہ ہونے تک تھا
مخروطی انگلیوں کے میرے لمبے بالوں سے نہ کھیلنے تک تھا۔ اداس آنکھوں کے میری اپنی
آنکھوں میں نہ جھانکنے تک تھا، اور ناک کے تِل تک میرے ہونٹوں کے نہ پہنچنے تک تھا۔
سب بے گناہ ہیں ذکیہ۔ یہاں تک کہ تم بھی بے گناہ ہو۔ تم جو میری موجودگی میں اپنی
کھوئی ہوئی مسکراہٹ کو ڈھونڈ کر لے آتی ہو۔ تم جو میری قربت پر اپنے ہونٹوں سے
چھنی ہوئی بجلیوں کو اپنے معاشرے کے ظالم ہاتھوں سے جھپٹ کر اپنے ہونٹوں پر
پھر سے لہرانا چاہتی ہو، لیکن بجلیوں کے بجائے صرف جگنو چمک کر رہ جاتے ہیں۔ اور
جگنوؤں کی روشنی سے بھی میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس خیرگی کو میں تم پر
ظاہر نہیں کر سکتا، اور پوری قوت سے اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔ انھیں جھپکنے تک

نہیں دیتا، صرف اس لیے کہ تم میرے عزیز ترین دوست کی بیوی ہو، اور صرف اس لیے کہ اگر میری آنکھیں جھپکتی ہیں تو تمھارے ہونٹوں کے محراب میں یہ جھلملاتے جگنو ایک دم سے گہرے اندھیرے میں بھٹک جاتے ہیں۔ ایسے اندھیرے میں جہاں وہ روشنی نہیں اگل سکتے بلکہ تاریکیاں ان کی روشنی کو نگل لیتی ہیں اور یہ تمھاری گھنی پلکوں پر موتی چمک اٹھتے ہیں، صرف اس لیے کہ میں تمھارے شوہر کا عزیز ترین دوست ہوں اور وہ تم پر اور مجھ پر دونوں پر اعتماد کرتا ہے ـــــ میں سوچتا ہوں کہ مجھے تمھاری پلکوں پر چمکتے ہوئے ان موتیوں سے کیا لینا ہے جن کی قدر و قیمت سے میں واقف نہیں ہوں اور جو میرے عزیز دوست کی زندگی کی پونجی ہیں۔

ہاں اور سنو ذکیہ ـــ کیا میں آج تمھیں یہ بھی بتلا دوں کہ مجھے تمھارے ہنسنے اور رونے کے سوا تمھاری خاموشی سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ جب تم روتی ہو تو مجھے ہنستی ہوئی دکھائی دیتی ہو، اور ہنستی ہو تو تمھارے لبوں پر مسکراہٹ کی بجائے آنکھوں میں آنسو دکھائی دیتے ہیں، اور جب تم خاموش ہوتی ہو تو میں محسوس کرتا ہوں جیسے تم کچھ بول رہی ہو، اور جب تم بولتی ہو تو محسوس ہوتا ہے جیسے بالکل خاموش ہو، اتنی خاموش کہ تمھاری اپنی آواز بھی تمھارے اطراف پھیلے ہوئے بیکراں سناٹے سے بچ کر خود تمھارے اپنے کانوں تک بھی نہیں پہنچ پاتی ہے ـــــ تمھیں بتاؤ ذکیہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے، کیا ہے، کیا تم وہی ہو جو تم نظر آتی ہو یا وہ ہو جو نظر نہیں آتیں۔

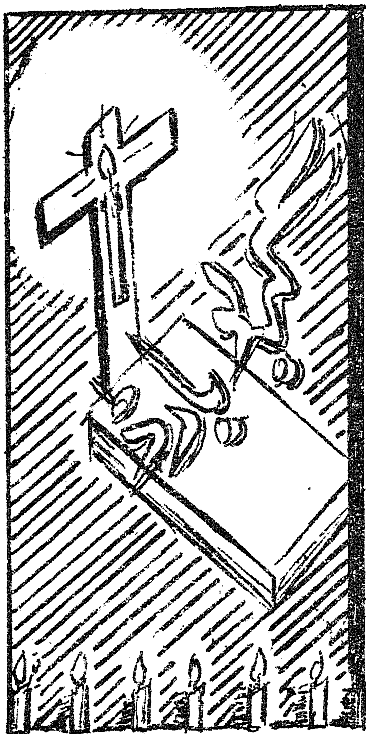
تم اس دن کرید کرید کر سر یدانا سے متعلق پوچھ رہی تھیں ـــــ میں دانستہ اس موضوع سے گریز کر رہا تھا۔ تم چاہتی تھیں کہ میں کسی بات کا اعتراف کر لوں کسی

یسی بات کا جس کے غلط ہونے سے شاید تمھیں تسکین ہوتی ـــ دیکھو ڈیکیہ سرڈِانا
ا شوہر اس کو بے پناہ چاہتا ہوگا۔ اس کی محبت کی تاریخ اور جغرافیے سے میں قطعی
اقف نہیں ہوں، اور نہ میں نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں
سرڈِانا ایک خوبصورت عورت ہے۔ ایک بچّے کی ماں ہے اور اس ایک بچّے کے
دوہ محسوس کرنے لگی ہے کہ اس کو ایسے محرم استعمال کرنا چاہیے جس میں سینے کو
بڑھ کر عورت دوشیزگی کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس کرتی ہے، اور وہ بھول
تی ہے کہ یہ ابھار کپڑے کے کلف کا رہینِ منّت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچّہ پالٹے زال
کا بچّہ ہو۔ مجھے شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ زال کو پورا یقین
، اور سرڈِانا بھی کچھ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ لیکن مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ زال
رڈِانا کو زمین سے بہت بلندیوں پر ہواؤں میں اڑانا چاہتا ہے۔ اڑتے ہوئے
ہلکے بادلوں کی نمی سے اس کی ملائم ریشمی زلفوں کو بھگو کر اپنی انگلیوں سے اس کی
ں میں کنگھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سرڈِانا اس کے ساتھ زمین سے
ت اوپر اٹھ کر زمین کی پستیوں پر مسکرائے، اور وہ ابھرتے ہوئے چاند کی کرنوں
ڑ کر سرڈِانا کے ہونٹوں پر رقص کرنے کے لیے چھوڑ دے اور اس کو بتلائے کہ
کے ہونٹوں پر لپ اسٹک نہیں بلکہ شفق کی سرخیاں مل دی گئی ہیں، اور
ڈِانا ان باتوں پر ایمان لے آئے۔ لیکن سرڈِانا کو زمین سے بے حد انس ہے
ہتی ہے کہ اس کے پاؤں بالکل زمین پر ٹکے رہیں، اور اس سے کوئی چپکے
کہے کہ تمھارا حسن خود زمین و آسمان کو اپنے میں سمیٹے ہوئے ہے۔ شفق کی
یاں تمھارے گلنار عارض پر نثار ہیں، اور تمھاری ریشمی زلفوں کے آگے

نرم اور ملائم ابر کے ٹکڑے ہیچ ہیں۔ تمھارے کانوں میں سجے ہوئے ٹاپس پر سو بار ستارے تصدق کیے جا سکتے ہیں۔ تم مسکراتی ہو تو سویرا ہونے لگتا ہے اور تم خاموش ہو جاتی ہو تو آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ اور میں نے اپنی مضبوط باہوں میں سریڈانا کو جکڑ کر اس سے کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔ ایسی باتیں جس سے اس کا وقار اس کی اپنی نظروں میں اور بڑھ گیا۔ ایسی باتیں جس سے وہ خود کو زیادہ حسین محسوس کرنے لگی۔ ایسی باتیں جن سے اس نے خود نمائی سیکھی اور اس کے غرور نے پائلٹ زال کو آسمان کی وسعت میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا اور سریڈانا مجھ سے قریب تر ہوتی گئی لیکن بہت جلد پائلٹ زال کے بھرے ہوئے پسٹل نے سریڈانا میں جاگی ہوئی خود نمائی کے پرخچے اڑا دیئے اور میرے سارے انقلابی نظریوں کو اپنی گولیوں سے مسمار کر دیا، اور پھر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے لیکن سریڈانا کی آنکھیں آج بھی میرے لیے بے خواب ہیں، وہ آج بھی زال کے پہلو میں بیٹھ کر میرے متعلق سوچتی ہے۔ اس کا دل کمزور ہو گیا ہے۔ پائلٹ زال اب اس کو آسمانوں کی وسعتوں کی سیر نہیں کرا سکتا ـــــ یہ زندگی کی کوئی بہت بڑی ٹریجڈی نہیں ہے ذکیہ۔ ہمارے سماج کا حسن ان ہی سانحوں سے نکھرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کی خوبصورتی انھیں حسرتوں سے قائم ہے۔ ہمارے شب و روز انھیں ناکامیوں سے تابناک ہیں۔ ہم زندگی میں کسی چوٹ کے، کسی کسک کے، کسی ہلکے سے درد کے قائل ہیں۔ کسی ایسے درد کے، کسی ایسی کسک کے جس کے بغیر ہماری تخلیقی صلاحیتیں ختم ہونے لگتی ہیں۔ اور وہ درد زندگی میں صرف تمھیں اور مجھے ہی حاصل نہیں۔ پائلٹ زال کو بھی حاصل ہے۔ سریڈانا کو بھی حاصل ہے۔ قریب قریب اپنے وطن کے ہر مرد اور ہر عورت کو حاصل ہے جو زندگی کے ناخدا ہیں تخلیقات کے خدا ہیں۔

اچھا اب تم بھاگ جاؤ ذکیہ۔ میری بیوی آ رہی ہے اور اپنے پانچوں بچوں کو ساتھ لیے ہوئے آ رہی ہے اور اب میں تمھیں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا، ورنہ وہ سمجھے گی کہ میں ہمیشہ افسانہ ہی لکھتا رہتا ہوں اور کھڑی کھڑی دور دور تک خلاؤں میں گھورے گی لمحہ بھر کے لیے مجھ سے اور اپنے پانچوں بچوں سے بے نیاز ہو جائے گی ـــــ ہاں ذکیہ سوچ رہا ہوں کہ جب تم خود اپنے بچوں میں گھری ہوئی میرا یہ اوٹ پٹانگ خط پڑھتی رہو گی تو تمھاری نظریں کبھی میری تحریر پر ہوں گی، کبھی اپنے دروازے پر کہ کہیں تمھارا شوہر نہ آ جائے۔ میرا دوست نہ آ جائے لیکن کبھی جب میں تم سے ملوں گا تو تم اپنی اس کیفیت کا اظہار تک مجھ سے نہ کرو گی جو تم پر میرا خط پڑھتے وقت طاری ہو گی ـــــ یہ سارے جذبے کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور اپنی موت مر جاتے ہیں۔

ذکیہ چپکے سے مجھے بتا دو تم نے اپنے سینے میں کس کس طرح مجھے چھپا رکھا ہے۔ بھری برساتوں کے روپ ہیں یا دبی دبی چنگاریوں کے روپ ہیں۔



اس کی ممی نے دروازہ کھول کر مجھے دیکھا اور فوراً کہہ اٹھی کہ وُہ گھر پر نہیں ہے۔"

میں جانتا تھا کہ اس کی ممی ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنھیں ہماری دوستی ناپسند ہو۔

پھر وہ مسکراتی کیوں نہیں؟

"تم سے کہیں اپائنٹ منٹ (APPOINTMENT) تھا کیا" ؟

"ہاں" میں نے کہا "میں کوئی نصف گھنٹہ انتظار کر کے آ رہا ہوں"

"وہ گریویارڈ گیا ہو گا"

"گریویارڈ!! — مجھے بہت تعجب ہوا — ہارڈنگ تو ان لوگوں میں سے ہے جو مر کر بھی گریویارڈ نہیں جاتے۔

میں نے پوچھا "کیوں خیریت تو ہے" ؟

کہنے لگی "کوئی خاص بات نہیں تم بھی چلے جاؤ تو خود سمجھ لو گے"

ممی تو پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا۔

"اکیلا گیا ہے یا اینی بھی آئی تھی؟"

"اینی کوئی مہینے بھر سے ادھر نہیں آئی۔"

میں نے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ ویسے جی چاہتا تھا کہ اینی کے مہینے بھر کے طویل غیاب کے بارے میں ممی سے تابڑ توڑ بیسیوں سوالات کر دوں لیکن یہ سوچ کر کہ میرے استفسارات کو وہ جذبۂ رقابت پر محمول نہ کرے میں نے کوئی بات ہی نہ پوچھی — حالانکہ ممی کو یہ وجہ غلط فہمی تھی — لیکن کچھ دنوں سے وہ مجھ پر زیادہ ہی مہربان تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔

میں نے اس سے وداع ہوتے ہوئے سوچا کہ ہارڈنگ نے بھی مجھ سے کچھ نہ کہا — اور اینی کے ساتھ تو گئے اتوار ہی کو میں نے پی تھی اور وہ معمول سے زیادہ ہی خوش تھی — کوئی ایسی بات اس نے بھی نہیں کی۔

گریویارڈ کوئی دور نہ تھا — ام۔ ال۔ ایز کوارٹرس کے بالکل سامنے۔

میں نے اپنی اسکوٹر کو اسٹارٹ کیا اور ہارڈنگ کی ممی نے مسکرا کر دروازہ بند کر لیا۔

میری نظروں میں ہارڈنگ کا ہمیشہ مسکراتا ہوا چہرہ گھوم گیا — اس کی مسکراہٹ اس کی ممی کی مسکراہٹ سے کس قدر مشابہ تھی — نچلا ہونٹ دبا کر باچھوں کو خفیف سی جنبش دے کر کچھ اس طرح مسکرانا جیسے ہونٹ کم اور آنکھیں زیادہ مسکرا رہی ہوں۔

گریویارڈ پہنچا تو وہ ساری اداسیاں جو راستے میں ذہن نے پیدا کی تھیں اور جسے دل نے چپکے سے اپنے پر مسلط کر لیا تھا۔ پتہ نہیں کہاں کھسک گئیں۔

زندگی کی ہل چل، اس کی حرارت، اس کی چہل پہل، اس کی چلبلاہٹ — زندگی کا سب سے بڑا حسن یہی تو ہے — گریویارڈ کے تصور نے یہ سارا حسن مجھ سے چھین لیا تھا — اور پھر ہارڈنگ کبھی بھی کسی قبرستان کو نہیں جا سکتا — اس کی فطرت، اس کا کھلنڈرا پن، اس کی شرارتیں ان کے لیے ایسے مقامات پر کہیں جگہ ہی نہیں ہے۔

اب جب کہ گریویارڈ کے قریب پہنچا ہوں تو سمجھ میں آیا کہ ہارڈنگ اپنی ساری شخصیت کے ساتھ جوں کا توں یہاں تک آسکتا ہے۔

گریویارڈ پر اپنی لمبی لمبی گھنی شاخیں پھیلا کر رات کی تاریکیوں میں جھومنے والے دیو نما درخت بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقموں اور قبروں پر سجی ہوئی موم بتیوں کی روشنی کے آگے جیسے اپنی ساری رعونت اور طنطنہ کھو چکے تھے۔ ان میں بڑی نرمی آگئی تھی بڑا گداز آگیا تھا، مختصر یہ کہ بڑی زندگی آگئی تھی۔

گیٹ پر پہنچنے تک کتنے شانوں سے شانے ٹکرا ٹکرا کر بڑھنا پڑا ہے — کچھ نوجوان تو آئے ہی گویا اس مسخرگی کے لیے تھے۔

بونڈری کے باہر پھولوں، مٹھائیوں، کھلونوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ ٹھیلوں پر کھاری چیزوں سے بھری تھالیاں سجائے ٹھیلے والے گھنٹیاں بجا رہے تھے احاطے کے اندر کا سماں اور بھی دیدنی تھا — ساری فضا جگمگا رہی تھی — سارا ماحول سلگ اٹھا تھا — ہر قبر پر سرہانے سے پائنتی تک تین تین چار چار پانچ کے فاصلے پر موم بتیاں جما کر جلا دی گئی تھیں — موم بتیوں سے جو جگہ بچ رہی تھی اس کو سرخ اور پیلے پھولوں سے ڈھک دیا گیا تھا — اس طرح ساری کی

ساری قبریں پھولوں اور ننھے ننھے شعلوں سے ڈھنکی چھپی دلہنیں بن گئی تھیں جیسے سرخ اور زرد زرترین ڈوپٹوں پر سونے کی چمکیاں ٹانک دی گئی ہوں۔

موم بتیاں آہستہ آہستہ پگھل رہی تھیں، ان کی تابناک آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے آنسو ان کے قدموں میں پڑے ہوئے پھولوں کے کھلے ہوئے سینوں میں حدت اور حرارت پیدا کر رہے تھے ـــــ پھر یہ آنسو خود سرد ہو کر منجمد ہو جاتے ــ جیسے سرخ اور زرد سیپیوں کے کھلے ہوئے سینوں میں موتی دمک رہے ہوں۔

زندگی میں موم کی طرح جلنے کا انداز ـــــ پتہ نہیں ان قبروں میں ابدی نیند سونے والوں میں کن کن کے حصّے میں آیا تھا۔

گریویارڈ کے احاطے میں داخل ہو کر قبروں کے قریب پہنچنے پہنچنے تک میرے ذہن اور دل میں پھر اداسیاں اور محرومیاں اپنے لیے جگہ بنا رہی تھیں ـــــ دل کا کچھ عجیب سا عالم تھا جیسے موم بتی ہی کے مانند بغیر کسی شعلے ہی کے پگھل رہا ہو ـــ

قبروں کے درمیان چھٹے ہوئے گز گز بھر کے فاصلے جیسے پھولوں اور شعلوں کی اس کھیتی میں پگڈنڈیوں کا کام دے رہے تھے۔

زندگی جیسے ان پگڈنڈیوں پر اسقدر نرمی سے پاؤں دھر رہی تھی کہ مبادہ سوئی ہوئی موت بیدار نہ ہو جائے ـــــ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جاگنے والے سونے والوں کی نیند کی حفاظت کر رہے ہیں ـــ کچی نیند کی جو ابھی ابھی لگی ہے جو ابھی ابھی ٹوٹ جائے گی۔

اداس چہرے، بھیگی ہوئی آنکھیں، غمزدہ دل ـــ موم بتیاں قبروں پر جل رہی تھیں۔ موم بتیاں قبروں کے اطراف انسانی صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔

کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبا دیا۔

وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔

"میں نے آدھے گھنٹے تک تمھارا انتظار کیا۔"

"مجھے تمھاری آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔"

دور پر زور دیتے ہوئے ہارڈنگ نے بات ہی بدل دی۔

میں پھر بھی مسکرا نہ سکا۔

اِدھر اُدھر نظریں اٹھا کر وہ اطمینان سے "بل گم" چبانے لگا۔

"کہاں رہے تم" میں نے پوچھا۔

"برَوج کے گھر گیا تھا — وہ نہیں ملا — پھر اینی کے گھر گیا — وہ بھی نہیں ملی — پھر ویکا جیز پہنچا — تم بھی نہیں ملے۔"

"پورے بتیس منٹ "ویکا جیز" میں انتظار کر کے میں تمھارے گھر گیا تھا — تم نہیں ملے۔"

"کوئی کسی کو نہیں ملا۔" وہ پھر مسکرانے لگا۔

"کچھ پی بھی؟ — بہت سوبر معلوم ہوتے ہو!"

"ہاں صرف دو پگ" میں نے جواب دیا۔

"چلو کچھ گھومیں پھریں۔"

"نہیں یار — چلیں یہاں سے۔"

"کیوں" — اس نے میرے شانے پر ایک ہلکی سی چپت لگا دی۔

"تم بھاگ جانا چاہتے ہو اس ماحول سے — کیوں ہے نا یہی بات؟"

میں جلتی ہوئی موم بتیوں کو دیکھ رہا تھا۔ جواب نہ پاکر اس نے میری بانہہ پکڑ لی اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے ۔۔۔ دبے پاؤں آہستہ آہستہ، قبروں کے درمیان ۔ کہیں کوئی جاگ نہ جائے۔

"وہ دیکھو" ۔۔۔ دائیں جانب انگلی اٹھا کر اس نے بتایا۔

اینی اور بروج ایک قبر کے پائنتی سر جھکائے کھڑے تھے۔

"یہ بروج بھی عجب نان سنس ہے یار"

"کس کی قبر ہے وہ ۔۔۔؟" میں نے ہارڈنگ کی بات کو سُنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

"اینی کے بڑے بھائی کی ۔۔۔ میرا بہت پیارا دوست تھا ۔۔۔ دوست بھی اور دشمن بھی۔ بات بات پر چمٹ جاتا۔ اسی طرح بات بات پر جھگڑ بھی پڑتا ۔۔۔ شدید محبت کرتا تھا۔ پگلا کہیں کا۔ میں نے کتنی بار سمجھایا۔ یار عورت سے خود عشق نہ کرو ۔۔۔ دھیمی سی آنچ اس کے دل میں لگا کر بس ہوا دیتے رہو۔ یہاں تک کہ وہ دیوانگی کی حد تک تمھیں چاہنے لگے۔ جب قدموں میں آگرے تو اٹھا کر سینے سے لگا لو ۔۔۔ تم خود اپنی آنکھیں اس کے تلوؤں پر ملتے رہو گے تو وہ تمھاری ہنستی اور جاگتی ہوئی آنکھوں کو پاؤں تلے روند کر گزر جائے گی۔"

"کیا زیادہ پی لی ہے"۔ میں نے ٹوکا۔

"کچھ ایسی زیادہ نہیں ۔۔۔ لیکن تم سے زیادہ" وہ پھر کہنے لگا۔

"لیکن اس نے میری بات کا ہمیشہ مذاق اڑایا ۔۔۔ اس نے محبت میں بڑے کڑے امتحان دیئے یار۔ لیکن اس کی محبوبہ اسے نہ سمجھ سکی ۔۔۔ اور جب وہ سمجھ رہی

تھی ـــــ وہ انتظار نہ کرسکا۔ اس نے بغیر کسی سے کچھ کہے سنے، دنیا ہی چھوڑ دی ـــــ
س قدر اسمارٹ تھا وہ ـ بالکل اینی کی طرح ـــ میں اگر اس کی طرح حسین ہوتا اور
میرا دنیا میں سب کچھ لٹ جاتا تو بھی صرف اپنے ہی حسن کی خاطر میں کسی قیمت پر بھی زندگی
ہ نہ چھوڑتا ـــــ لیکن اس ظالم نے کلوروفارم اپنی رگ میں انجکٹ کرلیا ـــــ
پگلا کہیں کا۔"

اس نے بات ختم کردی اور کہیں دور دور دیکھنے لگا۔

موم بتیاں جل رہی تھیں ـ پگھل رہی تھیں ـ میں چاہتا تھا کہ کچھ اور پی سکوں۔

"تم اینی کو یہاں چھوڑ کر چل دینا تو پسند نہیں کرو گے ـــــ وہ تمھاری بھی
اتنی ہی دوست ہے جتنی میری۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے ہارڈنگ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ لیکن میں نے صرف
ہوں کہنے پر اکتفا کیا۔

دوریوں سے اس نے نظریں ہٹا لیں ـــ مجھ سے آنکھیں چار کیں۔ لبوں پر
وہی نرم نرم سی مسکراہٹ تھی۔ لیکن آنکھیں جیسے اس مسکراہٹ کو جھٹلا رہی تھیں۔

اس نے کہا چلو وہیں چلیں ـــ اور ہم دونوں بڑھ گئے۔

ایک بڑھیا ایک قبر کے سرہانے سنگ مرمر کی صلیب سے چمٹی ہوئی سسک رہی
تھی۔ بھک سفید بال تھے جو کالی ربن سے کس لیے گئے تھے۔ آنسوؤں کو چہرے
کی جھریوں سے گذر کر قبر کے پھولوں پر گرنے میں شاید دشواری ہو رہی تھی ـــ مجھے
یسا معلوم ہوا جیسے یہ ایک ایسی موم بتی ہے جس کا پگھلا ہوا موم شعلے سے کچھ ہی نیچے
تک جاکر سرد اور منجمد ہو جاتا ہے ـــــ پگھلے ہوئے موم کی تہہ پر تہہ چڑھنے لگتی ہے

اور موم بتی کو زیادہ دیر تک جلنے میں مدد دیتی ہے۔

پتہ نہیں یہ سر تا پا سفید بڑھیا کب تک جلتی اور پگھلتی رہے گی ___ ویسے قبر کے سرہانے جاگتی ہوئی اس زندگی میں اور قبر کے اندر سوئی ہوئی موت میں قدم دو قدم ہی کا تو فاصلہ رہ گیا تھا۔

میں نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ صلیب کے نیچے لگے ہوئے کتبے نے میرا دامن پکڑ لیا۔

IN LOVING MEMORY
OF
MY DARLING DAUGHTER
AGE 18 YEARS
I MISS YOU IN THE MORNING.
I MISS YOU IN THE DAY.
I MISS YOU DAUGHTER DARLING.
IN A THOUSAND DIFFERENT WAY.
ALL THE WORLD SEEMS DARK WITHOUT THEE
MEMORY TURNS EACH THOUGHT TO PAIN
LOVE IS VACANT LIFE IS WEARY
TILL IN HEAVEN WE MEET AGAIN.

میرا جی چاہا کہ پھونک مار کر اس قبر کی ساری موم بتیاں بجھا دوں۔
انہی کے پاس پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں تھک گیا ہوں۔
غم کچھ اس طرح دبے پاؤں دل میں داخل ہو رہا تھا جس طرح جنازہ قبرستان میں داخل ہو رہا ہو ___ میں نے پلٹ کر پھر بڑھیا کو دیکھا۔ وہ مجھے نظر نہ آئی۔
کتنے ہی غمزدہ دل، کتنی ہی بھیگی ہوئی آنکھیں، کتنے ہی اداس چہرے ___ موم کی طرح قبروں کے اطراف جل رہے تھے۔
بڑھیا کہیں نہیں جا سکتی ___ میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ قبر پر دوہری

ہوکر قریب قریب لیٹ چکی تھی جیسے اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی کو سینے سے لگا رہی ہو۔

لیکن ننھے ننھے آگ کے شعلے جیسے دو دلوں کے بیچ میں حائل تھے ـــــ میرا پھر جی چاہا کہ پھونک مار کر اس قبر کی ساری موم بتیاں بُجھا دوں۔

اینی ـــــ ہارڈنگ اینی کو پکار رہا تھا ـــــ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہارڈنگ کی آواز خود اس قبر سے آرہی تھی جس پر اینی جھکی ہوئی تھی اور اس کی بے پناہ خوبصورت آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے ـــ پگھلے ہوئے موم کے قطروں کی طرح۔

اینی ـــ میں نے ہارڈنگ کو اس قدر گرمجوشی سے اینی کا ہاتھ دباتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا ـــ یہاں تک کہ کسی بار میں بھی نہیں ـــــ وہ تو اینی کو صرف دق کرنا جانتا تھا۔ اس کو چھیڑتا ـ اس کو ستاتا ـــ بڑی بدتمیزی سے ہماری موجودگی میں اسے آنکھ مار دیتا ـــــ وہ اس کے رویّے کی بروج سے شکایت کرتی ـــ میرے آگے دکھڑا روتی۔

کبھی کبھی تو وہ اسے اتنا ستاتا کہ اینی کی آنکھیں ٹیبل ہی پر چھلک جاتیں ـــ اس کے بعد اپنا جام ہاتھ میں لے کر فوری اٹھ کھڑا ہوتا ـــ ایک ہی سانس میں ساری کی ساری شراب چڑھا لیتا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر ایک ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے سیٹی بجاتا۔ پھر ہم سب کو "وِش" کر کے ہمارے روکتے کے روکتے کچھ نہ کچھ بہانا تراش کر نکل جاتا۔ اس طرح ہمارا موڈ اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتا۔

اینی کے ساتھ اس کا برتاؤ مجھے بھی اچھا نہ لگتا ـــــ لیکن اس کو کسی کے احساسات کا جیسے کچھ خیال ہی نہ تھا۔

اس نے ایسے کسی واقعے کو "چیونگم" یا "ببل گم" چبانے سے زیادہ اہمیت نہ دی

اینی اور بروج نے پلٹ کر ہمیں دیکھا ــــ اینی کی آنکھیں سرخ ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گئی تھیں ــــ بروج گرے رنگ کے "فل سوٹ" میں بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔

ہارڈنگ نے اینی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا ــــ کہنے لگا چلو اب چلیں یہاں سے ــــ تم اس طرح اور روؤگی تو میں تمھیں یہیں گدگداوں گا ــــ تم مجھ پر بگڑو گی تو یہ تمھارا بھائی جو چپ سادھے قبر میں پڑا ہے نا ــــ وہ جھپٹ کر تمھاری حمایت میں میری ٹائی پکڑ لے گا اور ہم یہیں گتھم گتھا ہو جائیں گے ــــ اس سے پہلے کہ ہم جھگڑ پڑیں چلے چلو یہاں سے۔

مجھے ہارڈنگ کی باتیں کچھ اوٹ پٹانگ سی لگیں۔

لیکن وہ پھر کہیں دور ــ دور دیکھ رہا تھا ــ اینی بھی کچھ وہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید دونوں ہی پالمر کو یاد کر رہے ہوں۔

بروج بڑے پیار سے اینی کو تک رہا تھا ــــ اینی کی نظریں دوریوں سے واپس ہوئیں تو بروج کی نظریں جیسے ان کی منتظر تھیں ــــ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اینی نے اپنا ہاتھ بروج کے ہاتھ میں دے دیا ــــ

ہارڈنگ اب بھی کہیں دور ــ دور دیکھ رہا تھا۔

میری نظریں قبر کے کتبے پر جم کر رہ گئیں۔

IN LOVING MEMORY
OF
HEARTY BROTHER
ROBERT PALMER
AGE 21 YEARS
BORN 1935
DIED 1956

ALL THAT YOU HAVE MEANT TO ME
WORDS CAN NEVER TELL
COMRADESHIP AND SYMPATHY
CHEERINESS AS WELL
EVERY DAY SHOWN DOUBLY BRIGHT
JUST BECAUSE YOU SHARED IT
EVERY TROUBLE WAS BORN LIGHT
WITH YOU TO HELP ME BEAR IT
LOVING THOUGHTS SHALL EVER LINGER
AROUND THE SPOT WHERE THOU ART LAID

"کب سے یہاں ہو بیٹھے ہو؟" ہارڈنگ نے برج کو مخاطب کیا۔

"بہت دیر سے" برج نے جواب دیا۔

"آنسو بہانے میں تم نے اینی کو بھی مات کر دیا ہوگا۔"

"کیوں؟"

"تم نرے بدھو جو ہو۔"

"برج زیر لب مسکرایا۔"

"لو گلا خشک ہو گیا ہو گا۔" ہارڈنگ نے ببل گم اینی اور برج کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

— اینی نے انکار کر دیا —

برج نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ ہٹا لیا تو ہارڈنگ بے اختیار ہنس پڑا —

"لے لو — لے بھی لو — اینی خفا نہیں ہوگی۔ تم اینی کے سب سے وفادار

دوست ہو ــــ کیا تمھیں یقین نہیں ہے کہ تمھاری وفاداری تمھاری بیوقوفی پر پردہ ڈال دے گی ؟"

برِوج نے بڑے پیار سے ہارڈنگ کا گال چھوتے ہوئے کہا ــــ "تم پھر شرارت پر اتر آئے ہو ؟"

"شرارت تو میں اب کرنے والا ہوں ــــ سوچ رہا ہوں کہ کیا شرارت کروں۔"

اینی اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔

میں ہارڈنگ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ میرے پلّے نہ پڑا۔ اس وقت میں قطعی اس موڈ میں نہ تھا کہ اس کی شرارتوں کو پسند کرتا۔

میں پھر اپنے بائیں جانب کی ایک قبر کا کتبہ پڑھنے لگا جس پر ایک جوان عورت اپنے تین چھوٹے بچّوں کے ساتھ بہت اداس بیٹھی تھی ــ سب سے چھوٹا بچّہ پیپرز کے پیکٹ میں سے پُدینے کی ٹکیاں نکال کر چبا رہا تھا۔

ONLY THOSE WHO HAVE LOST CAN TELL
THE LOSS OF A LOVED ONE WITHOUT A FAREWELL
ONLY THOSE - - - - - - - - - - - - - - - - -

اور اس نے پیچھے سے میری آنکھیں موچ لیں ــــ تم اپنا رخ بالکل میری طرف کر دو اس وقت تک تمھاری آنکھیں روشنیوں سے محروم رہیں گی۔

میں پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ہارڈنگ نے اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے میری آنکھوں کو آزاد کیا تو مجھے لمحے بھر تک جگمگاتی ہوئی قبریں کچھ ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

اینی کی سہیلی بہت احتیاط سے ریشمی دستی سے اپنی آنکھیں خشک کر رہی

تھی۔ اینی کچھ اس طرح اس کو تسلی دے رہی تھی جیسے خود اپنے آپ کو دے رہی ہو۔

ہارڈنگ نے میرے شانے میں چٹکی بھر کر ایک کالی اسکرٹ پہنی ہوئی حسینہ کی طرف اشارہ کیا جو بہت ہنس ہنس کر قریب ہی دو ادھیڑ عمر کی عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔ دونوں عورتیں منہ کھولے بڑی حیرت اور استعجاب سے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔

بھری ہوئی چٹکی کی سوزش سے میں تلملا کر ابھی ٹھیک بھی نہ ہو پایا تھا کہ چبایا ہوا ببل گم منہ سے نکال کر ہارڈنگ نے بڑی صفائی سے اس لڑکی پر دے مارا جو اس کے کٹے ہوئے خوبصورت بالوں میں جا پھنسا۔ وہ بہت تیزی سے ہماری جانب گھوم گئی۔ لیکن ہارڈنگ اس طرح انجان ہو گیا جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔

میں نے اس کو ٹوکا "تم کہیں بھی اپنی شرارتوں سے نہیں چوکتے ہو۔"

"اب چلو بھی یہاں سے، مجھے شدید الجھن ہو رہی ہے۔" میں نے پھر اصرار کیا۔

"کہاں چلو گے؟"

"فی الوقت تو اس احاطے سے باہر۔" میں نے جواب دیا۔

اینی کی نوجوان دوست اپنے ادھیڑ عمر کے شوہر کا ہاتھ تھامے۔ آگے بڑھ گئی تھی۔

اینی اس قبر کو تک رہی تھی جس کے سرہانے مرمریں مریم کی مورتی سفید پھول گرا رہی تھی۔

ہارڈنگ نے اس کا ہاتھ بڑے پیار سے اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ـــــــ

"اگر تم آج میری بات مان لو تو میں تمھیں زندگی بھر تنگ نہیں کروں گا۔"

اینی کا چہرہ جیسے شگفتہ پھول کی طرح دم بھر کو کھل اٹھا تھا۔

اینی کی آنکھوں میں جیسے جگنو بھٹک آئے تھے۔

اینی کی آنکھوں میں جو کچھ ہی دیر پہلے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔
اینی کی آنکھوں میں جن میں رونے کے بعد سرخیاں گھل مل گئی تھیں۔
ہارڈنگ نے ان آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے جگنو چھوڑ دیئے۔
میں چپ چاپ اینی کی آنکھوں کو تکتا رہا۔
اینی کی آنکھوں کو جو اس قدر حسین تھیں کہ ہارڈنگ کہتا تھا، موت ان آنکھوں تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکتی۔
اینی جیسے ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔
پھر اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور سر جھکا کر سسکنے لگی۔
ہارڈنگ نے اینی کو آگے بڑھ کر تھام لیا ــــــ وہ دونوں آگے آگے تھے ــــــ میں اور بروج پیچھے چل رہے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے تابوت کے پیچھے چل رہے ہوں۔
موم بتیاں قبروں پر جل رہی تھیں ــــــ موم بتیاں قبروں کے اطراف انسانی صورتوں میں چل پھر رہی تھیں۔
گیٹ پر پہنچتے پہنچتے میں نے پھر اس بڑھیا کو دیکھنے کی کوشش کی جو اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی سے باتیں کرنے کے لیے اس طرح آئی تھی جیسے زندگی موت سے نہیں موت زندگی سے ملنے کے لیے چلی آئی ہو۔
لیکن میں اس بڑھیا کو نہیں دیکھ سکا۔
مجھے وہ عورت بھی دکھائی نہیں دی جو اپنے تینوں بچوں کے ساتھ اپنے شوہر کی قبر کے پائنتی بیٹھی ہوئی تھی۔
ہم گیٹ سے باہر آگئے تو۔

بروج نے اینی سے پوچھا ـــــ کہاں چلوگی اینی ۔

ہارڈنگ نے چھوٹتے ہی کہا۔" "SHE IS AT MY DISPOSSAL"

میں نے علانیہ اس کے لہجے کی تلخی کو محسوس کیا۔

بروج نے مسکرا کر اپنی باہیں ہارڈنگ کے گلے میں ڈال دیں۔

چلو میرے "ببل گم" تم جہاں چاہو سب وہیں چلیں گے۔

میں اس طرح خاموش تھا جیسے ابھی گریویارڈ کے احاطے ہی میں ہوں۔

بروج نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھنجوڑا۔

کہاں ہو تم ؟ ـــــ

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ہارڈنگ کہنے لگا ـــــ اینی کو جو سب سے زیادہ ہنسائے گا اس کے حصے میں سب سے زیادہ شراب آئے گی۔

میں نے پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ جیسے سارے کا سارا گریویارڈ میرے سینے میں آچھپا ہو ـــــ بظاہر اس قدر اداس ہونے کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی۔

مجھے کبھی اینی کے بھائی کا خیال آتا۔

کبھی اس بڑھیا کا، کبھی تین بچوں والی جوان عورت کا، کبھی کتبوں پر کندہ کیے ہوئے ان الفاظ کا جن کو میں بغور پڑھتا رہا تھا۔

ہم "کوالٹی" کے لیے روانہ ہو گئے ـــــ

میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کی تو بروج میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا ـــــ

اینی ہارڈنگ کے ساتھ اس کی موٹر سیکل پر تھی۔

ٹینک بند پر پہنچتے پہنچتے ہمارا موڈ کافی حد تک بدل چکا تھا۔

اینی مسکراتی مسکراتی اب بھی کہیں کھوسی جاتی لیکن ہارڈنگ دُنیا بھر کی مسکراہٹیں آج جیسے اینی ہی کے لبوں پر دیکھنے کی ٹھان بیٹھا تھا۔

وہ پتہ نہیں اس سے کیا باتیں کر رہا تھا۔ اینی آہستہ آہستہ مسکراہٹوں کے آگے جیسے سپر ڈال رہی تھی۔

بروج نے مجھ سے کہا "اینی سے اجازت لے لوں تو تمھیں آج ایک بہت اچھی سی بات بتاؤں۔

"میں نے کہا لے لونا اجازت" —— اور اسکوٹر کی رفتار بڑھا کر اینی کے برابر لے آیا ——

بروج کہنے لگا "ابھی نہیں۔"

میں ہارڈنگ سے مخاطب ہوا تو بروج نے پیچھے سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے پہلے اینی سے اجازت لینی ہے، اس وقت تک تمھارے صبر کو آزمانے دو۔"

اسکوٹر ہارڈنگ کے برابر آگئی تو اس نے موٹر سیکل کی رفتار اس طرح تیز کی جیسے مجھے چیلنج کر رہا ہو۔

میں نے اس کو روکتے ہوئے کہا کہ میں کبھی بھی اس کے اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے کہ میری بیوی ہے، بچے ہیں ——

اینی نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ ہارڈنگ کو تیز چلانے سے روکا تو اس نے قہقہہ لگا کر اپنی "سن بیم" کو آہستہ کر لیا ____

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اینی سے کہہ رہا تھا۔

"تمھیں کس بات کا ڈر ہے جب کہ تمھیں شوہر ہے نہ بچہ۔"

اینی نے بڑے انداز سے اپنی زلفیں سنوارتے ہوئے جواب دیا ____

"زندگی صرف اسی لیے ہی تو خوبصورت نہیں ہو جاتی ____ وہ بہرحال قیمتی اور حسین ہے۔"

ہارڈنگ کہنے لگا "اتنا پیار ہے تمھیں زندگی سے۔"

____ اور اس نے اینی کو چھیڑنے کے لیے رفتار بڑھا دی۔

یہ سلسلہ ٹینک ہنڈ کے پار ہونے تک جاری رہا ____ وہ ہنستا، رفتار تیز کر دیتا ____ اینی اس سے چمٹ جاتی تو وہ رفتار کچھ اور تیز کر دیتا ____ اینی ڈرنے لگتی تو رفتار پھر دھیمی ہو جاتی۔

کوالٹی پہنچ کے تو اینی نے اطمینان کا سانس لیا۔

کوالٹی اپنی نیم خوابیدہ اور نیم بیدار فضاؤں کے لیے مشہور رہے۔ وہاں پہنچ کر کچھ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے زندگی ایک ننھی منی سی خوشی ہے لیکن کہیں نہ کہیں کوئی غم گھات لگائے بیٹھا ہے۔

دھیمی دھیمی ریڈیو گرام کے لَے، مدھم مدھم روشنیاں، بوجھل بوجھل ماحول دبے دبے قہقہے، سرگوشیوں کے انداز میں باتیں، جیسے ہر ایک سو سوتن سے کوئی چیز چھپا رہا ہو، ایسی چیز جو بہت زیادہ قیمتی ہو ____

مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگ بڑے چاؤ سے ساری دنیا کی آنکھوں سے بچا کر اپنی زندگی کے غم یہاں لے آتے ہیں اور ایک دوسرے کی نظر سے بچ کر بڑے جتن سے کونے کونے میں چھپاتے پھرتے ہیں۔ جب لوٹتے ہیں تو پتہ نہیں ساتھ لے جاتے ہیں یا یہیں بھول جاتے ہیں۔

کوالٹی میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی ہمیں ہمارا مخصوص "کارنر" مل گیا جہاں بیٹھ کر ہم نے محسوس کیا جیسے ہم نے بھی یہاں کسی وقت اپنا کچھ رکھ چھوڑا تھا دیواروں میں لگے ہوئے گہرے نیلے جالی دار ادھ کھلے کنول روشنیاں اس طرح پھینک رہے تھے جیسے روشنیاں بھی بڑے جتن سے رکھنے کی کوئی قیمتی شئے ہوں۔

روشنیاں در و دیوار سے جیسے کچھ دور دور تھیں۔ کچھ قریب قریب تھیں۔

سامنے دیوار پر بہت ہی حسین سے گول حلقے میں دو سرخ ٹپکوں کو دو کانٹے اس طرح چھو رہے تھے جیسے چھوتے ہوئے ڈر رہے ہوں۔

"اب یہاں کیا پڑھ رہے ہو"۔ ہارڈنگ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔ میں نے حسین حلقے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا ـــــ آٹھ بج رہے ہیں۔

اینی کے لیے شیری اور سب کے لیے سولن کے ساتھ ہی ہارڈنگ نے بیرے کو ایک لمبی چوڑی لسٹ سنا دی ـــ پرانس، فش، ہیم۔

میں نے ہیم فہرست سے نکلوا دیا ـــ ہیم یہاں اتنا لذیذ تیار نہ ہوتا تھا جتنا چینیز میں۔

ـــ اینی نے میری تائید کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہم زندگی سے قریب تر ہوتے گئے۔

کچھ ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے زندگی ہمیں پکڑ رہی ہے، ہمیں چوم رہی ہے، ہمیں سینے سے لگا رہی ہے۔

اینی خوش تھی ــــ ہم سب خوش تھے ــــ اس کی آنکھیں بے پناہ حسین ہو گئی تھیں۔

مجھے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اب بھی ڈر ہو رہا تھا۔

کتنی وسعت ہے ان میں، کتنی گہرائی ــــ

کون ہوگا جو ان آنکھوں میں رہ بس کر ان کا مقدر ہو گیا ہوگا۔

کون ہوگا وہ ــــ

جانے کیوں بروج کا چہرہ اس سوال کا جواب بن کر میرے ذہن میں بار بار ابھر رہا تھا ــــ

آہستہ آہستہ ہماری مسکراہٹیں دھیمے دھیمے قہقہوں تک پہنچ رہی تھیں۔

ہارڈنگ پرانی یادوں کے خزانے سے کرید کرید کر ایسے جواہر ریزے نکال رہا تھا جن کے انمول ہونے کا اندازہ غالباً اینی کو ہو سکتا تھا ــــ لیکن میں بھی ان کے پرکھنے میں دلچسپی محسوس کرتا رہا۔

بروج کچھ اس عالم میں تھا جیسے اس کو دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے۔

بالکل مطمئن ــــ اتنا مطمئن کہ اس قدر اطمینان سے آدمی چھوٹا معلوم ہونے لگتا ہے۔

بھری ہوئی پلیٹوں سے ہارڈنگ نے پرانس اور فش کے قتلے اس احتیاط سے

اینی کی پلیٹ میں اُتار دیئے، جیسے کوئی کسی کے دل میں چپکے سے جگہ بنا رہا ہو۔

اینی نے ہارڈنگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

"تم کتنا کھلا دینا چاہتے ہو مجھے؟"

"اتنا!" اس نے بڑے پیار سے اینی کی ناک اپنی چٹکی میں لے کر مروڑ دی۔

اینی کہنے لگی "بچپن میں تمھاری اس حرکت پر میں کس قدر خفا ہوتی تھی۔"

"تو کیا اب خوش ہوتی ہو؟" ہارڈنگ نے غیر متوقع طور پر پوچھا۔

"کچھ ایسا خاص تو نہیں۔"

"پھر بھی ذرا سا؟"

"نہیں بالکل نہیں۔"

پیروج نے اینی کی باچھوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو جلانے کے لیے لائٹر جلایا۔ اینی سگریٹ جلا چکی تو اس نے ایک لمبا کش لے کر پیروج کو بغور دیکھا۔ پھر ایک اور کش لے کر کہنے لگی۔

"آج تم دونوں سے میں بڑی شرمندگی سے معافی چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اپنی شادی کی تم دونوں کو اطلاع نہیں دی۔"

"کیا معنی؟" ہارڈنگ نے ہونٹوں سے لگا ہوا جام میز پر رکھ دیا۔

"ایک ہفتہ ہوتا ہے میری شادی ہو کر" اینی بڑے اطمینان سے یہ بات کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو پھر میں تیسرے آدمی کو جن سے تم معافی نہیں مانگ رہی ہو مبارک باد

دے سکتا ہوں۔

ہاں ــــ اینی نے بڑی نرمی سے کہا۔

میں نے بڑی گرمجوشی سے بروج سے ہاتھ ملایا۔ اس کے خوبصورت مستقبل کے لیے نیک تمنائیں پیش کیں۔

ہارڈنگ نے اٹھ کر بروج کو گلے سے لگا لیا ـــــ اور پھر اپنی سیٹ سنبھالتے سنبھالتے اس نے اینی کی ناک اپنی چٹکی میں لے کر مروڑ دی۔

شریر کہیں کی ـــــ مجھ سے چھپایا کیوں تم نے ــ ہارڈنگ نے بڑی محبت سے شکوہ کیا ــ اینی نے ہارڈنگ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پھر ایک بار معافی مانگی۔

میں نے کہا "چلو سستے چھوٹے ــ ورنہ کوئی اچھا سا تحفہ تو دینا ہی ہوتا"

"تحفہ تو اب بھی دینا ہی ہوگا" ہارڈنگ نے کہا۔

"کیوں دیں ــــ اُلٹے جرمانہ بھی تو لیا جا سکتا ہے"

ہارڈنگ لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا ــــ غم کی کوئی پرچھائیں دور دور تک اس کے چہرے پر نہ تھی۔

میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا ــــ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بے نام سا غم چپکے سے دل میں بس رہا ہے۔

ہارڈنگ کہہ رہا تھا میں تمھیں بالکل نیا تحفہ دوں گا ــــ ایسا تحفہ جو صرف میں تمھیں دے سکتا ہوں ــــ شریر کہیں کی ــــ اس نے اینی کی ناک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اینی نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چھپاتے ہوئے کہا ــ

تم میرے لیے میری ناک ہی سلامت رہنے دو تو بس کافی ہے۔

بروج نے جماہی لی تو ہارڈنگ نے اس کا گلاس بھر دیا۔

وہ خود بہت تیز تیز پی رہا تھا ——— میں نے اس کو ٹوکا بھی۔

اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال کر کہا ——— یار آج پی لینے دے نا ———"

یہ بات اس نے کچھ اس انداز سے کی تھی جیسے میرا دل پکڑ کر سارا خون نچوڑ رہا ہو ———

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سب سے بے نیاز ہو کر والٹی کے خوابیدہ گوشوں میں کچھ تلاش کر رہی تھیں ——— اپنے غم اوروں کے غم۔ جیسے وہ سب کو اپنا لینا چاہتا ہو۔

میں نے کہا اُب چلنا چاہیئے۔ بہت ہو گئی ہے۔"

ہارڈنگ نے پوچھا۔ رات یا رم۔

اینی نے کہا ——— دونوں ہی ———

ہارڈنگ باہر نکلتے نکلتے لڑکھڑا گیا تو بروج نے اس کو سنبھال لیا۔

ہارڈنگ نے اس کو بغور دیکھا۔ مسکرایا اور چپ چاپ آگے بڑھ کر اپنی "وسن بیم" اسٹارٹ کر لی۔

اینی کہنے لگی "میں تمھارے ہی ساتھ چل رہی ہوں۔ آہستہ چلاؤ گے نا۔"

ہارڈنگ نے اینی کی ناک مروڑ دی۔ پھر گال تھپتھپا کر کہنے لگا "تم میرے ساتھ آسکیتی اینی تو میں ساری زندگی ہی کو آہستہ آہستہ چلاتا رہتا۔ بالکل اس گاڑی کی طرح جس کے

پہیوں میں پھول بندھے ہوں ــ لیکن اینی میں تمھیں راستے میں پھر ایک بار ملوں گا ــ تمھارے لیے تحفہ لے کر ــ تمھارا منتظر ــ اور پھر تم اس قدر آسانی سے مجھے راستے پر چھوڑ کر آگے نہیں جا سکو گی۔ فی الوقت تو یہ روح میرے ساتھ ہے مجھے اس کی زندگی بھی پیاری ہے اور خود اپنی بھی۔

اس نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی موٹر سیکل ٹیڑھا لی ــ پلٹ کر ہم لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہاتھ ہلایا اور دیکھتے کے دیکھتے اس قدر تیزی سے طوفان کی طرح روانہ ہوا کہ مجھے وحشت ہونے لگی۔

میرے ذہن میں کوئی خیال بجلی کی رو کی طرح آیا۔

میں نے فوری اپنی اسکوٹر سنبھال لی۔

اینی ٹری خوف زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

میں نے کہا ــ یہ بہت بُرا ہوا اینی "۔ میں کچھ اور کہہ نہ سکا۔

اینی میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی ــ اس نے کہا۔

میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ــ تم چلو ان کے پیچھے "۔

وہ بہت فاصلے پر ہواؤں سے باتیں کر رہے تھے ــ ہم ٹینک بینڈ پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے اپنی اسکوٹر اس قدر تیز کر دی تھی کہ مزید رفتار بڑھانے پر حادثہ یقینی تھا۔

اینی بے تحاشہ پکار رہی تھی ــ ہارڈنگ، ہارڈنگ۔

ہارڈنگ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا ــ ہارڈنگ آندھیوں کا مذاق اڑا رہا تھا ــ ہارڈنگ زندگی سے بھاگ رہا تھا۔ ہارڈنگ موت کا پیچھا کر رہا تھا ــ

لیکن برروج بے چارہ۔

اینی چیخ رہی تھی، میں چیخ رہا تھا۔

رک جاؤ ہارڈنگ، خدا کے لیے رک جاؤ۔

اینی میری پشت پر اپنا چہرہ رکھ کر سسکنے لگی ــــ جیسے وہ غنودگی کے عالم میں ہاتھ بڑھا کر کسی کو پکڑ رہی تھی ــــ رک جاؤ، رک جاؤ۔ برروج ٹھیرو!"

مجھے بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا ــــ مجھے بالکل صاف سنائی دے رہا تھا۔

ہارڈنگ ڈبل ڈک کے بالکل مقابل تھا ــــ ڈبل ڈک کا ہارن مسلسل بج رہا تھا۔

پھر میں نے ایک آواز سنی ــــ میری آنکھوں میں روشنیاں مچلنے لگیں۔

مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں ــــ مجھ میں اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

اینی میرے پاس نہیں تھی ــــ لوگوں نے بتایا کہ اس کو ہاسپٹل پہنچا دیا گیا ہے ــــ وہ بالکل بے ہوش تھی۔

میں بے حس و حرکت چپ چاپ کھڑا رہا۔ کوئی پولیس انسپکٹر مجھے تسلی دے رہا تھا۔ مجھے پھر چکر سا محسوس ہوا ــــ اسکوٹر کا سہارا لے کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ آنکھوں پر جیسے کوئی چپکے سے ہاتھ رکھ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے ہارڈنگ اور برروج کو ایک دوسرے کے برابر دفنا دیا گیا تھا ــــ اینی غالباً اب تک ہاسپٹل ہی میں تھی ــــ میرا ذہن بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا ــــ جی چاہتا تھا کہ خوب خوب ہنسوں، پھر چلا چلا کر رو پڑوں ــــ

اتنا روؤں کہ ہارڈنگ انیؔ سن ہیم کا رخ میری طرف پھیر لے ــــ میرا ذہن جاگتا تو آنکھیں صرف یہی دیکھتیں کہ ہارڈنگ ہواؤں میں موت کا پیچھا کر رہا ہے ــــ بروج اس کو روک رہا ہے چلا رہا ہے۔

مجھے بروج اور انیؔ کی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔

گریو یارڈ سے نکل کر میں سیدھے بار پہنچا۔ لیکن گریو یارڈ میرے ساتھ ساتھ سڑکوں پر چل رہا تھا۔ وہ ہر موڑ پر میرا پیچھا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بار میں بھی میرے ساتھ تھا۔

مجھے کبھی ہارڈنگ زیادہ یاد آتا کبھی بروج۔ کبھی میرے ذہن نے ہارڈنگ کے خلاف بھی سوچا ــــ کبھی میں نے بڑی مشکل سے آنسو روکے جن میں سے شائد دو ایک تو شراب میں مل گئے ہوں۔

میں اسی طرح دیر تک پیتا رہا۔ پھر یکایک اٹھا ــــ پتہ نہیں کون مجھے گریو یارڈ لے جا رہا تھا۔ گیٹ میں داخل ہوا تو کسی کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

انیؔ ہی ہو سکتی ہے۔ انیؔ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ــــ

میں قریب پہنچا تو انیؔ نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

وہ بالکل گھائل ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی ــــ اس کا چہرہ مٹی میں اٹا ہوا تھا جو آنسوؤں سے نم ہو کر اس کے گالوں، پیشانی اور ناک پر لگ گئی تھی۔

میں نے دھیرے سے کہا ــــ "انیؔ تم غلط سمجھ رہی ہو ــــ یہ بروج کی نہیں ہارڈنگ کی قبر ہے۔"

انیؔ نے مجھے تڑپ کر دیکھا اور پھر اسی قبر سے چمٹ کر سسکنے لگی۔



فرائڈ فش کی پلیٹ سے اس نے آخری قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا، پھر قتلے سے آخری کانٹا نکال کر فرش پر پھینک دیا۔

زبیدہ نے تنک کر کہا "دوسروں کی راہ میں کانٹے بچھانے سے اپنے تلوے محفوظ نہیں ہو جاتے۔ شیکھر نے بات سُنی ان سُنی کر دی اور زبیدہ سے مخاطب ہوئے بغیر رم کا آخری قطرہ گلاس سے حلق میں انڈیل لیا۔ زبیدہ نے اصرار کیا۔ "بات سُن چکے ہو تو چاہے کانوں میں انگلیاں رکھ لو چاہے اس طرح پوز کرو کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑتا۔ بات جو بلیٹ کی طرح دل میں کھب گئی ہے اپنی جگہ اہم ہے۔ گھاؤ کر کے ہی رہے گی۔"

شیکھر نے اب کی بار بھی کچھ نہیں کہا۔ اس کی نشیلی آنکھوں نے صرف ڈاکٹر کو دیکھنے ہی پر اکتفا کیا۔ لیکن ڈاکٹر چوں کہ چبھتی نگاہوں سے اپنی بیوی زبیدہ کو فقرے بازی سے باز رکھنے کے لیے کہہ رہا تھا اس لیے اس نے شیکھر کی آنکھوں کی زبان نہیں سمجھی جس میں ڈاکٹر کے لیے رحم بھی تھا ہمدردی بھی۔

ابوالبشر نے کاگ اڑایا تو ڈاکٹر نے اپنا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا کہ ایک آخری گھونٹ شیکھر کے اس شکار کی خوشی میں جس کے سینے کو چھیدنے کے لیے اس کی بندوق کی نالی میں پہلی بلیٹ بے چین ہے۔ ابوالبشر نے ڈاکٹر کے گلاس پر رم کے تازہ کھلے ہوئے شیشے کو جھکایا تو زبیدہ برہم ہوگئی۔ اس نے غصے میں شیشے کے منہ کو اپنی نازک انگلیوں سے ڈاکٹر کے گلاس میں جھکا دیا۔ ابوالبشر کے شیشہ ہٹانے تک ڈاکٹر کے حصے میں کافی شراب آچکی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے زبیدہ کو دیکھا لیکن زبیدہ کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہٹاتے اس کی نظروں کی ہراسانی پیار سے بدل گئی۔ زبیدہ نے بھی جواباً مسکرا کر اس کو پیار سے پچکارا۔ بس بھی کرو ڈارلنگ بس ہو چکا شکار اس طرح تو...۔ ابوالبشر نے کہا آج کچھ نہ کچھ تو مار کر ہی رہے گا شیکھر۔ نر نہ سہی ناری ہی سہی"۔ ابوالبشر سب میں زیادہ پیے ہوئے تھا۔ جملہ ادا ہوتے ہوتے جیسے الفاظ خود نشے سے بوجھل ہو کر لڑکھڑا رہے تھے۔

شیکھر نے کہا، میری بندوق میں کوئی بلیٹ کسی ناری کے لیے نہیں ہے میری بندوق کو آج تک یہ توہین گوارہ نہ ہوئی۔ جانے کتنے "کالے" آج ہرنیوں کے غول سے کم ہو جائیں گے۔ جانے کتنی ہرنیاں اپنے پیاروں کے لیے جنگل جنگل تڑپتی پھریں گی۔ ہرنیوں کو اس طرح تڑپانے سے نروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میری بلیٹ اسی سینے کو چھیدتی ہے جس سینے میں اتر جانے سے ہرنیوں کے کلیجے دہل اٹھتے ہیں۔

زبیدہ نے جھٹ سے لن ترانی شروع کی۔ ہرنیوں پر گولی چلانا کوئی بہادری نہیں ہے۔ ان کو اس طرح تڑپا کر بھی تو تم ایک خوشی کا خون کرتے ہو۔ ایک امید کا خون کرتے ہو، ایک اُجالے کا خون کرتے ہو۔ تم کسی "کالے" کی آنکھوں کو بے نور

ہیں کو اکب کچھ...
کر کے سمجھتے ہو کہ بے شمار ہرنیوں کی آنکھوں کا نور نہیں چھینا ہے اور اس خود ساختہ اصول پر اتراتے ہو۔ میں کہتی ہوں چُن چُن کر ایک ایک ہرنی کو مار دو۔ جب تم اپنے خونی کھیل سے اکتا جاؤ تو آخری گولی "کالے" کے سینے میں اتار دو اور اپنی نشانہ بازی پر ناز کرتے پھرو۔ کیا کبھی تمھارے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جنگل میں چوکڑی بھرتی ہوئی یہ خوبصورت ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورت کی طرح بے زبان ہیں۔ تم "کالے" کو مارتے ہو تو میں سوچتی ہوں جیسے تم نے کسی عورت کا سہاگ چھین لیا۔ میں دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ کاش تم مسکرانے کی بجائے اس وقت شرم محسوس کر سکتے۔

شیکھر نے بالکل غیر متوقع طور پر اپنی بندوق اٹھائی اور ہوا میں فیر کر دیا۔ لمحے بھر کے لیے سب سہم گئے اور اس نے اپنا خالی گلاس میز سے اٹھا کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا اور اطمینان سے مسکرانے لگا۔ ڈاکٹر نے شراب گلاس میں انڈیلتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہا "شیکھر بھئی تم زبیدہ کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ وہ بڑی جذباتی ہے اور ہمیشہ تم سے بات بے بات الجھتی ہے۔ میں اس کو بہتیرا سمجھاتا ہوں کہ اس نے تمھیں غلط سمجھا ہے لیکن وہ تم سے انصاف نہیں کر پاتی ـــــ دیکھو کس طرح سہمی ہوئی ہے!

شیکھر نے بات کاٹ دی۔ شراب میں سوڈا ملا کر تھرموس سے برف نکالتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ تم اپنی مسز کو ذرا اچھی طرح سمجھا دو ورنہ کیا عجب ہے یہ گولی تمھارے سینے میں اتر جائے۔ اس لیے کہ میرے ایمان میں ہرنیوں کو مارنا حرام ہے ہی ـــ دونوں نے قہقہہ لگایا۔ ابوالبشر نے زبیدہ کو کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ شیکھر کو کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

ہیں کوا کب کچھ....

ڈاکٹر نے شیکھر کی گود سے بندوق لیتے ہوئے کہا کہ پیارے تمھیں قسم ہے تمھاری بندوق اور تمھاری جیپ کار کی، یہ ظلم کبھی نہ کرنا تمھاری اس حرکت سے مجھے تو شہادت کا درجہ مل جائے گا، اور شہیدوں کی جگہ صرف جنت میں ہے اور جنت مجھے کسی قیمت پر بھی گوارہ نہیں ہے۔ میں دوزخ کا شیدائی ہوں مجھ سے دوزخ چھین لوگے تو جنت میں میری روح دوزخ کے لیے تڑپتی رہے گی۔

زبیدہ نے منہ بنا کر کہا کہ تمھیں تو ہمیشہ مذاق ہی سوجھتا ہے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے بڑی محبت سے زبیدہ کو دیکھا اور کہنے لگا کہ سچ کہتا ہوں زبی بھلا یہ ابوالبشر صاحب کی جنت کوئی رہنے کی جگہ ہے۔

سنو میں نے کل رات کو ایک خواب دیکھا۔ شیکھر ہی کے ساتھ شکار کی تلاش کرتے رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہم بھٹکتے رہے شیکھر کی جیپ کار کا بھی روشنیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ نہ جیپ کار کے ہیڈلیمپس کام دے رہے تھے نہ سرچ لائٹ میں اُجالے کی ایک کرن ہی تھی اور اندھیرا تھا کہ بڑھ کر ہر چیز کو نگل رہا تھا۔ ایسا اندھیرا جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ شیکھر جو میرے برابر بیٹھا تھا گھور گھور کر دیکھنے پر بھی نظر نہیں آرہا تھا — میں نے محسوس کیا کہ ہم کسی ایسی دنیا میں ہیں جو ہماری دنیا سے کچھ مختلف ہے۔ میں نے چیخ کر شیکھر کو پکارا۔ آواز جیسے میرے حلق میں اٹک رہی تھی۔ بدقت تمام میں اسے پکار سکا۔ لیکن شیکھر نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اسٹیرنگ پر شیکھر نہیں تھا — پھر یہ جیپ کس طرح چل رہی ہے؟ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ اُجالے میں چمک رہا تھا۔ میری عقل ماؤف تھی۔ ہاتھ کو جگمگاتی ہوئی روشنی سے بمشکل ایک انچ ہٹ کر ہی بے پناہ تاریکی تھی میں نے ہاتھ ہٹالیا۔ روشنی کا

وہ دائرہ جو میرے ہاتھ کو محیط کیے ہوئے تھا۔ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اب میں سر تا قدم کانپ رہا تھا۔ جیپ بالکل اس طرح چل رہی تھی جیسے اب الٹ جائے گی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیپ کوئی اور چلا رہا ہے جو اناڑی ہے۔ شیکھر تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے میں نے پھر پکارا "شیکھر تم کہاں ہو" چار الفاظ کے اس چھوٹے سے جملے کو ادا کرنے میں میری ساری چرب زبانی جیسے گنگ ہو گئی تھی ایک مہیب سی چیخ ساری فضا کو جھنجوڑ کر میرے کان کے پردوں کو چھیدتی ہوئی میرے دل و دماغ پر بجلی بن کر گری۔ میں نے مارے خوف کے آنکھیں میچ لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے صاف دکھائی دینے لگا۔ کاش یہ سب کچھ مجھے دکھائی نہ دیتا۔ دوڑتی ہوئی جیپ کار کے سامنے شیکھر بھاگ رہا تھا۔ اس کا جسم کالے کا تھا۔ اس کے پیٹ میں دائیں بائیں دو تیر پیوست تھے اور خون رس رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق دانتوں میں پکڑ رکھی تھی۔ جیپ کار پیچھے تھی اور وہ آگے تھا۔ لیکن اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں تو ہم ایک بہت بڑے آہنی دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ جیپ کے چاروں پہیے پنکچر ہو چکے تھے۔ آہنی دروازے سے اس قدر لو نکل رہی تھی کہ میں وہیں پانی بن کر اور پھر بھاپ میں تبدیل ہو کر کہیں اڑ جاتا اگر جیپ آہنی دروازوں کے درمیان ٹھہر جاتی۔ ہم جب دروازے کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو ایک لق و دق صحرا دور دور تک نظروں کو محیط کیے ہوئے تھا۔ ایک عجب فضا تھی جو سناٹوں، بے کیفیوں اور راداسیوں سے مل جل کر جنم لیتی ہے اور جسے صرف دل محسوس کر سکتا ہے اور یہ احساسات آنسو بھی نہیں بن سکتے جیپ رک گئی۔ گرمی بے پناہ تھی۔ شیکھر سہما ہوا میرے پاس ہی کھڑا تھا۔ میری نظر یکایک

شیکھر پر پڑی تو میں نے جیب سے چھلانگ لگا کر اس کو چمٹا لیا۔ ہاتھ پھیر پھیر کر اس کے بدن کا جائزہ لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پہ برابر تھی۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ شیکھر تم "کالے" کس طرح بن گئے تھے۔ یہ ہم کہاں آ گئے ہیں لیکن میرا گلہ رندھا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ شیکھر سے لپٹ کر خوب خوب رولوں سو وہ بھی ممکن نہ تھا اس لیے کہ رونے کے لیے آنسو ہی نہ تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ جب آنکھیں بہت جلنے لگیں تو شیکھر چیخ مار کر مجھ سے جدا ہو گیا۔ "ڈاکٹر تمھاری آنکھیں کہاں ہیں؟۔ آنکھوں کی جگہ دو دہکتے ہوئے انگارے ہیں ڈاکٹر ــــ اور ان انگاروں سے میرے گال جل گئے ہیں۔" مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیکھر کے گالوں پر واقعی دو انگارے دہک رہے تھے اور بس ــــ کچھ عجیب سی غنودگی ہم پر طاری رہی۔ پھر یہ غنودگی مکمل بے ہوشی سے بدل گئی ــــ اور جب مجھے ہوش آیا ہے تو دور تک دھند ہی دھند پھیلی ہوئی تھی ــــ انتہائی گرمی بھی اور کہر بھی۔ اب یہ احساس ہی مٹ چکا تھا کہ یہاں کی ہر چیز اپنے خواص سے عاری کیوں ہے دن رہے گا تو اجالا نہیں رہے گا۔ روشنی رہے گی تو اندھیروں کا غلاف اوڑھے ہوئے رہے گی۔ تارے نظر آئیں گے تو ٹھنڈک کا نہیں حدت کا احساس ہوگا ــ میں کچھ اسی قسم کی باتیں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میرے پاس ہی ایک قہقہہ بلند ہوا۔ حالانکہ قہقہے کی آواز کچھ مانوس سی تھی۔ لیکن میں غیر شعوری طور پر اس قہقہے سے بھی سہم گیا کیوں کہ کسی قبرستان کی فضا میں قہقہہ کیا معنی رکھتا ہے، اور پھر وہ شخصیت کون ہوگی جو اس فضا میں بھی قہقہہ لگا سکتی ہے ــ وہ آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے سوکھے درخت کے نیچے جس کی بے برگ و بار خشک

ٹہنیوں پر قطار اندر قطار الّو بیٹھے ہیں، دو آدمی ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہے ہیں لیکن بات کرتے ہوئے جب وہ ہنستے ہیں تو ان کا چہرہ بسورتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہماری طرف ان میں سے ایک نے دیکھا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر اتنا کہا کہ بے چارے نووارد ہیں۔ جہنم کی ہوا ابھی انھیں لگی نہیں ۔ دو ایک روز میں پر پرزے نکالیں گے۔ میں اور شیکھر غور سے ان کی باتیں سن ہی رہے تھے کہ منہ میں پائپ لگائے ہوئے ایک شخص گرم سوٹ پہنے ہوئے ادھر آنکلا۔ سو کھے پیڑ سے پیٹھ لگائے ہوئے جو شخص کھڑا تھا وہ فوراً آگے بڑھا اور سوٹ پہنے ہوئے صاحب بہادر کے قریب پہنچ کر انھیں بغور دیکھنے لگا پھر فوراً بڑھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت مسرت سے پوچھنے لگا کہ حضور آپ ادھر کدھر آگئے۔ سوٹ پہنے ہوئے حضور نے پائپ کا لمبا سا کش لے کر بڑے شانِ استغناء سے کہا کہ بھئی تم نے ہاسٹل کی بلڈنگ والے معاملے میں جو مجھے پانچ فی صد دلایا تھا نا بس اسی ایک قصور کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ تمھاری عنایات شامل حال نہ ہوتیں تو میں تم سے یہاں کسی طرح نہ ملتا۔ وارڈ نمبر (۳) کی چھت بیٹھ جانے سے جتنے مریض دواخانے میں مرے تھے سالے سبھوں نے میرے خلاف گواہی دی۔ میں کہتا نہیں تھا کہ یہ (۳) کا ہندسہ ہی بُرا ہوتا ہے۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ میٹریل جو سپلائی کیا گیا تھا وہ خود بہت ناقص تھا لیکن یہاں حاکمانِ جزا و سزا بالکل جاہل قسم کے لوگ ہیں۔ پہلے تو ان کی مخلوق ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ہیں کیا۔ وہ نظر ہی نہیں آتے، صرف الٹی سیدھی آوازیں نکالتے ہیں۔ جواب دیتا ہوں تو جواب الجواب نہیں ملتا۔ جواب کیا دیں گے بے چارے۔ انجینیری کا فن ہے کوئی مذاق نہیں۔ یہ لوگ فن سے بالکل نابلد ہیں۔ مجھے دکھ ہے تو اسی بات کا کہ جوہر ناشناس

ہیں کواکب کچھ .....
لوگوں سے سابقہ پڑگیا ہے۔ رشوت وشوت تو چلتی ہی تھی لیکن تم ہی بتاؤ گتے دار صاحب کیا میں ملک کے چوٹی کے فنکاروں میں نہیں تھا لیکن یہ اہلِ دوزخ فن کی قدر ہی نہیں کرتے۔ میری خدمات انھیں حاصل ہوں تو قسم ہے اس دوزخ ہی کو جنّت بنا کر نہ رکھ دوں تو نام نثار اللہ ولد وفا اللہ نہیں۔ لیکن انجینئر صاحب کی زبان سے اپنے اور اپنے والد محترم کے نام کی ادائی کچھ اس طرح ہو کر رہ گئی "نثال ولد وفال" گتے دار نے بہت ادب سے پوچھا کہ سرکار کیا کسی مصلحت سے نام اور ولدیت میں تھوڑی سی تبدیلی کرلی ہے ؟ انجینئر نے حاکمانہ انداز میں کہا کہ گتے دار صاحب دوزخ کی اس ناپاک فضا میں باری تعالیٰ کا نام ادا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص ادا کرنے کی کوشش کرے تو اس پر ناری دُرّے برسائے جاتے ہیں۔ تمھاری پیٹھ شاید آگ کے ان ہنٹروں کی شڑاپ شڑاپ سے واقف نہیں ہے۔ ہم دنیا میں سنتے تھے کہ۔ خو۔ (وہ پورا لفظ ادا نہ کرسکا) کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے لیکن یہاں معلوم ہوا کہ ہماری پیٹھ پر جو دُرّے برستے ہیں اور جس کی تکلیف سے ہم پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں دُنیا والوں نے اسی کا نام برق و باراں رکھا ہے ___ آس پاس دیکھ کر گتے دار نے آہستہ سے انجینئر سے پوچھا۔ سرکار تمبا کو نوشی منع ہے، پھر آپ یہ پائپ کس طرح ___ انجینئر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہش کہا۔ گویا یہ گتے دار کو خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو اس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ دیکھو فرشتوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں کے مراتب کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ جتنا عظیم المرتبت فرشتہ ہوگا اتنا ہی وہ دوسرے فرشتوں کی نسبت زیادہ دیکھ سکے گا، زیادہ سن سکے گا، اسی لیے احتیاط لازم ہے۔ رہ گیا

میں پائپ کس طرح پیتا ہوں تو سنو، میری نگرانی کے لیے جو فرشتہ مجھ پر متعین ہے اس کو پائپ بہت پسند آ گیا ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ ایک دن وہ پائپ پیے گا اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔ ایک دن میں پیوں گا اور وہ میری رکھوالی کرے گا۔ آج میری باری ہے۔ اتنے میں گنے دار نے سنا ایک بہت ہی سریلی گھنٹی کی صدا آئی اور جھٹ سے انجینیر نے پائپ اپنے پتلون کے اندر اس جیب میں رکھ لی جس میں وہ رشوت کی رقم اڑس لیا کرتا تھا لیکن یہ سب کچھ سن کر اور دیکھ کر گنے دار بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔

اب تو بات بالکل صاف تھی۔ میں نے اور شیکھر نے محسوس کر لیا کہ ہم اپنے کرموں کو بھوگ رہے ہیں۔ دنیا ہم سے چھوٹ گئی ہے اور یہ مقام جہاں ہم ہیں وہی مشہور و معروف دوزخ ہے جس کے تصوّر ہی سے ہم کانپ جاتے تھے۔

ڈاکٹر کی زبان ہمیشہ کی طرح قینچی کی مانند چل رہی تھی۔ کبھی مسکراہٹوں کبھی قہقہوں کے درمیان وہ مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔ جب وہ سگریٹ جلانے کے لیے رکا تو ابوالبشر نے کہا کہ ڈاکٹر لگے ہاتھوں پورا خواب ہی بیان کر دو۔ سوائے زبیدہ بہن کے یہاں کون ہے جو جنّت میں جائے گا۔ دوزخ سے اب مجھے بھی کچھ دلچسپی ہونے لگی ہے۔ اس لیے کہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی وہیں جانا ہے۔

ڈاکٹر نے بہت محبت سے زبیدہ کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا کہ "میں اپنی زبی کو کسی قیمت پر بھی جنّت میں نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرے بغیر سکھ سے کہاں رہ سکے گی۔ اس کے لیے ہر آسائش دوزخ ہی میں فراہم ہو جائے گی۔"

زبیدہ نے جھرجھری سی لی۔ "بھئی اس قسم کا مذاق تمھیں لوگوں کو مبارک ہو۔ مجھے کیوں اپنے ساتھ گناہ میں گھسیٹتے ہو۔"

ہیں کواکب کچھ ...

ڈاکٹر پھر گویا ہوا ــــ "سچ مانو زبی، یہ انجینئر اور گنتے دار مجھے یقین ہے وہ سب کچھ کر کے رہیں گے جو انھوں نے مجھے خواب میں کر دکھایا ہے۔"

شیکھر نے مداخلت کی "خیر آگے چلو بتاؤ کہ پھر کیا ہوا۔"

کیا ہونا تھا۔ بات صاف تھی۔ دوسری گھنٹی پہلی گھنٹی سے زیادہ سُریلی تھی۔

جھٹ سے صاحب نے پائپ نکالا اور منہ میں رکھ لیا۔ دھوئیں کے ننھے ننھے مرغولے اپنی خوشبو سے گنتے دار کو مسحور کرنے لگے۔ گنتے دار نے نہایت لجاجت سے کہا۔ سرکار، ایک دم مجھے بھی عنایت ہو تاکہ اس دم کے سہارے میں اپنی پچھلی زندگی کو کچھ دیر کے لیے یاد کر سکوں۔

صاحب نے پہلے تو کچھ پس و پیش کیا پھر مسکرا کر پائپ بڑھا دیا۔ گنتے دار نے پائپ کو منہ لگا کر جھوٹا کیے بغیر اپنے ہاتھ کی ڈھنکنی بنائی اور لمبا کش مارا ــــ آگ برف میں تبدیل ہو گئی تھی۔ صاحب مسکرایا۔ کہنے لگا میں جانتا تھا کہ تم پائپ کا لطف نہیں اٹھا سکتے اس لیے کہ تم اجازت یافتہ نہیں ہو۔ گنتے دار نے پائپ کو جھاڑ کر پھر کوشش کرنی چاہی۔ پائپ کو جھاڑنے سے برف کا ایک ٹکڑا نیچے گرا اور بے چارہ شیکھر جس کی زبان اور حلق پیاس سے سوکھ رہے تھے دو ہی جست میں برف کے ٹکڑے پر جھپٹا۔ لیکن اس کے منہ میں پہنچتے پہنچتے برف کا ٹکڑا پھر دہکتا ہوا انگارہ بن چکا تھا۔ ایک چیخ مار کر شیکھر نے دہکتا ہوا انگارہ تھوک دیا ــــ گنتے دار اور ہم سہم گئے تھے۔ لیکن صاحب پائپ منہ میں رکھے اطمینان سے دھواں اڑا رہا تھا۔

پائپ منہ سے نکال کر صاحب ہم سے مخاطب ہوا "کب آئے ہو؟"

"آج ہی بلکہ ابھی ابھی، کچھ ہی دیر پہلے جناب۔"

"کیا کرتے تھے؟"

"ڈاکٹر تھا۔"

"اور یہ جو تمھارے ساتھی ہیں؟"

"لینڈ لارڈ تھے۔ شکار کرتے تھے۔"

صاحب نے پائپ منہ میں رکھ کر حقارت سے دیکھا۔ کوئی بھی ہمارے کام کا نہیں۔ دونوں ہی قریب قریب ہم پیشہ نکلے۔ ایک جان بچانے میں مہارت رکھتا تھا اور ایک جان لینے میں ماہر تھا۔ یہاں ایسے کسی پیشہ ور کی ضرورت ہی نہیں اس لیے کہ موت کا ادھر گذر ہی نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی کسی کی جان لے سکتا ہے اور نہ بچا سکتا ہے۔

شیکھر نے اپنی بندوق چھپا لینے کی کوشش کی۔

صاحب نے بندوق پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور ہم سے مخاطب ہو کر کہا لینڈ لارڈ صاحبان یہ سارے کے سارے لینڈس اپنی ہی ملکیت سمجھئے اور ان کے چپے چپے پر سر پٹکتے پھریئے ——— ہم کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ صاحب نے گتے دار کو اشارہ کیا اور وہ دونوں آہستہ سے کھسک کر کہیں غائب ہو گئے۔

شیکھر نے مجھ سے کہا یار۔ سالا عہدہ دار بن بیٹھا ہے یہاں بھی۔

لیکن میں بہت اداس تھا۔ اپنے فن کی بے مائگی کا احساس مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ دنیا تک جا کر کوئی پیغام پہنچانے والا ملتا تو میں سب سے پہلی بات جو کہلواتا وہ یہی ہوتی کہ اب میرے خاندان میں کوئی شخص بھی یہ پیشہ اختیار نہ کرے۔

ہم دونوں پر پھر وہی رقت کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کچھ دیر یوں ہی بے دلی کے عالم میں ہم بیٹھے رہے۔ یکایک سامنے کی خاردار جھاڑی کے جھنڈ میں کچھ سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ایک بہت موٹا تازہ ننگ دھڑنگ آدمی اپنے دونوں ہاتھوں سے

رہیں کواکب کچھ ....
اپنی شرمگاہ چھپائے ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے وہ تلملا کر چیخنے لگتا۔ اپنے ننگے بدن کو بار بار تڑپ تڑپ کر سہلاتا۔ اس کی بے چینی دیکھی نہ جاتی تھی ـــــ شیکھر نے مجھے کہنی ماری۔ میں کھسک کر اس کے بہت قریب ہوگیا۔ کہیں ان مراحل سے ہم کو بھی تو نہیں گذرنا ہے شیکھر۔ لیکن شیکھر اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے ننگ دھڑنگ آدمی کے اطراف ہواؤں میں اڑتے ہوئے بے حساب کفن دیکھ رہا تھا ـــــ سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ہراسانی بڑھ رہی تھی۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب سانس رک جائے گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صاحب نے کہا تھا کہ یہاں سانس رک جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سوچ کر اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مرجانا بھی یہاں بس میں نہ تھا ـــــ ننگ دھڑنگ آدمی اچھل اچھل کر کسی نہ کسی کفن کو پکڑ لینا چاہتا تھا لیکن یہ کفن تھے کہ اس کی گرفت سے صاف بچ نکلتے۔ شڑاپ شڑاپ آوازیں آتیں اور وہ تڑپ تڑپ کر کبھی لوٹنے لگتا، کبھی بے تحاشہ بھاگنے لگتا۔

صاحب اطمینان سے باتیں کرتا ہوا اپنے گتے دار کے ساتھ ادھر آرہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ہمارے چہرے خود بخود دمک اٹھے۔ ہم لپک کر صاحب کے قریب ہوگئے۔ اب کے صاحب کے ساتھ ساتھ اس کے گتے دار نے بھی ہمیں حقارت سے دیکھا۔ میں نے بہت خوشامد سے ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صاحب سے سوال کر ہی لیا کہ یہ کون مظلوم ہے؟۔ صاحب بپھر گیا ـــــ تو تم نے یہاں ڈاکٹری کا پیشہ ترک کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا ظالم تمھیں مظلوم دکھائی دیتا ہے! ـــــ یہ کپڑوں کا بیوپاری ہے۔ جنگ کے زمانے میں جب کپڑا بہت

منہگا ہو گیا تو اس نے کفن بیچنا شروع کیا اور اسی بہانے اس نے بڑے بڑے پرمٹ حاصل کیے۔ مُردوں کو کفن کے لیے ترسا ترسا کر اس نے زندوں کا تن ڈھانکا اور بے حساب پیسہ ان سے بٹور لیا۔ نہ صرف اسی پر اکتفا کیا بلکہ باضابطہ نصف درجن اپنے کارندے مقرر کیے جن کا کام صرف یہی تھا کہ شہر بھر کی ہر تازہ قبر سے راتوں کو پھیری لگا کر کفن نکال لاتے۔

یا ___ اور میری زبان سے "اللہ" نہ نکل سکا۔ اس لیے کہ اس گنہگار فضا میں صرف لب ہل سکتے تھے لیکن اس لفظ کے تلفظ کی ادائی نہ ہو سکتی تھی شیکھر نے بہت حقارت سے ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا۔ میں نے دریافت کیا، صاحب اس کے چھبیسوں ساتھی کہاں ہیں؟ ___ صاحب نے بہت ہی یقین سے جواب دیا کہ وہ ابھی دنیا ہی میں ہیں۔ ان کے لیے بلائیں نازل کی گئی ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ چھ کے چھ ایک ہفتے کے اندر اندر یہاں بھیج دیئے جائیں۔ اب تو صاحب سے ہم بے اندازہ مرعوب ہو گئے۔ صاحب نہ صرف دوزخ میں پائپ پیتا پھرتا ہے بلکہ اس کو اس کا بھی علم ہے کہ دنیا کو یہاں سے کیا کیا احکام صادر کیے جاتے ہیں۔ میں صاحب سے کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے مجھے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

کیا تم اس آدمی کو پہچانتے ہو۔

گھبراہٹ میں میرے منہ سے جھوٹ موٹ نکل گیا کہ ہاں اچھی طرح جانتا ہوں۔

صاحب نے پیٹھ ٹھونکی اور کان میں کہا کہ بلیک مارکٹ کیا ہوا اور قبروں سے چرایا ہوا بے شمار کپڑا یہاں اس کے نام سے اسٹور کیا گیا ہے جو بروز حشر اس کی بدیوں کے حساب کتاب کے وقت گزوں سے نہیں میلوں سے ناپا جائے گا لیکن اس

بدبخت کی روح تڑپ تڑپ کر ابھی اُسی سمت بھاگ گئی ہے جہاں یہ کپڑا اسٹور ہے۔ تم اس سے کہہ دو کہ اگر وہ تین حصے ہمیں دے سکتا ہے تو ہم نہ صرف اس پر نازل ہونے والے عذابوں کو کم کرا دیں گے بلکہ کپڑے کا جو چوتھائی حصہ بچا ہوا ہے اس کے اہل و عیال کے لیے دنیا میں واپس کر دیں گے۔ اگر وہ سارے کا سارا کپڑا ہمارے حوالے کر دے تو اس کے ساتھیوں میں سے ایک نہیں دو کی جس کی بھی وہ سفارش کرے جاں بخشی کی جائے گی اور دنیا میں مزید دو سال دو ماہ، دو دن، دو گھنٹے، دو منٹ، دو سکنڈ رہنے کی اجازت دلوا دیں گے تاکہ اس طویل مدت میں وہ دونوں اس کے اور اپنے اہل و عیال کے لیے مستقبل کے کچھ سامان فراہم کر سکیں ــــــ صاحب کی یہ باتیں سن کر میں سر سے پیر تک کانپنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے صاحب کا دماغ خراب ہو گیا ہے وہ یہاں بھی بالکل دنیا ہی کے انداز سے کاروبار چلا رہا ہے۔ مجھ کو خاموش دیکھ کر صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔

ڈاکٹر تم پس و پیش کیوں کر رہے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ سودا میں اپنی منفعت کی خاطر کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں ــــــ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہماری یہ دوزخ جو جنّت کے مقابلے میں پوچ اور ہیچ ہے اتنا ترقی کرے اتنا ترقی کرے کہ سارے جنّتی ہم باشندگانِ جہنّم اور اہالیانِ دوزخ پر رشک کرنے لگیں۔ــ تم پڑھے لکھے ہو اور دیکھنے سے بھی کافی انٹلکچول معلوم ہوتے ہو"ــــ ابھی صاحب نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ ایک سریلی سی گھنٹی کی آواز آئی اور جھٹ سے صاحب نے اپنا پائپ اپنے منہ سے نکال کر ہوا میں اچھال دیا۔ ہم نے دیکھا کہ صاحب سے بمشکل تین چار قدم کے فاصلے پر پائپ ہوا میں معلق آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا اور خوشبودار

دھوئیں کے بھبھکے اس میں سے نکل رہے تھے۔ میں نے اور شیکھر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ دوسرا دن ہوگیا ہے اور آج فرشتے کی باری ہے اور یہ فرشتہ ہی ہے جو پائپ پی رہا ہے۔

صاحب مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔ ہاں تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ "میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ ہم اپنی دوزخ کو بہت ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے صرف اتحاد کی ضرورت ہے۔ اتحاد جو انسانوں اور فرشتوں کے فرق کو مٹادے اور میں نے بہت سے فرشتوں کو اپنا لیا ہے —— پھر صاحب نے نہایت ہی صفائی سے آنکھ مار کر کہا۔ ڈاکٹر تم ابھی نہیں جانتے۔ فرشتوں کی قوم بڑی سیدھی سادھی ہے بہت بھولی بھالی ——" اور جھک کر چپکے سے کان میں کہنے لگا —— "نہایت سادہ لوح اور...." بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے میری بانہہ پر چٹکی لے لی —— میں خوش تھا کہ چلو یہاں کی ایک صاحب اقتدار شخصیت سے کچھ بے تکلفی تو بڑھ رہی ہے۔

معلق پائپ ہوا میں جلد جلد حرکت کرنے لگا اور دھوئیں کی چادروں کی بجائے گول گول بے شمار دھوئیں کے مرغولے ہمارے اطراف پھیل گئے۔ فرشتہ اپنی تعریف سن کر شاید کچھ ترنگ میں آگیا تھا۔

صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ڈاکٹر ذرا اس بات پر بھی تو غور کرو کہ قدرت نے خود ہماری ترقی کے مواقع فراہم کیے ہیں —— یہاں کون نہیں ہے جس کی دماغی صلاحیتوں پر ہم ناز کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے مفکر، فلسفی، شاعر، ادیب، انجینئر، سائنس داں ایکٹرس اور پھر ڈاکو، بلیک مارکیٹرس، جیب کترے جب قدرت نے خود اس چھوٹے سے خطّے میں اہلِ ثروت، اہلِ ہنر اور اہلِ دماغ جمع کر دیئے ہیں تو یہ خطہ ہوش مندان و

ہیں کو اکب کچھ...
فن داں، کس طرح کسی ایسی جنت سے پیچھے رہ سکتا ہے جہاں نہ اہلِ دل ہیں نہ اہلِ دماغ۔ میں نے پھر جھری جھری سی لی۔ صاحب کی زبان پر کوئی بندش نہیں ہے۔ جو جی چاہا بکتا رہتا ہے۔ کیسی کیسی برگزیدہ ہستیاں جنت میں ہوں گی ان کے متعلق اس طرح کھلے بندوں توہین آمیز الفاظ زبان سے نکلتے ہوئے بھی وہ پس وپیش نہیں کرتا اور فرشتے صاحب ہیں کہ صاحب کے پاس ہی کھڑے اطمینان سے پائپ پی رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

گتے دار، صاحب کی باتیں سن سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس کی باچھیں ہمیشہ کھلی رہتیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ صاحب یہ سب اہلِ ہنر اور اہلِ فن کہاں ہیں جن کا ابھی آپ نے تذکرہ کیا۔ صاحب نے رازدارانہ طور پر کہا کہ سب قیدِ تنہائی بھگت رہے ہیں۔ حاکمانِ جزا و سزا نے خاص طور پر فرشتوں کو تاکید کی ہے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو کسی پڑھے لکھے آدمی سے نہ ملنے دیا جائے۔ لیکن تم کسی سے کہنا نہیں، خفیہ ملاقاتیں جاری ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ پلان تیار ہو رہا ہے، ساری چیزیں فراہم ہو جانے کی توقع ہے۔ صرف کپڑے کی قلت ہے لیکن یہ کفن چور نہیں مانتا۔ ویسے جب یہاں ملیں تیار ہو جائیں گی تو ایک سے ایک عمدہ کپڑا ہمیں دستیاب ہو جائے گا لیکن فی الوقت ہمیں اس کفن چور کے اسٹاک کی ضرورت ہے جو فوراً کام میں آسکے۔

میں نے دست بستہ پوچھا کہ صاحب کپڑے کی اس قدر شدید ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ صاحب نے شکھر کو ذرا ہٹ جانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔ جب وہ چار قدم پیچھے ہٹا تو صاحب نے دو قدم مجھے قریب کیا اور ایک قدم خود قریب ہو کر کہا کہ جب جسمانی اذیت پہنچا کر ہر ایک کو قیدِ تنہائی کی سزا دے دی جاتی ہے تو اس کے

بدن پر جو بھی کپڑے رہتے ہیں وہ اتار لیے جاتے ہیں۔ کپڑے اترتے ہی ایک آدمی دوسرے آدمی کو نظر ہی نہیں آتا۔ اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ایک انگریز ٹیلر کی ہم نے خدمات حاصل کر لی ہیں۔ کپڑا فراہم ہو جائے تو ہمیں ایک دوسرے سے ملنے میں سہولت ہوگی۔

میں نے پوچھا کہ صاحب پھر آپ جو اس طرح اطمینان سے سوٹ پہنے پھر رہے ہیں؟ یہ کہاں سے آ گیا۔ صاحب نے جواب دیا کہ ڈاکٹر، میں اور یہ گنے دار صاحب مختلف حادثوں میں دنیا سے رخصت ہوئے ہیں ــــ میں ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوا تھا جب کہ امریکہ مزید علمی ٹریننگ کے لیے دوسری بار جا رہا تھا۔ اس وقت بھی سوٹ میں نے زیب تن کیا تھا۔ میری لاش میرے اہل و عیال کو نہ مل سکی اگر مل جاتی تو دو گز کفن کا کپڑا ہی وہ لوگ میرے ساتھ کر دیتے۔ یہی حال ان گنے دار صاحب کا ہے۔ یہ قوم کے ہندو ہیں۔ ملک و قوم کے بہی خواہوں میں ان کا نام سرِ فہرست رہا ہے۔ مجبوری انسان سے کیا نہیں کرواتی۔ ایک ریلوے برج تعمیر کرواتے وقت انھوں نے کافی کمایا۔ لیکن جب ٹرین پل کے نیچے گری ہے تو اپنے اہلِ وطن کو آنکھوں کے سامنے دم توڑتا ہوا وہ کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی مرنے والوں میں چپکے سے شامل ہو گئے۔ اس وقت اسی پینٹ شرٹ میں وہ ملبوس تھے۔ دو رکیوں جاؤ بھئی تم لوگ خود اپنے ہی کو دیکھ لو نا۔ کون کہتا ہے کہ تم دونوں کی طبعی موت واقع ہوئی ہے۔ شکار کے وقت جب ایک کنویں میں گر گئی اور تم لوگ یہاں پہنچ گئے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی غیبی قوت نے شیکھر کی گردن پکڑ لی اور اس کو ایک شیشے میں توڑ مروڑ کر اتارنے لگا۔ شیکھر کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ اور وہ بے تحاشہ

ہیں کواکب کچھ...

چیخ رہا تھا۔ صاحب نے پوچھا کیا تم دونوں شرابی ہو۔ یہاں شرابیوں کی یہی سزا ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب صرف شوق کرتے تھے اور وہ بھی صرف "بیر" اور "جن" سے۔ اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے اپنی گردن پر کسی آہنی پنجے کی گرفت محسوس ہوئی۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور اس کے بعد مجھے ایک شیشے میں ٹھونسا جانے لگا۔ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور اس کے بعد مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ایک طویل مدت تک میں بے اندازہ تکلیف اور درد میں بسر کرتا رہا اور اس پوری مدت میں دل و دماغ پر غم و اندوہ کا اس طرح بوجھ رہا کہ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل پھیل کر اپنی ہیئت ترکیبی بدل چکا تھا۔ جب فرشتے نے مجھے غار سے اوپر پھینکا تو میں بالکل اس طرح ایک چٹیل میدان میں آگرا جیسے ایک لڑکے کی گیند جس کو ہوا میں اچھال کر زمین پر ٹپ کھانے سے پہلے ہی لڑکے نے بھلا دیا ہو کہ اس نے گیند اچھالی تھی۔ ہوش و حواس بجا ہوئے تو مجھے پتھروں کے تراشے جانے کی سُریلی آواز نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ آواز میں نے دنیا میں بارہا سنی تھی۔ یقیناً کہیں کوئی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی تھی میں آہستہ آہستہ آواز کے رخ پر بڑھتا گیا۔ جوں جوں میں اس آواز کے قریب ہوتا گیا یہ احساس بڑھتا گیا کہ میں دنیا میں واپس بھجوا دیا گیا ہوں۔ جب زیر تعمیر بلڈنگ کے قریب پہنچ گیا تو بے شمار لوگ کام کر رہے تھے۔ طبل یار خاں جو ٹینس کا بہترین کھلاڑی تھا اور جو میرے سے مرا تھا وہ ٹینس کورٹ تیار کروا رہا تھا اور اس کا منہ کھجوروں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا تو بے تحاشہ لپٹ گیا۔ کہنے لگا کہ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ طویل

قیدِ تنہائی نے میرے دل و دماغ کو شل کر دیا تھا۔ میں سہما ہوا تھا۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔
خاموشی ہی میں مجھے خیریت نظر آئی۔ میں نے صرف اتنا پوچھا۔ یہ سب کیا ہے اور تم یہاں
بھی کھاتے رہنے کی عادت سے باز نہیں آتے۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ ڈاکٹر وہاں تو
تمھارے ہیضے "ویضے" کا ڈر تھا جس کے آگے تمھاری ساری علمیت گھٹنے ٹیک چکی تھی
اور میں چپکے سے ادھر آنکلا تھا۔ یہاں خواہ کچھ ہو چڑیل موت تو ہے نہیں جو میں اپنا
منہ بند رکھوں۔ بس جو سامنے آجائے کھاتا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے جنّت میں آم
نہیں۔ ایک ٹن کھجور دے کر جنت والے صرف دس پونڈ آم قبول کرنے کے لیے تیار
ہیں لیکن ہماری سرکار ابھی سوچ رہی ہے ــــ میں ششدر تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا
ہے؟ کیا یہ وہی دوزخ ہے۔ لیکن ہراسانی نے مجھے کھل کر بات کرنے نہ دیا۔ بس ٹکر ٹکر
دیکھے جا رہا تھا۔ طبل یار خاں نے کہا۔ ڈاکٹر اس قدر حیران کیوں ہو۔ جاؤ کچھ گھوم پھر کر
آؤ طبیعت سنبھل جائے گی۔ آگے بڑھا۔ بڑھتا گیا کہیں سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں کہیں
باغات کا پلان ڈالا جا رہا تھا۔ میں چپ چاپ ساری چیزیں دیکھتا رہا۔ چلتا رہا۔
دیکھتا رہا۔ آبادی جہاں ختم ہو گئی تھی اس سے کچھ فاصلہ پر کچھ اور کام ہو رہا تھا۔ کام
کرنے والے سارے کے سارے بھک سفید لوگ تھے۔ میں نے ڈرتے ہوئے ایک نوجوان
کو روک کر پوچھا کہ میاں یہاں کیا بن رہا ہے۔ نوجوان نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا۔
غالباً قیدِ تنہائی کاٹ کر ابھی ابھی چھوٹے ہو۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہنے لگا
ایروڈرم بن رہا ہے اور ایروڈرم سے دو فرلانگ ہی پر سائنس کی تجربہ گاہ تیار
ہو رہی ہے۔ دیکھنے کے قابل عمارت ہوگی۔ دعا کرو کہ "ارموف" کو ہم جنّت سے اغوا
کر کے یہاں لانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ان کے بغیر "دوزخیاداناوسکی" بہت بے چین

ہیں کو اکب کچھ...

ہیں اور رہتے ہیں کہ ارموف آجائے تو جنت کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہے گی ــــ

میں نے پوچھا یہ دونوں کون ہیں۔ نوجوان نے کہا کیا یار تم بھی کیا "آوٹ آف ڈیٹ" آدمی ہو۔ یہی تو وہ ہیں جنھوں نے روس میں اسپٹنک تیار کیا تھا۔ ارموف درآنحالیکہ کوئی ایسے نیک آدمی نہیں اور نہ ان کو ان کی نیکیوں کی بناء پر جنت میں رکھا گیا ہے۔ حاکمانِ سزا و جزا کو ڈر تھا کہ وہ بھی ــــ "دوزخیا دانا وسکی" کے ساتھ یہاں جہنم میں رہیں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا کر دیں گے۔ اسی لیے ان دونوں کو الگ الگ رکھنا مقصود تھا۔ "ارموف" کو جنت مل گئی۔ بھئی سیاست بھی تو کوئی چیز ہے اس مسئلہ پر حاکمانِ جبر و قدر اور حاکمانِ جزا و سزا میں اختلافات بھی پیدا ہو چکے ہیں کہ ارموف کو جنت میں نہیں رکھنا چاہیے تھا کیوں کہ وہاں کی فضا کو وہ متاثر کر دیگا۔ میں نے پوچھا حاکموں میں زیادہ اختیارات کس کے ہیں۔ نوجوان نے کہا۔ کیا تم اخبار بھی نہیں پڑھتے ــــ اخبار۔ میں بس نوجوان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی اور کہا کہ دوست تمھیں نام ہی سے سمجھ لینا چاہیئے کہ حاکمانِ جبر و قدر مقابلتاً حاکمانِ جزا و سزا سے بڑے لوگ ہیں۔ اور پھر اسی طرح بھاگتا ہوا آگے نکل گیا۔

شیکھر نے پوچھا۔ "اس قیدِ تنہائی کے بعد شیکھر بے چارہ کہاں رہ گیا ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم سے زیادہ گنہگار ہو گا جو آج تک قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہے۔"

زبیدہ نے فرمائشی قہقہہ مارا۔

ابوالبشر اس سلسلے کو منقطع کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ قہقہوں کی گونج کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "پھر کیا ہوا ڈاکٹر۔"

ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔ پھر کیا ہونا تھا۔ دوزخ ترقی کر گئی اور پھر آنکھ کھل گئی۔

ہیں کو اب کچھ.....

ابوالبشر نے پوچھا "یہ تو ہوا تمھارا حال چال۔ ہم جنتیوں کے متعلق تم نے کیا کیا دیکھا؟"

ڈاکٹر نے کہا "بھئی یہ تو خواب ہے۔ اس طرح مسلسل تھوڑی ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ تین روز تک پھر میں اس دنیا کی سیر ہی نہ کر سکا۔ چوتھی شب جنت کے حالات کا علم ہوا جو تمھیں پھر کبھی سناؤں گا۔ لیکن تم وہاں بھی نہ تھے۔"

سب نے قہقہہ لگایا۔

زبیدہ نے کہا "بھئی ابوالبشر صاحب بہر حال مسٹر شیکھر سے تو بُرے نہ رہے جو اب تک قید تنہائی کاٹ رہے ہیں۔"

شیکھر نے کہا "جی ہاں میں بُرا ہوں یا بھلا ہوں آپ کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہی رہا ہوں۔"

شیکھر کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کرتے ہوئے ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔

ابوالبشر کچھ اس طرح مسکرایا جیسے مسکراتے ہوئے ڈر رہا ہو۔ اس لیے کہ زبیدہ کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔

یہ نشست ختم ہوئی تو سبھوں نے جیپ کا رخ کیا۔

تاریکیوں کے سینے کو چیرتی ہوئی جیپ پکّی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ گائیڈ نے یکایک سیدھی جانب موڑنے کے لیے شیکھر سے کہا۔ شیکھر نے اسی اسپیڈ میں جیپ موڑ لی تو زبیدہ اچھل کر گائیڈ کے کندھے سے جا لگی ـــــ سیدھی ہوئی تو بڑی خشونت سے اس نے کہا کہ شیکھر صاحب جیپ چلائیے تو اس کا بھی پاس رکھیے کہ ایک لیڈی بھی اس میں سوار ہے۔

شیکھر نے قہقہہ مار کر کہا۔ جی ہاں جنگل کی ساری ہرنیاں بھی اس کا خیال رکھیں گی کہ جو جیپ ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے اس میں ایک شہری ہرنی بھی ہے جو ان کا شکار کرنے کے لیے ان کا تعاقب کر رہی ہے۔

جیپ کھیتوں کی ناہموار زمین پر اچھلتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ گائیڈ کے ہاتھوں میں گھومتی ہوئی سرچ لائٹ جنگل کی بے پناہ تاریکیوں کو ہر سمت سے مجروح کر رہی تھی۔ پہیوں کے نیچے دب کر کھیتوں کی ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلے جیسے فریاد کر رہے تھے اور ان کی یہ فریاد صاف سنائی دے رہی تھی۔

زبیدہ نے جیپ روکنے کے لیے کہا۔ تو شیکھر نے جیپ روک لی۔ ناہموار زمین پر چٹختے ہوئے ڈھیلوں نے چپ سادھ لی اور سناٹوں کو گدگدانے کے لیے صرف جیپ کے انجن کی آواز اکیلی رہ گئی تو زبیدہ نے کہا۔

"شیکھر صاحب۔ مجھے شہری ہرنی کہنے کا آپ کو کس نے حق دے دیا۔"

شیکھر نے بھی لہجے میں تھوڑی سی درشتی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مسز زبیدہ! یہ حق مجھے آپ ہی نے دیا ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے آپ ہی نے کہا تھا کہ ہرنیاں بالکل ہندوستانی عورتوں کی مانند ہوتی ہیں۔" ڈاکٹر نے مصالحت کرانے کے انداز سے قہقہہ لگایا۔

شیکھر نے پوچھا۔ "اچھا تو یہ بتلائیے کہ آپ نے جیپ رکوا کیوں لی؟"

زبیدہ نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ کے اشارے سے گائیڈ کو نیچے اتر جانے کے لیے کہا۔ وہ اتر گیا۔ تو زبیدہ شیکھر کے برابر بیٹھ گئی اور گائیڈ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ یہاں کونے میں بیٹھتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں اچھل کر نیچے نہ جا گروں۔ جب گائیڈ نے کونہ سنبھال لیا تو جیپ پھر رواں ہو گئی۔ گھٹاٹوپ اندھیروں اور

بے پناہ سناٹوں کو درہم برہم کرتی، جیپ اس شان سے رواں دواں تھی جیسے سارے جنگل کی حکمراں ہو۔ ایک کھیت کو پیچھے چھوڑ کر جب وہ چھوٹی سی حصار پھلانگ جاتی اور دوسرے کھیت میں دوڑنے لگتی تو سب لوگ اُچھل اُچھل کر پھر سنبھل جاتے۔ کٹائی چوں کہ ہو چکی تھی اس لیے سوکھے ٹھنٹھ اپنے اپنے نیزوں کی انی اپنے اپنے سروں پر رکھ کر جیسے اوپر سے آنے والی ہر معیبت کے مقابلے کو تیار رہتے تھے لیکن جوں جوں جیپ گذرتی جاتی وہ سرنگوں ہو جاتے اور جو جیپ کی زد سے بچ جاتے وہ گویا اپنی جان کی خیر مناتے ۔ فضا میں اڑتے ہوئے جگنو آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کا جواب تو نہ تھے لیکن آسمان کی جانب دیکھنے کی فرصت کس کو تھی۔ جگنوؤں نے اندھیروں کی حکمرانی میں ننھی ننھی چنگاریاں اس طرح جلا رکھی تھیں جیسے موت کے مہیب سناٹوں میں زندگی کے آثار چمک دمک رہے ہوں۔ ستاروں کو دیکھ کر یہ احساس کہاں پیدا ہوتا ہے۔ نرم مٹی کے خشک ڈھیلے چٹخ چٹخ کر کراہتے اور سنگ ریزے اڑ اڑ کر جیپ کو محصور کی ہوئی روشنیوں میں رقص کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارا سواگت کر رہے ہوں۔ شیکھر نے ہیڈ لیمپس کے علاوہ دونوں بازوؤں اور پیچھے کی لائٹ بھی جلا رکھی تھی۔ بے پناہ اندھیروں میں گویا اجالوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ دراتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے چھٹ رہے تھے، ہٹ رہے تھے، راستہ بنا رہے تھے۔ بائیں ہیں ختم ہو جاتی تو وہ جانور جو جیپ سے دور تھے، دور ہی بیٹھے تماشہ کرتے لیکن گائیڈ کی سرچ لائٹ جنگل کے ہر ڈھکے چھپے ذی نفس خزانے کو اپنے حلقے میں جکڑ لیتی ــــــ بے شمار ستارے جیسے زمین پر یکایک چمک اٹھے۔ کبھی بالکل ساکت کبھی متحرک۔ ابوالبشر خوشی سے اچھل پڑا۔ یار ب تو ہاتھ لگ گیا کچھ ــــــ سب کے سب ان ٹمٹماتے

دیوں کو تکنے لگے جو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر نے زبیدہ کو پچھلی سیٹ سے گدگدایا۔ جو ان جھلملاتے ستاروں اور چیختے ہوئے سناٹوں کی دنیا سے دور کہیں اور رہی تھی اور شاید جیپ کے اچھل جانے کی وجہ سے ابھی ابھی شیکھر سے بالکل قریب ہو گئی تھی۔

زبی دیکھ رہی ہو۔ ان ٹمٹماتے دیوں میں سے تابناک چراغوں کو چن چن کر شیکھر کی بندوق پھونک دے گی اور تمھاری آنکھوں کے سامنے ہی ان جنگل کی شہزادیوں کا سہاگ لٹ جائے گا۔

لیکن زبیدہ نے ڈاکٹر سے کچھ نہ کہا۔ راست شیکھر سے مخاطب ہو گئی۔

مسٹر شیکھر۔ اگر ہرنی خود آپ تک چل کر آئے اور آپ کے آگے کھڑی ہو کر استدعا کرے کہ آپ اس کا سینہ اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیجئے تب بھی آپ اس کو نہیں ماریں گے۔

شیکھر نے کہا میں بڑے چاؤ سے اس ہرنی کو اپنی گود میں اٹھا لوں گا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے نر کی طرف بڑھوں گا۔ جو حسرت سے اپنی مادہ کو میری گود میں دیکھ رہا ہو گا۔ جب میں نر کے بہت قریب پہنچ جاؤں گا تو اس کو اپنی گود سے اتار دوں گا جب وہ دونوں انتہائی خوشی کے عالم میں چوکڑیاں بھرنے لگیں گے تو میری بندوق اٹھے گی اور نر کے سینے کو چھید دے گی۔ اور میں آپ کی زبان میں جنگل کی شہزادی کی حسرتوں کو دیکھا کروں گا۔

زبیدہ نے قریب قریب چیخ کر کہا تو پھر تم ہی سب کچھ کر گذرو شیکھر۔

شیکھر مسکرایا۔ گائیڈ سے مخاطب ہو کر اس نے کہا۔ سرچ لائٹ داہنی جانب گھماتے رہو۔

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ میں سب کچھ کر گذرتا لیکن اس بدنصیبی کو کیا کروں کہ آپ جن کو ہرنیاں سمجھ رہی ہیں وہ چرواہے کا ریوڑ ہے جس میں بکریاں اور دُنبے اطمینان سے جگال کر رہے ہوں گے۔ ان کا رکھوالا کوئی چرواہا ضرور ان کے قریب ہی کہیں سو رہا ہوگا۔ آپ کو شاید اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ میں بکریوں یا دنبوں کا شکاری نہیں ہوں۔

لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کسی بپھری ہوئی شیرنی کے شکاری بھی نہیں ہیں۔

کوئی بپھری ہوئی شیرنی یہاں ہوتی تو میری بندوق سب کچھ سمجھا دیتی لیکن کوئی مغرور ہرنی میرے آگے آکر یہ سمجھ لے کہ میں اسے شیرنی سمجھ لوں گا تو یہ غلط ہے۔ اس لیے بھی کہ میں غلطی کر بھی جاؤں تو میری بندوق مجھے ٹوک دیتی ہے۔

زبیدہ نے جل کر کہا۔ شکریہ جو آپ نے مغرور کتیا نہیں کہا۔

شیکھر پھر مسکرایا۔ اس میں شکریے کی کیا بات تھی مسز زبیدہ۔ میرا مخاطب کوئی آپ تو نہ تھیں۔ آپ اس طرح غلط فہمیوں کا شکار کیوں ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر نے بیچ میں مداخلت کی۔ شیکھر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی۔

کانٹوں کی باڑھ کے متصل ایک خشک باولی تھی۔ بمشکل ڈیڑھ گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس بار شیکھر چوک جاتا تو جیپ اپنے سارے اجالوں اور زندگی کی حرارتوں کے ساتھ موت کی آغوش میں منہ چھپا لیتی۔ لیکن شیکھر جیپ سے کھلونے کی طرح کھیلتا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اپنی ہر پسندیدہ شے سے کھلونے کی طرح کھیلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کو شکار کرتا ہوا دیکھ کر لوگ کہتے تھے کہ وہ خود زندگی سے کھیل رہا ہے۔

جیپ پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔ بالکل اس طرح جیسے خالی جوتے کے ڈبے کو ڈوری باندھ کر شیکھر کا ننھا بے محابہ دوڑتا چلا جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے جوتے کا ڈبہ جو اس کی دانست میں اس کے اباّ کی جیپ کار ہے گیند کی طرح لڑھک رہا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیپ بھی جوتے کے ڈبے کی طرح لڑھک لڑھک کر سیدھی ہوتی جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس لیے کہ شیکھر کا ننھا نہیں خود شیکھر جیپ چلا رہا تھا۔

سرچ لائٹ ظلمتوں کے سینے میں بھالا بن کر پیوست ہو گئی تھی۔ تاریکیاں قدم قدم پر مجروح ہو رہی تھیں۔ گائیڈ سرچ لائٹ آف کر دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اندھیرے اُجالوں پر اور نا امیدیاں امیدوں پر فتح پا رہی ہیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سرچ لائٹ سے ہر سمت اجالے پھینک کر گائیڈ پورے جنگل کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ کبھی کوئی خرگوش ایک جھاڑی سے نکل کر بے تحاشہ بھاگتا اور دوسری جھاڑی میں دبک جاتا۔ کبھی اُجالوں کی محبت میں رک کر روشنی کے ہالے میں اطمینان سے ناچنے لگتا اور جیپ اس کے پاس ہی سے گذر جاتی ـــ کبھی کہیں آنکھیں چمک اٹھتیں تو گائیڈ فوراً فوکس ملا کر ان چمکتی ہوئی آنکھوں کو روشنی کے احاطے میں محصور کر لیتا تب پتہ چلتا کہ کوئی بیل اطمینان سے بیٹھا ہوا جگالی کر رہا ہے یا کوئی گوالا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہراساں ہے۔ آس پاس درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ذرا کی ذرا پر پھڑپھڑاتے اور جیپ کے گذرتے ہی پھر اسی درخت پر بیٹھ رہتے۔

ڈاکٹر نے شیکھر کے کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط کر کے کہا کہ ڈیئر جب زبی اس قدر مُصر ہے تو گراہی لو ایک آدھ ہرنی بھی۔ ایک ہرنی کی جان کی بھینٹ لے کر تم دونوں کی ان بن ختم ہو جاتی ہے تو کیا برا ہے

ابوالبشر نے جو ذرا دھیمے سُروں میں گنگنانا شروع کر دیا تھا چپ ہو رہا۔

شیکھر نے ڈاکٹر کی بات سنی ان سنی کر دی۔ جیپ کو ڈاک بنگلے کی سمت موڑتے ہوئے اس نے کہا کچھ رات گئے پھر آنا چاہیئے ڈاکٹر۔ اس وقت تو کچھ ملنے کا امکان نہیں ہے۔ ڈاکٹر اور ابوالبشر نے حامی بھری اور بیک آواز کہا کہ انھیں شدید بھوک بھی لگ رہی ہے۔

ڈاکٹر نے ابھی ایک نوالہ بھی نہیں اٹھایا تھا کہ شیکھر نے روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے ہوئے کہا " نہ معلوم تم کب مجھے فیڈ تنہائی سے چھڑاؤ اور میں کب روز رخ کی تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔

اگلی بار زبیدہ نے زیادہ دلچسپی لی ــــ اجنّت کا حال سنانے کا تقاضہ کرتے ہوئے اس قدر پیار سے اس نے ڈاکٹر کو دیکھا کہ ڈاکٹر نے اٹھایا ہوا نوالا پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

ابوالبشر اب کہاں چوکنے والا تھا۔ مرغ کی ٹانگ کو جھٹ اپنے دانتوں سے نوچ کر اس نے کہا کہ ڈاکٹر تم ڈاکٹر نہ بھی ہوتے تو داستان گوئی میں تمھارا کوئی جواب نہ تھا گویا یوں بھی زبیدہ تمھارے ساتھ سوداگر کے کچھ گھاٹے میں نہ رہتیں۔

شیکھر نے رشہ دی۔ لیجیے مسز زبیدہ۔ آپ کی ازدواجی زندگی کو آپ کے پسندیدہ ابوالبشر صاحب کاروباری زندگی سمجھتے ہیں۔

زبیدہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ جی نہیں وہ تو صرف مذاق کر رہے تھے۔ اب آپ اپنی دانست میں جو چاہیں سمجھیں جو چاہیں معنی پہنائیں، رنگ دیں۔

ڈاکٹر نے نوالہ منہ میں رکھ لیا اور بغیر چبائے ہی شیکھر اور زبیدہ کے بیچ میں کود پڑا۔ ہاں تو بھئی ایک دن ــــ لیکن ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں

ہیں کو اکب کچھ ...

آ کر نکل گیا کہ آئندہ کسی پکنک میں شیکھر اور زبیدہ کا ساتھ کچھ مناسب نہیں ہے۔ زبیدہ جانے کیوں اس قدر زیادتی کرتی ہے لیکن شیکھر بے چارہ مجھ سے دوستی کا حق ادا کرتا ہے اور اس کی ہر بات کو انگیز کر جاتا ہے۔

سب اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔

ایک دن تم۔

ہاں تو ایک دن میں فلم کمپنی کی بڑی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ جو اسی گتے دار کی نگرانی میں تعمیر ہو رہی تھی جس سے میں اور شیکھر روز رخ میں داخل ہوتے ہی ملے تھے اور جو صاحب کا پہننا تھا۔ بالکنی بڑی خوبصورت اور فنکاری کا نمونہ تھی۔ میں بالکنی ہی کو تک رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرا ہاتھ دبایا میں نے پلٹ کر دیکھا تو پرشاد کھڑا تھا میں اس سے لپٹ گیا۔۔۔ مجھے زبی سے اپنے عشق کی پوری داستان یاد آ گئی۔

زبی نے بیچ میں ٹوکا۔ ڈاکٹر صاحب۔ اب یہ عشق کی داستاں واستان رہنے دیجیے۔

شیکھر نے لقمہ دیا۔ کیوں زبیدہ صاحبہ کیا ہرج ہے۔ لگے ہاتھوں ہم یہ بھی جو سن لیں۔

زبیدہ نے تیز نگاہوں سے شیکھر کو دیکھا۔

ڈاکٹر نے پانی مانگا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔۔۔ اور پھر کہنے لگا۔

جانتے ہو شیکھر یہ پرشاد کون تھا۔ یہ وہی پوسٹ مین تھا جو ہوٹل میں زبی کے خطوط مجھ تک پہنچایا کرتا۔ مجھ سے انعام واکرام کے علاوہ بے شمار دعائیں بھی لیتا۔

میرا دل بھر آیا۔۔۔ میں نے اس سے رو ہانسہ ہو کر کہا۔۔۔ پرشاد جس بی بی کو تم نے مجھ سے ملایا (پرشاد زبی کو بی بی ہی کہا کرتا تھا) موت کے ظالم ہاتھوں نے اس بی بی کو مجھ سے چھین لیا۔ پرشاد پر میری باتوں کا کچھ اثر ہی نہ ہوا۔ وہ بالکل اسی طرح مسکراتا رہا جس طرح ہاسٹل میں میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اور اس کی یہی مسکراہٹ میری ہمت بندھاتی تھی۔

مجھے کچھ گمان گذرا۔ میں نے جھٹ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

سچ بتاؤ پرشاد۔

اور اس نے بند مٹھی کھول دی۔

ہائیں زبی کا خط۔ میں نے اچھل کر اپنی باہیں پرشاد کی گردن میں حائل کر دیں۔ کیا تم یہاں بھی یہ خدمت انجام دیتے رہو گے۔ تم کہاں ہو، زبی کہاں ہے۔ تم اس سے کس طرح مل سکے۔

پرشاد کے لب اور آنکھیں دونوں اپنے پرانے ڈھب سے مسکرا رہے تھے۔ اس نے میرے کان پر منہ رکھ کر کہا۔

بی بی جنّت میں ہیں۔ میں بھی جنّت ہی میں ہوں۔ چار بار تم سے ملنے کی کوشش کی لیکن دوزخ میں داخل نہ ہو سکا۔ وہ جو پہرے پر فرشتہ ہے نا۔ بڑا کائیاں ہے۔ آج کچھ تخمی آم اسے بھینٹ کر آیا ہوں۔ ادھر جنّت میں آم جیسی نعمت نہیں ہے۔ نادیدہ ہے بے چارہ۔ بس فوراً کھانا شروع کر دیا۔ وہ تو مجھے نظر نہیں آیا۔ البتہ میں نے دیکھا کہ آم کا رس دو دھاروں میں نیچے ٹپک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے ہاتھوں پر سے پھسل کر کہنی تک پہنچ رہا ہوگا۔ بہر حال صاحبزادے مصروف ہو گئے تو میں کھسک آیا ہوں

ہیں کو اکب کچھ...
ایسے چھور یور پہرہ دار بہت دیکھے ہیں ـــــ ریذیڈنٹ صاحب کی میم کو سات پہروں سے گذر کر فوجی کرنل کے خطوط پہنچانے والا پرشاد ہار ماننے والا نہیں.

پرشاد جانے اور کیا کیا کہتا رہا لیکن میں نے زبی کا خط پڑھنا شروع کر دیا تھا.

زبی نے لکھا تھا.

پیارے بہت پیارے ـــــ (مقام کا نام بہشت بریں لکھا تھا اور تاریخ کی جگہ خالی تھی)

تم نہیں تو جنّت بھی مجھ کو اک جہنّم ہے

جب سے یہاں آئی ہوں سب کچھ حاصل ہے لیکن اداسیاں ہیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں. تم تک اپنا نامۂ محبت پہنچانے کے لیے کیا کیا کوششیں کی ہیں. لیکن ایک نہ چلی. وہ تو خیر گذری جو پرشاد سے یہاں ملاقات ہو گئی ـــــ ٹھہرو دودھ کا پیالہ میرے منہ سے آلگا ہے. مجھے بالکل رغبت نہیں ہے. میں انکار تو کر دوں. یہاں یہی مصیبت ہے بس تصوّر کیا اور چیز آ کر منہ سے لگ گئی. درآنحالیکہ میں تم کو صرف یہاں کے حالات سنانا چاہتی ہوں. دودھ یہاں چونکہ بہت وافر ہے اس لیے مجھے لکھتے لکھتے اس کا خیال آ گیا تھا اور وہ منہ سے آلگا. ہاں تو میں لکھ رہی تھی کہ پرشاد کو جب میں نے دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا کہ پرشاد اور جنّت میں لیکن اس کی خاص مسکراہٹ نے جو بیک وقت ہونٹوں اور آنکھوں دونوں سے پھوٹتی ہے. بڑھ کر مجھے گدگدایا اور میں اس سے لپٹ گئی. میری پلکیں بھیگ گئیں تو اس نے پچکار کر کہا کہ بٹیا یہاں بھی تو اسی طرح حیران اور بے چین ہے ـــــ پرشاد بہت معاملہ فہم ہے وہ سب کچھ سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ بڑا نیک لڑکا تھا صرف شراب نے اس کو تجھ سے جدا کر دیا ہوگا، ورنہ وہ بھی یہیں تیرے ساتھ

رہنا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا پرشاد میری چٹھی ان تک پہنچا دو نا۔ پرشاد ایک دم بوکھلا گیا۔ کہنے لگا بیٹیا دیوانی ہو گئی ہو۔ دوزخ کی آگ کو سہہ لینے کی مجھ بڈھے میں کہاں سے قوت آجائے گی ـــ میں نے ہنس کر کہا کہ پرشاد کاکا تم کس قدر بھولے ہو ـــ تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ جنت کا کوئی باشندہ دوزخ میں جانکلے تو آگ اس کے لیے گلزار بن جاتی ہے۔ راہ کے کانٹے پھول بن بن کر بچھتے ہیں۔ دوزخ کی آگ میں اتنی حدت ہی نہیں ہوتی کہ کسی جنتی کو بھسم کر سکے اور پھر تمھیں معلوم نہیں دوزخ میں تو ایک ہنگامہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں میں آج کل دوزخ ہی کے متعلق باتیں ہوتی رہتی ہیں آج یہی سب سے اہم موضوع ہے جس کی نسبت بڑے بڑے دماغ حیران و ششدر ہیں۔ کیوں کہ اہلِ دوزخ نے سنا ہے کہ متحد ہو کر اس بات کا تہیہ کیا ہے کہ اپنی دوزخ کو جنت سے بڑھ کر کچھ بنا دیں گے۔ پرشاد نے توبہ کی اور ہاتھ بڑھا کر میرے منہ پر رکھ دیا۔ کہنے لگا کہ بٹی تم یہاں بھی اوٹ پٹانگ بکے جاتی ہو لیکن اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ دوزخ کی آگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تو وہ راضی ہو گیا۔

لیکن ڈیرو اقعی تم لوگوں نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ ہمارے یہاں بڑی بڑی برگزیدہ ہستیاں تم لوگوں کی کارروائیوں سے متفکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ دوزخ کو بالکل دنیا ہی کے سانچے میں ڈھال رہے ہو۔ بعض وقت یہاں بھی آوازیں صاف سنائی دیتی ہیں تو ہماری عبادتوں میں خلل پڑتا ہے۔ خاص طور پر جب گانے کی اور آرکسٹرا کی آوازیں آتی ہیں تو بس یقین مانو میرے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی ہے اور میں خود کو سنبھال لیتی ہوں۔

پہلے تمھیں جنت سے کچھ متعارف کرا لوں تو پھر تمھیں لکھوں کہ تم لوگوں کی دوزخ نے ہم اہلِ ارم کو کس طرح پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن وعدہ کرو کہ تم کسی کو نہ بتاؤ گے۔

ہیں کواکب کچھ...

جنّت ایک بہت سہانا باغ ہے۔ دودھ کی نہریں اور کھجور کے درخت یہاں بہت ہیں اور یہی یہاں کے باشندوں کی عام غذا ہے۔ دودھ کی نہر سے بالکل متوازی شہد کی نہر بہتی ہے۔ چاندنی میں یہ سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سفیدی اور سرخی کی یہ متوازی لکیریں چاند کی ٹھنڈی روشنی میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پھلوں میں زیادہ تر میں تو انگور ہی استعمال کرتی ہوں۔ کھجور کو دیکھنے سے ہی میری تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہو منغض ہو جاتی ہے۔ دودھ اور شہد کی نہروں سے بھی مجھے صرف نظارہ کر لینے کی حد تک لگاؤ ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو شہد اور دودھ سے طبیعت اوب گئی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی پینے کی چیزیں ہیں میں تو پانی زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ چلتے چلتے ایک بات یاد آ گئی لیکن ڈیرس اپنے ہی سینے میں دفن کر لینا ورنہ سمجھ لو کر تمہاری زبی ___ بے دریغ مصائب و آلام میں مبتلا کر دی جائے گی کیوں کہ جنّت کی سیاست کو لیک کرنے والے کے لیے کڑی سزائیں ہیں۔ فرانس کی ___ جون آف آرک اور روس کی زویا دونوں بہنیں ہیں۔ بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ ایک سکنڈ نچلی نہیں بیٹھتیں پتہ نہیں کب ان دونوں نے پانی کی نہر کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا بنا کر انگور کے کئی خوشے اس میں ڈال دیئے۔ پرسوں انھوں نے ایک حور کو اس گڑھے کا پانی پلا دیا۔ انگور سڑ کر شاید پانی میں اپنے خواص منتقل کر چکے تھے۔ بی حور بس اس طرح ناچنے ٹھمکنے اور گانے لگیں کہ یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کا بھی انھیں کچھ پاس و لحاظ نہ رہا۔ حور صاحبہ کی تعیناتی تو خیر جنّت سے برخواست کر دی گئی جس کا مجھے رنج نہیں لیکن اب ان دونوں لڑکیوں کو آپس میں ملنے جلنے سے باز رکھا گیا ہے۔ یہ دونوں اداس اداس سی رہتی ہیں۔ سنا جا رہا ہے کہ یہاں کے انگوروں سے وہ خصوصیات ہی چھینی جا رہی جو ان کے سڑ جانے سے ان میں پیدا ہو جاتی ہیں (معاف کرنا تمھیں اپنی اولڈ اسمگلر یاد آ رہی ہو گی اور منہ میں پانی آ رہا ہو گا) ہاں تو

سنا اب کبھی یہ انگور سڑ بھی جائیں تو ہرے ہرے پھول بن کر کھلیں گے۔

یہاں ہر کھجور کے درخت کی چوٹی سے ایک یا سو گز کے فاصلے پر ایک ہلال ہوتا ہے اور ہر ہلال کے پیٹ میں ایک ہشت پہلو جگمگاتا تارا۔ پتہ نہیں اس منظر کو دیکھتی ہوں تو مجھے عرب قوم کے (DOMINATION) کا تصور کیوں آتا ہے اور خود یہ منظر بھی تو اپنی جگہ کوئی دل کش نہیں۔ ویسے یہاں تاریکی یا اندھیرا بہرحال سیاہی کے قبیل کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ گھنے سے گھنے درخت کے نیچے سائے نہیں ہوتے۔ اجالے ہی اجالے جنت کی خصوصیت ہے۔ یہاں سایوں، تاریکیوں اور سیاہیوں سے گناہ کا تصور وابستہ ہے اس لیے ہم گھنے سایوں کی ٹھنڈک سے محروم ہو گئے ہیں۔ تم کسی خوبصورت سے خوبصورت باغ کا تصور کرو اور اس باغ کے گھنے پیڑوں سے اس کے ٹھنڈے سایوں کو چھین لو، باغ میں کیا رہ جائے گا۔ ویسے باغ اہم مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔ حوریں ایک سے ایک حسین ہیں۔ تم یہاں آجاؤ تو بس دیوانے ہو جاؤ۔ لیکن یہ تبری مٹی کے مادھو جیسی ہیں۔ بس خوبصورت سی تتلیاں۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ مگر اس کے باوجود تم یہاں آجاؤ تو شاید دیوانے ہو جاؤ۔ چچا غالب نے فرمایا تھا کہ جس جنت میں سو برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کو وہ گوارہ نہیں کریں گے لیکن یہاں چلتے پھرتے حوروں کو چھیڑتے ہیں ایک کو دوسری سے لڑاتے ہیں اور خوشبودار پان کھا کر اپنی رنگین باچھیں پھیلا کر مسکراتے ہیں۔

میں یہیں تک لکھ پائی تھی کہ ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا ہے۔ لوگ دودھ کی نہر پر جمع ہو رہے ہیں ذرا میں دیکھ آؤں کہ کیا قصہ ہے۔

لو جی میں ابھی ابھی دودھ کی نہر سے آکر تمھیں پھر لکھ رہی ہوں۔ ذرا اپنے منچلے دوزخیوں کو سمجھاؤ نا۔ یہ کوئی شرافت ہے بھلا کسی نے اپنی کا پھول چپکے سے نہر میں

پھینک دیا ہے۔ نہر مغرب کی جانب دوزخ سے لگی بہتی ہے۔ یہ کارگذاری غالباً اسی مقام سے کی گئی ہے ورنہ جنت میں کسی دوزخی کے داخل ہونے کی کیا مجال۔ سارا دودھ پھٹ کر دہی بن گیا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کیوں کہ دودھ ان کی مرغوب غذا ہے۔ اہل ارم دودھ کی خصوصیات میں تبدیلی کی نسبت سوچ رہے ہیں۔ صرف ایک تمھارا پرشاد خوش ہے کہ اس کو چھاچھ ملے گی جس کو وہ زمانے سے بھولا ہوا تھا۔

جنت کے پھلوں میں افسوس ہے کہ آم ہی نہیں ہیں۔ اہل جنت کی اکثریت آم جیسے پھل کی کمی کو بے طرح محسوس کرتی ہے۔ اسکیم یہ ہے کہ آم کسی نہ کسی طرح فراہم کرکے شہد کی نہر میں محفوظ کر دیئے جائیں۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ شہد میں آم برسوں تک محفوظ رہتے ہیں میں خوش ہوں کہ چلو شہد کی نہر کا یہ مصرف تو غنیمت ہوگا۔ چنانچہ بمشکل قدرت نے چند آم فراہم کیے ہیں جو شہد کی نہر میں محفوظ ہیں۔ چچا غالب تو آستین چڑھا کر جب دیکھو شہد کی نہر میں آم ٹٹولتے پھرتے ہیں۔ پرسوں مرزا شیفتہ کے حصے میں جو دو آم آئے تھے وہ انھوں نے چھپ کر چٹ کر دیئے۔

لو جی میں اس بدتمیزی سے تنگ آ چکی ہوں۔ مجھے پھر چھیڑ رہا ہے۔ یہ "غلمان" بھی عجیب الخلقت حیوان ہیں۔ مجھے سخت ناپسند ہیں۔ آداب و تمیز سے جیسے واقف ہی نہیں۔ عورتوں سے برتاؤ کرنے کے ڈھنگ سے قطعی نابلد، محبت جتانے کے آداب سے بڑے ناواقف میں تمھیں خط لکھ رہی ہوں اور حضرت گدگدا رہے ہیں۔ میرے منہ سے منہ بھڑا رہے ہیں میں سوچ رہی ہوں کہ مشرقی عورتوں کی ایک یونین بنا کر ان کے خلاف مشترکہ احتجاج کروں اور اس مسئلے کو اٹھاؤں کہ جب تک ہماری رضامندی شامل نہ ہو ہمیں نہ چھیڑیں۔

شگفتہ نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ابوالبشر پانی پی رہا تھا۔ ضبط نہ کر سکا۔ کھل کھلا کر

ہنس پڑا تو پانی پچکاری کی طرح اس کے منہ سے نکل کر سامنے دھری ہوئی پلیٹ اور چمچوں پر جا گرا۔ اس نے تولئے سے منہ صاف کرتے ہوئے معافی مانگی۔

زبیدہ بھی ہنسی نہ روک سکی لیکن بہت جلد ہنسی پر قابو پا کر اس نے ڈاکٹر کو ڈانٹا تمھیں میرے تعلق سے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

ڈاکٹر نے ابوالبشر کو آنکھ ماری اور زبیدہ کو چھیڑنے کے لیے کہا کہ زبی تمھیں تو "غلمان" کی یہ ناشائستہ حرکتیں ناپسند ہیں۔ تم نے کبھی اس کو منہ نہیں لگایا۔ پھر تمھیں شرمانے کی کیا ضرورت ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مخاطب کر کے کہا۔ ڈاکٹر زبیدہ سوچ رہی ہیں کہ تمھیں کہیں ان پر شبہ تو نہیں ہے کہ انھوں نے "غلمان" میں کبھی دلچسپی لی ہوگی۔

قہقہوں کے درمیان زبیدہ کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ مسٹر شیکھر آپ اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔

قہقہے ختم ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر نے زبیدہ کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر پھر کہنا شروع کیا۔

لیجیے میری ترش روئی کام آئی یہ حضرت کہیں کھسک گئے ہیں۔

اچھا ڈیر۔ تم مجھے اس خط کا جواب دینا تو دوزخ کے تفصیلی حالات مجھے لکھنا تمھیں شاید معلوم نہیں کہ تم دوزخیوں نے یہاں کی بڑی بڑی ہستیوں کی نیند اڑا رکھی ہے۔ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے کہ دوزخ کے صحیح حالات دریافت کرنے کے لیے اب تک پانچ اشخاص جن پر یہاں کی برگزیدہ ہستیوں کو بڑا اعتماد تھا۔ تمھاری دوزخ کو بھجوائے گئے۔ لیکن آج تک کوئی واپس نہ آیا۔ یہاں سب حیران ہیں کہ تم لوگوں نے دوزخ کو ایسا کیا بنا دیا ہے کہ

جنّت جیسی جگہ کے باشندے جاتے ہیں تو واپس نہیں آتے۔ میں کچھ ایسا محسوس کرتی ہوں کہ ارم کا حکمران طبقہ دوزخ کی ترقی سے صرف اس لیے خائف ہے کہ جنّت کی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی اور دنیا والوں کو اگر اس بات کا علم ہو جائے تو بے شمار منچلے دوزخ کی قصیدہ خوانی ہی کو اپنا شعار بنالیں گے۔ ویسے بھی باوجود جنّت کی برتری کے دنیا میں بڑے بڑے اہلِ فن نے اس کا مذاق ہی اڑایا ہے۔ حالی جو اتنا سب کچھ لکھ گئے۔ اب ان سے یہاں ہم لوگ پوچھتے ہیں تو سرے سے انکار ہی کرتے پھرتے ہیں کہ یہ شعر ان کا ہے ہی نہیں ؎

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جنتی، جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

وہ صاف مکر گئے۔ کہنے لگے استغفراللہ۔ یہ شعر اور حالی کا۔ اور خود اپنا یہ شعر سنایا ؎

چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد میں
بستر اکیوں اپنا پھنکواتے ہیں آپ

ہم نے کہا اس شعر میں بھی تو طنز ہے۔ حالی برہم ہو گئے کہنے لگے مجھے پڑھنے والوں نے پتہ نہیں دُنیا میں کس کس طرح تباہ کیا۔ اس شعر میں طنز و نز کچھ نہیں ہے۔ شعر سیدھا سادا ہے۔ مفہوم واضح ہے۔ حالی واعظ کی برگزیدہ شخصیت سے واقف ہے۔ اس کو چھیڑنے کا خیال اس کے ذہن میں آیا ہے جو شیطان کا کرشمہ ہے لیکن حالی کہاں شیطان کی چکر میں آنے والا وہ فوراً توبہ کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ واعظ کو چھیڑنے سے جنّت میں جو ایک بستر حالی کے لیے محفوظ ہے وہ واعظ پھنکوا دیں گے۔ اس لیے وہ واعظ کو نہیں چھیڑتا۔ ظاہر ہے کہ حالی نے اس شعر میں واعظ کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور جنّت سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی کیا ہے کہ کہیں جنّت سے بستر انہ پھینک دیا جائے۔ جہاں حالی بصد خلوص رہنا چاہتا ہے۔

ہیں کو اکب کچھ ...

جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو میں نے موقع کو غنیمت جان کر پوچھا۔ مولانا آپ یہ کیا مفہوم بیان کر رہے تھے۔ بہت رازدارانہ انداز میں انھوں نے جواب دیا۔ بیٹی مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے؟ اور پھر بستر اکوئی محفوظ کرواتا ہے تو بس ایک ہی جگہ جو ہاسٹل کہلاتی ہے۔ سو میں نے جنت کی اب کونسی تعریف کر دی۔ یہی نا کر اس کو ہاسٹل کہہ دیا ہے۔ اب کیا تم اس کو بھی تعریف ہی سمجھو گی۔ میں بے اختیار ہنس پڑی اور وہ مسکرا کر تیرنے کے لیے چلے گئے دُنیا میں انھیں تیرنا نہیں آتا تھا وہ انتقاماً یہاں زیادہ تیرتے ہیں۔ ع

شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

میں کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی اہل ارم خاص طور پر یہاں کی برگزیدہ ہستیاں دوزخ کی ہنگامہ آرائی پر بہت متفکر ہیں۔ پہلے جن مولانا کو دوزخ کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ حالی کے وہی واعظ ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا تھا لیکن یہ حضرت آج تک نہیں لوٹے اس کے بعد ہندو قوم کی ایک بہت بزرگ ہستی نے اپنے اعتماد کی ایک ایسی شخصیت کو اس کام کے لیے مقرر کیا جس کی نسبت ان کو ناز تھا کہ یہ شخص اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کریگا۔ ان صاحب کو "نارومنی" کہتے ہیں۔ گیروی کپڑوں میں لپٹا لپٹایا یہ شخص ایک ستار لے کر بڑے ہی اعتماد سے یہاں سے روانہ ہوا۔ اس کے بعد پتہ ہے سب بے چارے کا حشر کیا ہوا؟ — وہی جو ہونا تھا۔ کئی دن انتظار کرنے کے بعد جب یہاں مایوس ہو گئے تو اس برگزیدہ ہستی نے جس نارومنی کو اس کام پر متعین کیا تھا بہت دکھی ہو گئی۔ دوسری محترم ہستیوں نے انھیں تسلّی دی۔ انھوں نے آخری کوشش کر دیکھی اور ایک پیپل کے درخت کے نیچے اکڑوں بیٹھ کر آنکھیں بند کیں اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ پندرہ منٹ، بیس منٹ، پچیس منٹ آدھا گھنٹہ گذر گیا لیکن اس علم کے زور پر بھی "نارومنی"

ہیں کو اکب کچھ . . . .
واپس نہ آیا۔ وقت کے ساتھ ان کا غصہ بھی بڑھتا گیا اور وہ بہ آواز بلند جھوم جھوم کر پڑھنے لگے۔ اب ایک گھنٹہ پورا ہونے ہی کو تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ "نارومنی" نے جو ستار سو جتن سے اپنے ساتھ رکھا تھا وہ ہوا میں تیزی سے اڑتا ہوا آ کر ان کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ انتہائی غصہ کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ نارومنی موہ اور مایا کے جال میں پھنس گیا ہے۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو "نارومنی" کا دل بھی میری طرف راغب ہوا۔ جب رغبت زیادہ بڑھی تو اس نے ستار چھیڑ کر گیان شروع کیا۔ لیکن جب میں نے اسے واپس بلا لینا چاہا اور علم کے زور پر دوزخ سے اٹھا کر معلق کر دیا تا کہ یہاں اس کو کھینچ لوں، تو کمبخت نے ستار ہی ہوا میں اچھال دیا تا کہ گیان دھیان کی کیفیت ہی ختم ہو جائے۔ وہ تو خود وہیں گر پڑا اور یہ ستار یہاں اڑ آیا۔ انھوں نے غیظ میں ستار کو ایک ٹھوکر لگائی جس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن ہر تار سے بڑے غمگین نغمے پھوٹ رہے تھے۔

میں یہیں تک پڑھ سکا تھا کہ مجھے پرشاد کا خیال آیا۔ کہیں حضرت بھی یہیں کے ہو رہے تو اپنی زبی کے محبت بھرے خط کا جواب کس کے توسط سے بھیج سکوں گا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا پرشاد غائب تھا۔ آس پاس کے ساتھیوں سے پوچھا۔ کہنے لگے جب تم خط پڑھ رہے تھے تو وہ بڈھا بہت خوش خوش اچھلتا کودتا اس سمت جا رہا تھا۔ بار بار ایک ایک سے کہہ رہا تھا مجھے چکر نہ دو ــــ یہ دوزخ نہیں ہے یہی تو دنیا ہے۔

میرے پیر کے نیچے سے دوزخ نکل گئی۔ میں چلّایا۔ پرشاد۔ پرشاد۔ دیوانوں کی طرح میں نے ہر طرف بھاگ بھاگ کر اس کو دیکھا۔ وہ کہیں بھی نہ تھا۔ میں پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّایا۔ پرشاد مجھ پر اور میری زبی پر رحم کرو۔ گھبراہٹ میں میری آنکھ کھل گئی ــــ واقعی میرے پیر کے نیچے سے دوزخ نکل گئی تھی۔

ابوالبشر کہنے لگا کہ ڈاکٹر بے چارے شیکھر کی تھیں پھر کچھ خبر ہی نہیں ملی۔

ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ پتہ نہیں کتنی ہرنیوں کا خونِ ناحق اس کی گردن پر ہے جو آج تک قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہے۔

زبیدہ نے مداخلت کی ــــ یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر، تمھارے شیکھر صاحب کو تو اسی بات پر ناز ہے کہ ان کی بندوق نے کبھی کسی ہرنی کے سینے کو زخمی نہیں کیا۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو مسکرا کر دیکھا۔ ڈاکٹر زبیدہ سے کہہ رہا تھا۔

زبی وہ بندوق سے نہیں، اپنی آنکھوں سے بھی بے شمار شہری غزالوں کو شکار کر چکا ہے۔ یہ اس کا ہنر ہے۔ اس کا فن ہے۔

شیکھر نے ڈاکٹر کو بہت گھور کے دیکھا۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ اس نے بے موقع غلط بات کہہ دی ہے۔

ابوالبشر نے پہل کی۔ اس کے اٹھتے ہی یکے بعد دیگرے تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

میز خالی ہو گئی۔ چپراسی نے بڑھ کر پلیٹیں سمیٹنا شروع کیں۔

لان پر اب بھی کرسیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ابوالبشر نے یہاں بھی پہل کی۔ ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے پائپ جلا لیا

شیکھر نے چھالیہ کا ایک ٹکڑا اور الائچی منہ میں ڈال لی اور کھلانے لگا۔

ڈاکٹر نے سگریٹ پیش کیا تو زبیدہ نے کہا کیوں ویسٹ کرتے ہو۔

لیکن شیکھر نے یہ کہتے ہوئے سگریٹ لے لی کہ مسز زبیدہ کبھی کبھی تو میں شوق کر ہی لیتا ہوں۔

زبیدہ نے لائٹر سے اپنا سگریٹ جلایا اور جلتا ہوا لائٹر ہوا میں یہ کہتے ہوئے اچھال دیا کہ اب فرشتے کی باری ہے۔

ایک قہقہہ پڑا۔ اور سب لائٹر پر جھپٹے

ہیں کو اکب کچھ...

شیکھر نے اچھل کر لائٹر کو پکڑ لیا جو ابھی جل رہا تھا۔ اس کی ہتھیلی جل گئی لیکن اس نے کسی کو محسوس ہونے نہ دیا۔ اپنا سگریٹ جلا چکا تو لائٹر کو گل کر کے اس نے اپنا کھلا ہاتھ ڈاکٹر کے آگے بڑھا دیا۔

ہتھیلی پر داغ دیکھ کر ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا۔ ارے فرشتے بننے کی خواہش میں یہ کیا کر لیا تم نے

شیکھر نے مسکرا کر کہا۔ اس کے باوجود بھی زبیدہ کو میرے فرشتہ ہونے پر شبہ ہے ڈاکٹر۔

ابوالبشر نے ہنستے ہوئے کہا۔ شیکھر، زبیدہ تمھیں نہ صرف فرشتہ سمجھتی ہیں بلکہ وہی عالی ظرف فرشتہ سمجھتی ہیں جو ایک معمولی سے پائپ کی خاطر انجینیر کے سات خون معاف کر دیتا ہے۔

تینوں ہنستے رہے۔ زبیدہ جس کے متعلق ابوالبشر نے سوچا تھا کہ بہت خوش ہو گی صرف مسکرا کر رہ گئی۔

شیکھر نے عالی ظرف کے لفظ کو دہرایا اور ابوالبشر کو پھر داد دی۔

قہقہوں کا تسلسل ابھی ٹوٹا بھی نہ تھا کہ زبیدہ نے جماہیاں لینا شروع کر دیں۔ شیکھر نے ڈاکٹر سے کہا ۔ جناب ڈاکٹر صاحب سگنل ہو چکا ہے" بوریا بستر سمیٹیے"

ڈاکٹر نے دیکھا، زبیدہ واقعی جماہیاں لے رہی تھی۔

کیا اب شکار کو نہیں چلو گی زبی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔

زبیدہ نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ اس نے پھر ایک جماہی لی اور مسکرا کر رہ گئی۔

جب ابوالبشر نے اصرار کیا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ بشر صاحب آپ کا اصرار ہے تو میں ضرور چلتی ہوں لیکن نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں۔ سر میں کچھ دھمک سی ہے آپ معاف ہی کر دیں تو بہتر ہو گا۔

ابوالبشر کچھ کہنے والا تھا کہ زبیدہ نے شیکھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ مسٹر شیکھر کا ہاتھ

بھی جل گیا ہے۔ ہاتھ کی تکلیف سے زندگی میں پہلی بار کہیں ان کا نشانہ خطا نہ ہو جائے۔

شکیھر نے کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر اور زبیدہ بھی ذرا کی ذرا لان پر بیٹھے رہے۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر زبیدہ نے سگریٹ پھینکا تو ابوالبشر نے کہا۔ شکیھر ہوتا تو پھر ایک بار اپنے فرشتہ ہونے کا ثبوت دیتا۔

زبیدہ نے ہنس کر کہا ۔۔۔ اور اس کوشش میں بیچارے فرشتے کو آگ سے کھیلنے کی پاداش میں ایک اور دماغ ہی ہاتھ آتا۔

ڈاکٹر مسکرایا اور زبیدہ کو کمرے میں لے چلنے کے لیے اس کی بانہہ پکڑ لی۔

چلو زبی۔ اب سو رہیں۔

زبیدہ نے کہا۔ بھئی کمرے میں تو سویا نہیں جائے گا مجھ سے۔ پچھلی طرف کیمپ کاٹس بچھوا کر آسمان تلے کیوں نہ سو رہیں۔

ڈاکٹر نے خوشامد کی۔ زبی بوندا باندی ہونے کا ڈر ہے۔ نیند اچاٹ ہو جائے تو سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔

زبی نے بھی ڈاکٹر کو پچکارا۔ سوچو نہ ڈاکٹر۔ کس قدر حبس ہے۔ کچھ برس بھی جائے تو فوراً کمرے میں جا کر پڑ رہیں گے۔

ڈاکٹر کے حامی بھرنے سے پہلے ہی اس نے ملازم کو آواز دی اور کیمپ کاٹس باہر نکالنے کے لیے کہہ دیا۔

ڈاکٹر بےچارا بڑی حسرت سے زبی کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا۔

جب دونوں سونے کے لیے چلے گئے تو ابوالبشر نے برآمدے ہی میں فرش پر اپنا

بستر لگوالیا کیوں کہ اپنی پرانی عادت کے سبب پلنگ پر اس کو نیند ہی نہ آتی تھی۔

اپنے اپنے بستر پر دراز ہوئے تو ڈاکٹر نے زبی سے شکایت کی۔ آج اس قدر مرغن غذائیں کھانے میں آئی ہیں اور تم نے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا ـــ کیا تم نے میرے اصرار پر بھی کچھ نہیں سمجھا۔

زبی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تو ڈاکٹر اور جل گیا۔ منہ پھلا کر اس نے کروٹ بدل لی۔ زبی نے تاڑ لیا کہ ڈاکٹر روٹھ گیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کے کان کی لو لکی کو چٹکی میں پکڑ کر چھیڑا۔

ڈاکٹر نے اس چھیڑ چھاڑ کے تعلق سے زبی کے پہل کرنے کو غنیمت جانا اور مسکرا کر اس کو دیکھا تو زبی نے جماہی لے کر کہا۔

کیا یہاں کسی نے تم پر پہرے بٹھا دیئے ہیں جو تم اس قدر اداس ہو۔

ڈاکٹر نے زبی کے ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا۔ ڈرالنگ یہاں ''پرائی وسی'' (PRIVACY) کہاں ہے۔ سب کے سونے کا انتظار کرتے کرتے خود ـــ میری ہی آنکھ لگ جائے گی اور تم تو جماہیاں لے رہی ہو۔

ڈاکٹر ابھی باتوں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا زبی کی آنکھیں مند رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی حلیت پھر سے ہل چل اور گھما گھمی جیسے خاموشیوں اور سناٹوں کے بیکراں اور اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی . . . .

گھبرا کر ڈاکٹر نے آنکھ کھولی تو بارش کے موٹے موٹے قطرے ٹپاٹپ گر رہے تھے۔ زبی بستر پر نہ تھی۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ وہ سونے کا انتظام کرنے کے لیے پہلے ہی کمرے میں چلی گئی ہے۔ اپنا بستر سمیٹ کر اس نے بغل میں دبا اور چکر کاٹ کر وراندے

کی طرف لپکا۔ برآمدے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ابوالبشر شیکھر کے کمرے کے بھڑے ہوئے کواڑوں پر کان لگائے بہت غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہے ـــــ پاؤں دبا کر ڈاکٹر اس کے قریب پہنچا تو ابوالبشر کو ڈاکٹر کی آمد کا احساس تک نہ ہوا۔

تم نامردی کی حد تک مجھے ٹھکرا رہے ہو شیکھر۔ کمرے سے زبی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جس میں بپھری ہوئی شیرنی کا غصہ تھا۔

شیکھر کہہ رہا تھا۔ سوچو تو تم کہاں تک گر گئی ہو زبیدہ۔ جن باتوں کو خطوط میں لکھتے ہوئے تم نے شرم محسوس نہیں کی آج اپنی زبان پر لاتے ہوئے بھی تم محجوب نہیں ہو۔ میں جو کچھ ہوں بہر حال تمھارے لیے نہیں ہوں۔

تو پھر میرے خطوط لوٹا دو۔ زبیدہ روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔

خطوط میرے ساتھ موجود ہیں۔ میں اسی وقت لوٹا سکتا ہوں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ تم اب اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گی تو تمھارے پانچوں خطوط ڈاکٹر کے حوالے کر دوں گا۔

دروازہ کھول کر ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا تو شیکھر اپنی پتلون کی جیب سے خطوط نکال رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا دیا تو شیکھر نے چپ چاپ خطوط اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

زبیدہ جھپٹی تو شیکھر نے دھکا دے کر اس کو پرے ڈھکیل دیا۔

ڈاکٹر پھٹی پھٹی آنکھوں سے خطوط کو گھورتا رہا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ـــــــــــــ تم نے آج یہ کس دوزخ میں مجھے

اُجلی پرچھائیاں ہیں کواکب کچھ....

ڈھکیل دیا ہے ز بی جس کی آگ کو بجھا دینا کسی آدمی کے بس میں نہیں۔ اور
پھر میں اس قابل بھی تو نہ تھا۔